نوائے آزادی

अदबी पब्लिशर्स

ادبی پبلشرز ۔ بمبئی نمبر ۸

1957

ملنے کا پتا :

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ،

جامعہ نگر، نئی دلی } { پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳
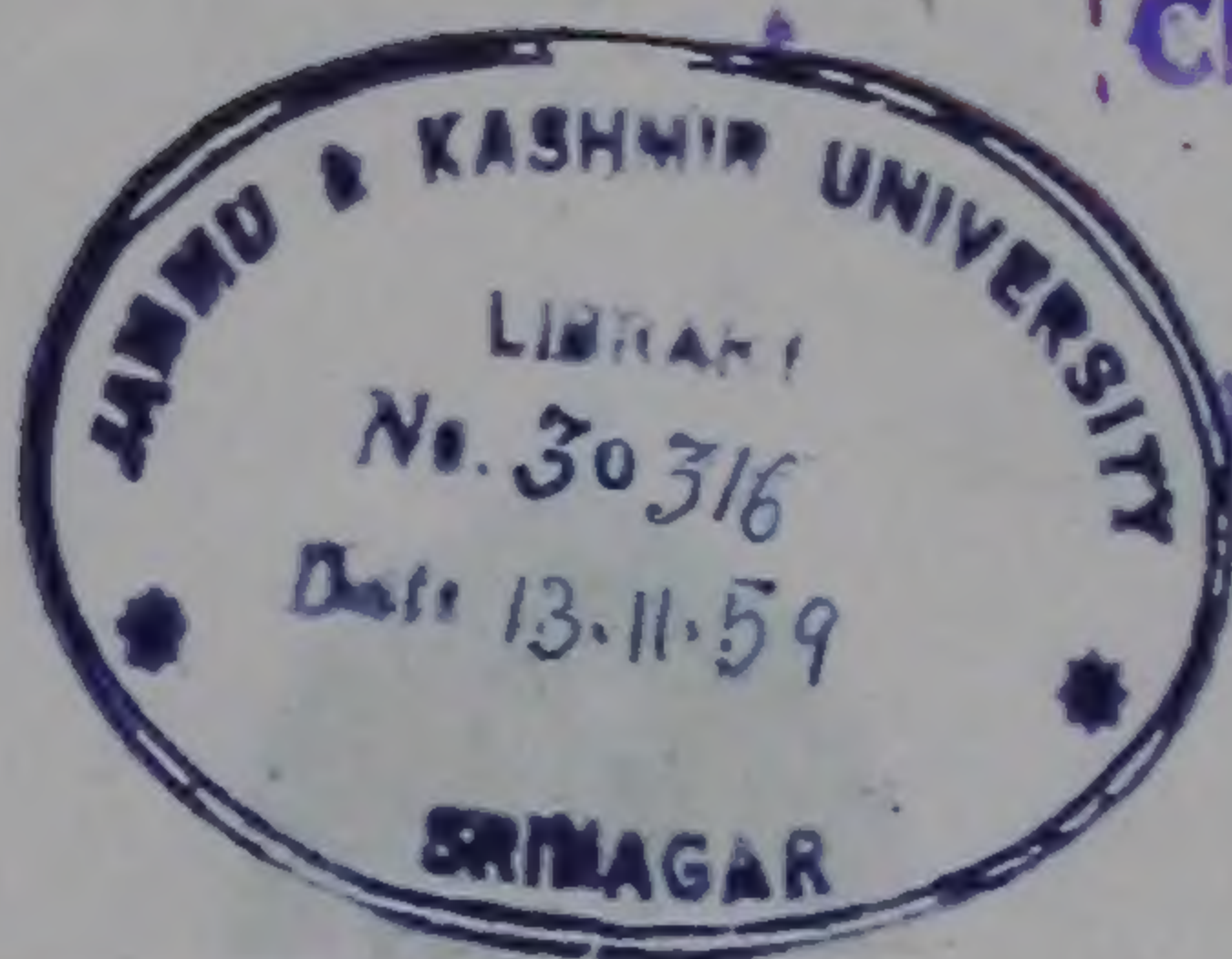
قیمت :

عمدہ جلد : پانچ روپے

معمولی جلد : چار روپے

شمعِ آزادی کے پروانوں

کے نام

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(غالب)

پبلشرز کی طرف سے

مئی ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد اردو کانفرنس کی ایک نشست میں «اردو اور تحریک آزادی» موضوع بحث تھا۔ اس نشست میں یہ خیال پیش کیا گیا کہ ۱۹۵۷ء میں جب پہلی جنگ آزادی کی صد سالہ سالگرہ منائی جائے گی، اردو کی ایسی تحریروں اور نظموں کا، جنھوں نے آزادی ملک کی مختلف تحریکوں کو ہوا دی، ایک انتخاب انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے شائع کیا جائے۔ انجمن اسلام کے جناب صدر سیف طیب جی صاحب نے، جو وہاں موجود تھے کام کی اہمیت کے پیش نظر طباعت کے اخراجات کی ذمہ داری انجمن کی طرف سے قبول کرلی۔ چند مہینوں کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی کہ وقت کی تنگی اور بعض دوسری مجبوریوں کی بنا پر وہ یہ ذمہ داری پوری نہ کرسکے گی۔ چنانچہ اس سلسے میں جو کچھ تھوڑا سا مواد وہاں جمع ہوچکا تھا اسے بھی انھوں نے انجمن اسلام کے پاس بھیج دیا۔

انجمن اسلام کی جنرل کاؤنسل نے صورت حال کا جائزا لیتے ہوئے یہ کام انجمن کے ایک لائف ممبر عبدالرزاق صاحب قریشی کے سپرد کیا اور اپنے شعبۂ اشاعت، ادبی پبلشرز کو اس اشاعت کا کام سونپا۔ اس میں شک نہیں کہ کام حوصلہ شکن حد تک زیادہ تھا اور وقت بہت کم۔ اردو میں جو کچھ تحریک آزادی کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہی ان سب کو کھنگالنا طویل مدت، دور دراز مقامات کا سفر اور کافی سرمایا چاہتا تھا چنانچہ حالات کے تحت جو کچھ بمبئی میں مل سکا اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ اس لئے اگر اس انتخاب میں تشنگی پائی جاتی ہی تو کوئی تعجب نہیں۔ وقت کا تقاضا تھا کہ کتاب اگست ۱۹۵۷ء تک ضرور شائع ہوجائے

تاکہ اردو داں طبقا اس صد سالہ جشن کے موقع پر یہ محسوس کرسکے کہ تحریک آزادی میں اردو کا کیا حصہ رہا ہے۔

ہم عبدالرزاق صاحب قریشی کے ممنون ہیں کہ انہوں نے بعض علمی حلقوں کے عدم تعاون کے باوجود بڑی کاوش سے ایک اچھا خاصا انتخاب تیار کرلیا جو ہمارے مقصد کی تکمیل تک نہ سہی، قریب ضرور پہنچ جاتا ہے۔

اس کتاب کے مرتب کرنے میں جن حلقوں سے مدد ملی ان سب کا الگ الگ شکریہ ادا کرنا ناممکن ہے۔ لیکن بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس سلسلے میں چند نام نہ گنائے جائیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے ان کا جمع کیا ہوا مواد حاصل ہوا۔ انجمن اسلام اردو رِسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفسر سید نجیب اشرف ندوی نے وقتاً فوقتاً مفید مشورے دئے۔ سردار جعفری صاحب نے ترتیب میں عملی دل چسپی لی۔ سید جمیل الدین صاحب ٹونکی اور عبد الطیف صاحب فاروقی نے کئی رسائل اور کتابیں بہم پہنچائیں۔ مولوی فضل اللہ فاروقی لائبریرین اردو رِسرچ انسٹی ٹیوٹ کا مکمل تعاون حاصل رہا۔ انہوں نے نیشنل آرکایوز کی دستاویزوں کو بھی پڑھا اور سب کی نقل کی۔ محمد فاروق صاحب مہتا نے نیشنل آرکایوز سے دستاویزیں حاصل کرنے کے لئے دہلی کا سفر کیا۔ جناب جگن ناتھ آزاد نے اپنے والد بزرگوار جناب تلوک چند محروم کی چند نظمیں اور جناب سکندر علی وجد نے اپنی بعض نظموں کی کاپیاں عنایت فرمائیں۔ جناب محمد عتیق صاحب (جامعہ ملیہ) نے بعض اخبارات کے اہم اوراق کے فوٹو دئے۔

ان کے علاوہ ہم بین الاقوامی شہرت کے ترقی پسند آرٹسٹ اِف۔ ام۔ حسین کے بھی شکر گذار ہیں کہ انہوں نے گرد پوش کے لئے

ایک اچھوتا ڈزائن تیار کیا۔

اُن شعرا اور ادیبوں کا شکریہ ادا کرنا دائرۂ امکان سے باہر ہی جن کی نظمیں اور تحریریں اس انتخاب میں شامل کی گئیں۔

انجمن اسلام کے ادارۂ محمد حاجی صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ طباعت (ادبی پرنٹنگ پریس) کے تمام کارکن ہمارے دلی شکرئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے رات دن ایک کرکے اس کتاب کو وقت پر شائع کرنے میں ہماری مدد کی۔

آخر میں یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ انجمن نے اس کتاب کی اشاعت میں کسی قسم کی کوئی تجارتی غرض وابستہ نہیں رکھی ہی، اسی لئے اس کی قیمت بازار کے عام نرخ سے بہت کم رکھی گئی ہی۔

۸۔ شیفرڈ روڈ،
بمبئی نمبر ۸.

ادبی پبلشرز
شعبۂ اشاعت انجمن اسلام

نوٹ:۔ اس کتاب میں انجمن ترقیٔ اردو (ہند) کے منظور کئے ہوئے طریقۂ اِملا کی پابندی کی گئی ہی۔

فہرست

چوتھا حصہ ۲۸۱

پہلی جنگِ آزادی

میں

اردو کا عملی حصہ

[۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی کے دوران میں باغی سپہ سالاروں نے فوجی افسروں کے نام احکام بھیجے تھے۔ یہاں صرف اردو میں لکھے ہوئے چند احکام کی نقل ہو بہ ہو چھاپی جاتی ہی۔ سرکلر نمبر ٤ باغیوں کے ایک مطبوعہ خط کی نقل ہی جو انھوں نے ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کے نام بھیجا تھا۔ یہ دستاویزیں انڈین نیشنل آرکایوز (دہلی) میں محفوظ ہیں۔ ان کی نقل کے لئے ہم ڈائرکٹر نیشنل آرکایوز کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آخری دو سرکلر حیدرآباد (دکن) کے باغیوں کی طرف سے نکلے تھے۔ یہ دونوں سرکلر مرتب کو جناب سید نصیر الدین صاحب ہاشمی کی وساطت سے ملے جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہی۔]

مہر کچہری سپہ سالار بہادر سنہ ۱۲۷۳	سنہ ۱۲۷۳ مہر کچہری . . . . اول پادشاہی मोहर कचहरी की अौवल बादशाही

بنام افسران پلٹن و رسالہ و توپخانہ وغیرہ آنکہ

تم کو لکھا جاتا ہی کہ اس وقت حکم حضور پرنور کا آیا کہ جو پلٹن اور رسالہ و توپخانہ مورچہ کو سر کریں گے اوس پلٹن اور رسالہ کو تنخواہ بموجب سرشتہ تنخواہ دیگر افواج کے زیادہ ملے گی اور تنخواہ کے سوائے انعام بہادری کا ملے گا اب تم سب سرداران اور سپاہیان کو چاہیے کہ تم سب لوگ دلو (دل و) جان پیش کرکے اس مورچہ کو فتح کرو اور حضور پرنور سے انعام بہادری کا پاؤ اس میں دیری نہو تاکید جانو مکرر یہ کہ جو شخص کہ لڑائی میں [1] جوجہ جاویگا اس کے وارثان حقیقی کی بخوبی پرورش ہوگی

(پشت پر)

حضور پرنور سے اطلاع پاکر مردماں ہوشیار رہیں
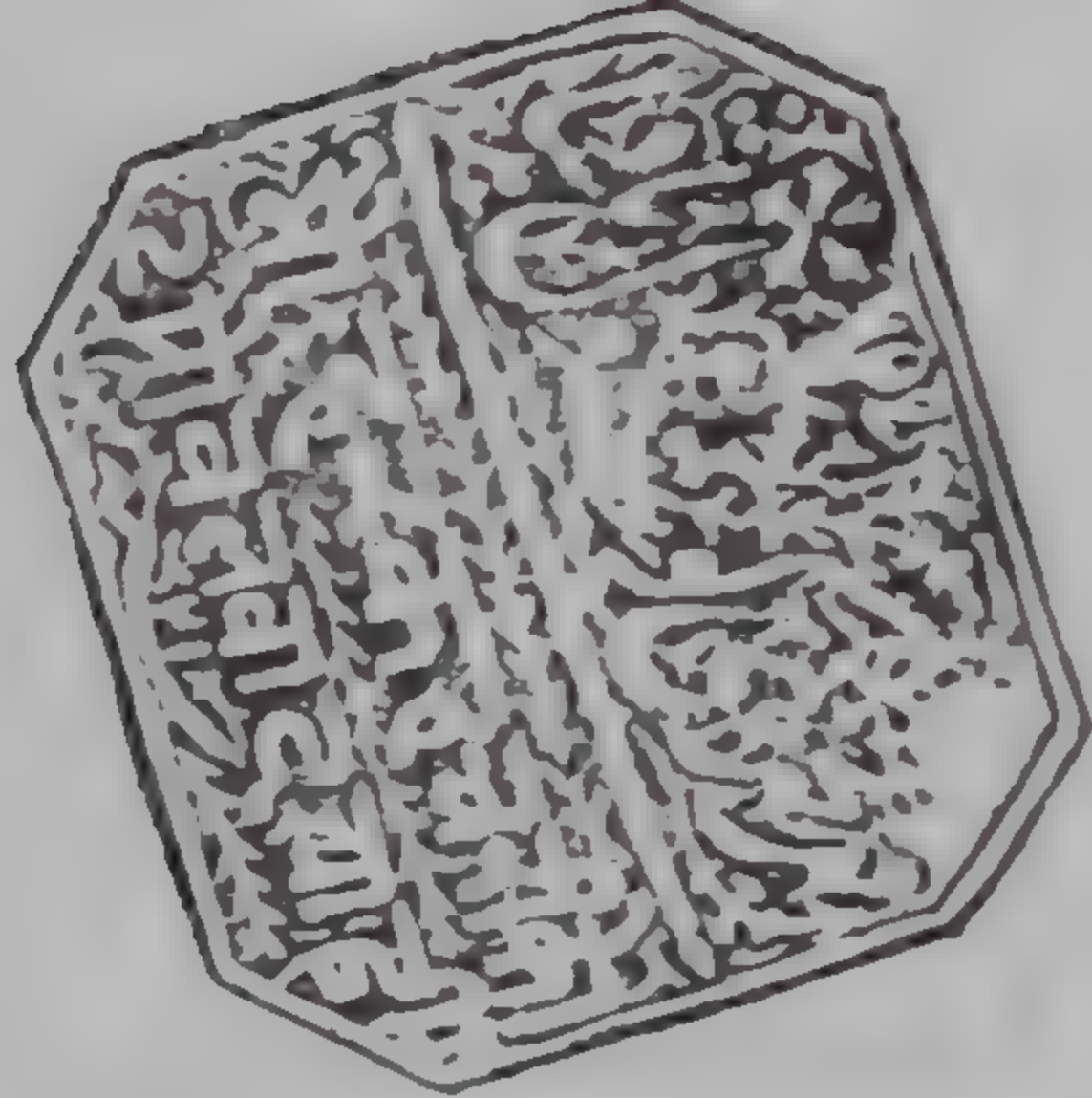
---

[1] شہید ہوگا

مہر
کچہری سپہ سالار بہادر
سنہ ۱۲۷۳

بنام جملہ افسران رسالہ و پلٹن و توپخانہ.... پلٹن.... توپخانہ نصیر آباد

حسب الاحکام قضافرجام حضرت جہاں پناہ سلامت کے تم لوگوں کو لکھا جاتا ہی کہ جو شخص فتح یاب اوپر پہاڑی کے ہوگا مال و اسباب پوری پہاڑی کا سوائے مال میگزین و اسپان توپخانہ کے بالکل ان لوگوں کو سرکار فیض آثار سے ملے گا اور معاف ہوگا چاہئے کہ پہاڑی فتح کرنے میں دل و جان سے کوشش و جاں نثاری کریں اور کمر ہمت کی خوب مضبوط کر کے باندھیں اور سوائے اس کے انعام بہادری درجہ بہ درجہ اور تکٹ وارثان حقیقی اون کی کو کہ جو لوگ لڑائی میں شہید یا جوجہ جاویں گے سرکار سے ملے گا اور مضمون اس حکم کا تمام شہر دہلی خاص و اطراف و جوانب و پلاٹن و توپخانہ ہاے جنگی میں مشتہر منادی کرائی جاوے اور سب لوگ ہر چہار طرف سے ہندو مسلمان پہاڑی کے اوپر دھاوا کریں کس واسطے کہ یہ لڑائی دین کی ہی ملازم و غیر ملازم پر کچھ ختم نہیں ہی سب کو ہمت و جوانمردی اور شجاعت کے اسباب میں کرنا چاہئے اور وقت تیاری دھاوا سختی سے لکھا جاوے گا اور

جاننا چاہئے کہ تمام افواج ایسا ہوشیار رہے دیری نہو کہ خبر
دینے کے ساتھہ دیری نہوے حکم جاری ہوئے ساتھہ سب لوگ تیار
ہوکر دھاوا کریں گے اور سرداران کو چاہئے کہ اپنی اپنی فوج کے دستور
موافق جما کے لے چلیں گیں (گے) اور سب چھوٹے عہدہ دار اور سپاہی
کو چاہئے کہ اپنے سرداران کے حکم میں دل و جان سے کوشش
کریں اور یہ اپنے دل میں سمجھیں کہ کام ہم لوگوں کا ہو اپنی طرف
سے اس کی صورت ساتھہ بہادری کے بنا لیویں اور وقت طیاری کے یا
چلنے راستہ کے یا پہونچ جانے پہاڑی تک وقت دھاوا کے سب
لوگ چپ رہیں اور آواز منہہ سے نہ بولیں اور آواز بوانے کی مونہ (منہہ)
سے نہ آوے فقط

۱۶ محرم سنہ ۲۱ جلوس

(پشت پر)

العبـــــــــــــــــــــــد العبـــــــــــــــــــــــد

(دستخط)...صوبیدار محمد عظیم جمعدار (دستخط) بہارگو...مصراجرنیل...

توپخانہ نصیرآباد حسب الحکم حضور کا متصور ہوا

مہر
کچہری سپہ سالار بہادر

بنام جمیع افسران پلٹن و رسالہ و توپخانہ .... أنکہ

حکم حضور والا صادر ہوا ہی کہ ہندو کو گاے اور مسلمان کو سور
کے لحاظ کرکے اور دین اور دھرم کو سمجھکر بسکہ میری مرضی
اور زندگی تم کو منظور ہی تو دیکھتے ہی اس حکمنامہ کے پلاٹن و
رسالہ و توپخانہ سب تیار کرکے اوپر کشمیری دروازہ کے حاضر
ہوکر مخالفان ناہنجار و کفاران بد افعال پے (پر) دھاوا کرو اس
بات میں ایک لحظہ کا تامل و تغافل نہ کر(و) حسب الحکم حضور والا
کے تعمیل کرو تاکید جانو اور چاہئیے کہ تم اس تخت کی
شرم رکھو اور جو دین اور ایمان پر آے ہو تو اس کا لحاظ کرو
اور ہر ایک افسر کو چاہئیے کہ اپنے اپنے پلٹن و رسالہ کے
سکشن باندھ کے اور تیار کرکے ہر ایک کو اس حکم سے آگاہ
کرکے روانہ کرو اور جو شخص افسر یا سپاہی یا سوار کچھ
عذر کرے اوس کی رپوٹ حضور میں کرو تاکید جانو مرقوم
بستم محرم سنہ ۲۱ اور .. کری پروانہ پہنچنے سے بھیجے جاتے ہیں

(پشت پر)

۲۰ محرم کو پروانہ ہذا بدست سوار کے ورود پایا اور ۰۰۰۰۰۰
کل سواران و افسر رسالہ سوئم ۰۰۰۰ اور مرہٹہ کے مورچہ کشمیری
دروازہ پر بخوبی ۰۰۰ کرکے اوس کی حاضری میں۔

العبـــــــــــــــد

سبحان خاں کمانیر رسالہ سوئم

(مہر) الحکم اللہ و الملک اللہ

ترجمہ دہرم کی فتح کے خط کا

آپ سب راجہ لوگ بڑے دہرم اور خوبیوں والے سخی داتا
برداشت کرنے والے بہادر ہو اور سمہالنے والے اپنے دہرم اور
اوروں کے دہرم کے ہو آپ لوگوں کی خیر و عافیت چاہ کے
عرض کرتے ہیں اور خدا تعالی نے اپنا اپنا دہرم کرنے کے واسطے
یہ سریر تم کو دیا ہی وہ دہرم اپنے اپنے مذہب سے سب کو ظاہر
ہی اور اس کے اوپر مستعد بھی ہیں اور اپنے دہرم کے خراب
کرنے والوں کے مارنے کے واسطے تم راجہ لوگوں کو خالق نے
پیدا کیا ہی اور راج دیا ہی چاہئے کہ جس کو طاقت مارنے دہرم
بگاڑنے والے کی ہی وہ اوسکو مارے اور جسکو زور نہیں ہی
وہ اپنے جی سے کوئی تدبیر اون کے مارنے کی کرکے اپنے دہرم
کو بچاوے کیونکہ شاستر میں لکھا ہی کہ اپنے مذہب پر مرنا بہتر ہی
مگر دوسرے مذہب کو اختیار نہ کرے یہی خدا نے کہا ہی اور
سب لوگوں پر ظاہر ہی اور یہ انگریز لوگ سب کے مذہب کو
بگاڑنے والے ہیں اس کو خوب جان لینا چاہئے کہ بہت دنوں سے
دہرم ہندوستان کے لوگوں کے بگاڑنے کے واسطے کتابیں بناکر
اپنے پادریوں کے ہاتھ سے ہندوستان میں پھیلائیں اور دہرم کو
ظاہر کرنے والے زور سے منگا لیتے ہیں یہ اونہیں کیے معتبر آدمیوں
سے سنا گیا سو دیکھئے کہ دہرم بگاڑنے کی ریت انھوں نے کیسی
تجویز کی ہی کہ اول جب عورت رانڈ ہو اوس کو بزور حکم دیا

که دوسری شادی کرے اور دوسرے یہ کہ قدیمی دہرم ستی ہونے
کا تھا بزور موقوف کرکے آئین قانون چھپایا کہ کوئی ستی نہ ہونے
پاوے اور تیسرے یہ کہتے ہیں کہ ہماری خوشی یہ ہی کہ ہمارا
دہرم اختیار کرو تو تمہاری عزت سرکار میں ہوگی اور گرجا گھر
میں جاکر ہمارے مذہب کی باتیں سناکرو اور راجے لوگوں کو
حکم دیا ہی کہ جو اپنی بی بی سے پیدا ہوا ہو اسی کو راج دہن
ملے گا اور جس کو گود لیا ہی اوس کو نہ ملے گا حال آنکہ ہمارے
شاستروں میں دس طرح کے پوترں کو حصہ ملتا ہی اس ترکیب سے
تم لوگوں کا راج مال چھین لیں گے چنانچہ ناگپور اور لکھنؤ چھین
لیا اور بیدر (بے دردی) کرنا اون کا دیکھو کہ قیدی لوگوں کو
روٹی اپنے بزور حکم کھلانے کو مستعد ہوے بہت لوگ بھوکے
مرگئے مگر نہ کھایا اور بہتوں نے کھاکر اپنا دہرم بگاڑا پھر
دیکھا کہ یہ تدبیر اچھی طرح سے نہیں چلی تو ہڈیوں کو پیس کر آٹے
شکر میں ملاکر کھلایا چاہتے تھے اور ماس اور ہڈیوں کو چورا
کرکے چانولوں میں ملاکر بیچنے کو دوکانوں میں رکھوا دئیے اور
سب طرح کی تدبیریں دہرم کھونے کی کیں تب کسی بنگالی نے سوچ
کر کہا کہ تمہاری فوج کے لوگ اگر ان باتوں (کو) اختیار
کریں گے تو ہم بھی سب مانیں گے انگریزوں نے یہ سن کر پسند
کیا اور کہا البتہ یہ خوب تدبیر ہی اور یہ سمجھے کہ آپ ہی جاتے
رہیں گے تب اپنی فوج میں برہمن وغیرہ کو کہا کہ کارتوس چربی کے
بنے ہوے منھ سے کاٹو تو اس میں فقط دہرم برہمنوں اور پنڈتوں
ک

کا جاتا دیکھ کر مسلمان سپاہیوں نے بھی کارتوس کاٹنے سے انکار
کیا تب انگریز دونوں کے دہرم ایمان بگاڑنے پر مستعد ہونے اور
جس پلٹن والوں نے کاٹنے سے انکار کیا اس کو توپ سے اوڑادیا
جب ایسا ظلم اپنے اوپر سپاہیوں نے دیکھ کر واسطے بچانے جان
اپنی کے اونہیں کو مارنا شروع کیا اور جہاں پایا مارا اور اب
جہاں کہیں تھوڑے رہے ہیں ان کے مارنے کی بھی فکر کرتے ہیں
اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہ انگریز لوگ اگر ہندوستان میں
رہیں گے تو سب کو قتل کریں گے اور دہرم کو خراب کردیں گے
مگر بعض ہمارے جو دیس کے لوگ ہیں وہ اون میں مل کر لڑتے
ہیں اور مدد دیتے ہیں اون کے واسطے یہی ہم نے سوچا ہی کہ تمہارا
اور اون کا سب دہرم ایمان نہ چھوڑیں گے یہ خوب جانتا تو اس
صورت میں ہم پوچھتے ہیں کہ بچانے دہرم اور جان اپنی کے تم
نے کیا تجویز کی ہی اگر ہمارا تمہارا ایک عندیہ ہو تو تھوڑی
محنت میں اون کو مارلیں تو دہرم بھی بچے اور ملک بھی رہے
اور جو تم (نے) اس ملک کے ہندو مسلمانوں کے دہرم اور ایمان
اور جان بچانے کے واسطے یہ تدبیر کی ہی تو تمہارے جاننے کے
واسطے یہ چھاپا گیا ہندو کو قسم گنگا تاشی (تلسی) لکرام کی
اور مسلمانوں کو خدا تعالی اور قرآن کی دے کر لکھتے ہیں کہ
دونوں کے بیچ میں یہ دشمن انگریز ہیں ان کو مارنا ہندو اور
مسلمانوں کو بہت بہتر ہی کیونکہ دہرم اور جان دونوں کی اس میں بچے گی
تو چاہئے کہ دونو مل کر مار ڈالو اور ہندوؤں میں گاؤ کشی ہونا بڑا

ادہرم ہی اوس کے بچانے کے واسطے سب سرداروں مسلمانان ملک
ہند سے عہد اور قول ہوگیا کہ جو انگریز کے مارنے کو ہندو بھی
مستعد ہوگا اوسی دن سے رسم گاؤ کشی کی موقوف کردیں گے
اور جو نہ کریں گے اپنے قرآن سے پھر جاویں گے اور اوس کو
کھاویں تو سور کو کھاویں اور ہندو اگر مارنے پر فرنگیوں کے
کمربندی نہ کرکے اون کو بچاویں گے تو گئو مارنے کا پاپ اور
ماس کھانے کا پاپ اون کے سر پر ہوگا شاید اپنے مطلب (کے) واسطے
فرنگی ہندوؤں کو اس طرح سمجھاویں کہ جو مسلمان تمہارے دہرم
رکھنے (کے) واسطے نہ مارنا گئو کا اختیار کرتے ہیں تو ہم بھی یہی
شرط قول کرتے ہیں تم ہمارے شریک ہوکر اون کو مارو تو عقل مند
لوگ اس فریب کو ہرگز نہ مانیں گے کیونکہ قول و قرار انگریزوں
کا محض فریب اور مطلب کا ہی مطلب اپنا کرکے عہد شکنی کریں گے
کیونکہ ہمیشہ سے ان کی عادت فریب کی ہی اور ہندوستانیوں سے
ہمیشہ فریب کرتے آئے ہیں کہ سب ادنی و اعلی پر ظاہر ہی اس
واسطے ان کی باتوں کا خیال نہ کرنا ایسا وقت پھر نہ ملے گا خوب
جان لو اور خط کے لکھنے سے سب جانتے ہیں کہ آدہی ملاقات ہوتی
ہی امیدوار ہیں کہ سب ان باتوں کو مان کر جواب لکھو فقط۔ یہ
خط باتفاق ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہتمام مولوی سید قطب شاہ
صاحب کے بیچ مطبع بہادری شہر بریلی کے چھاپا گیا فقط۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم   نصر من اللہ فتح قریب و بشر المومنین اگر جو
شخص کہ مسلمان ہوکر کلمہ گو امتِ رسول ہوکر ارادہ قتل کرنے میں
اوس کافر دین یعنی فرنگی میں تامل کرے گا اوس پر طلاق اور وہ
اولاد دھیڑ اور چمار، گدھے کتے اور سور کے ہیں بلکہ نسل یزید
اور شمر کی اور بیٹا فرنگی کا ہوگا یا امیر یا دیوان یا مشایخ یا
پیرزادہ یا مولوی یا قاضی یا مفتی یا صوبہ (صوبیدار؟) یا کوتوال یا رئیس
یا خورد و کلاں کلھم عام خاص ان سب پر قسم ہی اوس اللہ واحد
کی اور اوس کے حبیب کی اور جو کوئی شریک ہوکر اپنے کو
سرخ رو کرے گا البتہ وہ غازی اور قاتل کفار کہلاوے گا اور جو
شخص کہ مارا جاوے گا انشاءاللہ تعالی پس تحقیق داخل ہوگا وہ بیچ
مجلس سیدالشہدا اور شریک ہوگا مجلس میں مصطفے صلی اللہ علیہ و صلعم کی
بے شک واسطے اوس کے بہشت اعلی ہی البتہ قول اللہ کا زبردست
بلادلیل فاالتقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم کیوں تامل اور ڈھیل
کررہے ہو یہ وقت فرصت کا ہی ایسا وقت کبھی نہیں میسر ہوگا اور
کیوں غافل ہو تم لوگ دیکھو افسوس کروگے اور ہم کو تمہارے
آنے یا نہ آنے سے کچھ اندیشہ نہیں مگر واسطے ہمت دلاتے ہیں (کذا؟) ہم
یہاں سب متفق ہوکر اور زیر ہدایت خود غلبہ کریں گے بلکہ تم سب

کو یہ مناسب ہی کہ نشان نبوی لےکر اوز سب زیر نشان ہوکر ارادہ
قتل کفار کرو البتہ دہشت اوپر کافر کے ہوکر بھاگے گا اور دھلی
میں عمل بادشاہ جمع وقت شاہ کا ہوا بارہ منزل تک اور لازم ہی
اور رئیس تہنیت علی خان بہادر افضل الدولہ پر ذات سے اپنے نکل کر
اور اپنے ساتھ جھنڈا اسلام بھی لےکر فتح یاب کفار کے ہوکر ارادہ
دھلی کا کریں تو مناسب ہی نہیں تو آیندہ بہت قباحت ہی ہم پر
واجب تھا سب مسلمانوں کی جناب میں عرض کئے ہیں آیندہ مختار
ہیں بتاریخ پچیسویں شوال بروز جمعہ یعنی عیدالمومنین ہی سنہ ۱۲۷۳ھ
سب جمع ہوکر مسجد میں جمع ہوکر تم حملہ اوپر سے کرو ادھر سے
ہم حملہ کرتے ہیں اور اوس کو اگر اکھاوے (یعنی یہ کاغذ) وہ نسل
یزید کی ہوگا

بسم اللہ الرحمن الرحیم یہاں کے جتنے امیر ہیں سو سب نصاریٰ کی اولاد ہیں نواب ناصر الدولہ بہادر کو جادو کر کر مارے ہیں کس واسطے کہ آج ان کا فرنگی یار آوے گا بتلائے تو سمجھاتے نہیں اور کہتے ہیں کہ تم بے فکر رہو اور غریبوں سے پوچھے تو کہتے ہیں کہ امیر یہاں کے نہیں ارادہ کرتے ہم کو کیا کام ہے آرام سے روٹی کھاتے ہیں فکر میں کون پڑے حیدرآباد کے جتنے ہیں چھوٹے اور بڑے سب پر جو ہی سات پشتن تک اور وہ مخوش کی اولاد ہیں.... اور نصاریٰ کے فرزند بنے ہوئے ہیں اور طلاق اون سب پر سات پشتوں تک نہ نکلین واسطے جہاد کے اور پچیسویں شوال مقرر کئے ہیں اور نہ نکلے تو وہ اولاد سور کی اور کتے کی اور گدھے کی اور الو کی......... غرض واسطے خدا کے جہاد کرو کہلاؤ شہید پھر ایسا وقت قابو میں نہیں آئے گا

(جنگ آزادی میں اردو کا حصہ)

مغلیہ سلطنت کا شیرازا اورنگ زیب کی وفات کے چند ہی سال بعد بکھرنے لگا۔ مرکز کے کمزور ہوجانے کی وجہ سے مخالف باغیانہ طاقتیں ابھر آئیں۔ نتیجا یہ ہوا کہ سارے ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ انگریز تاجروں نے موقع سے فائدا اٹھایا۔ ان کی ریشہ دوانیوں اور 'دوعملی' سے انتشار بڑھتا ہی گیا۔ سیاسی و معاشرتی زوال کے ساتھ ساتھ اقتصادی بے چینی اور بے روزگاری بھی بڑھتی گئی۔ ناصرالدین محمد شاہ کے زمانے میں نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ رہی سہی ساکھ بھی ختم ہوگئی۔ شاہ عالم کے زمانے میں اس ابتری کی تکمیل ہوگئی۔ ملک کے ان حالات سے متاثر ہوکر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے ایک تحریک شروع کی جو مذہبی بھی تھی اور سیاسی بھی۔ وہ ملک کے موجودہ اقتصادی نظام کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی رائے میں سلطنت مغلیہ کے زوال کا سبب اقتصادی بدنظمی تھی۔ ان کا قول ہے کہ جس سماج میں اقتصادی توازن نہ ہو وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریک ناکام رہی ورنہ شاید ہندوستان کی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔

اردو شاعری نے اپنے زمانے کے سیاسی و اقتصادی حالات کا اثر قبول کیا مگر کم۔ زیادہ اثر قبول کرنے کی اس سے توقع بھی نہ کی جاسکتی تھی۔ اس زمانے میں شعرا کو آج کی سی آزادئ فکر و خیال اور آزادئ بیان حاصل نہ تھی اور نہ حب وطن کا وہ تخیل پیدا ہوا تھا جو اب ہے۔ قومیت کا موجودہ تصور حقیقۃً یورپ کی پیداوار ہے اور اٹھارہویں صدی میں وجود میں آیا۔

قدیم اردو شعرا نے جو کچھ کہا ہی وہ زیادہ تر [1] اشاروں میں ہی۔ انھوں نے شہر آشوب بھی کہے ہیں۔ ان میں اپنے زمانے کی صرف تصویر ہی نہیں کھینچی گئ ہی بلکہ تنقید بھی کی گئ ہی۔ بعض شعرا کی تنقیدیں کافی سخت ہیں۔ حاتم، سودا، میر، قائم، جعفر علی حسرت، کمال الدین کمال وغیرہ کے شہر آشوب خصوصاً اہم ہیں۔ ان شہر آشوبوں کے علاوہ بعض شعرا کے مفرد اشعار میں بھی اس زمانے کی اقتصادی بے چینی اور سیاسی انتشار کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً شاہ مبارک آبرو اپنے زمانے کی حالت کا نقشا یوں کھینچتے ہیں:

اب زمانا ہی بے طرح بگڑا
کیا بنے روزگار کی صورت

زبانی ہی شجاعت ان سبھوں کی
امیر اس جگ کے ہیں سب شیر قالیں

عبدالحئ تاباں نے ملک کی ایک متاع عزیز کے چھن جانے پر اس طرح اپنے داغ ہائے دل کو نمایاں اور اپنی بے بسی کا اظہار کیا ہی:

داغ ہی ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباں
نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تخت طاؤس

طرح اسکندر کے تاباں شاہ ہفت اقلیم ہو
گر ٹنک اک جرات کرے یہ خسرو ہندوستاں

حاتم کے شہر آشوب میں طبقاتی کشمکش کی اچھی مصوری ہی۔

---

[1] ان اشاروں میں سب سے قدیم اشارا راجا رام نرائن موزوں کا یہ شعر ہی جو انھوں نے نواب سراج الدولہ کی وفات پر کہا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

انھوں نے ارکانِ حکومت اور خود بادشاہ پر بھی کڑی تنقید کی ہی۔ سودا کے شہر آشوب میں مغلیہ سلطنت کی زبوں حالی، امرا کی تباہی اور رعایا کی ابتری کا ذکر ہی۔ ان کی بعض ہجویں بھی سیاسی ہیں۔ قصیدۂ تضحیک روزگار بہ ظاہر گھوڑے کی ہجو ہی لیکن حقیقت میں اس زمانے کے نظام حکومت پر تنقید ہی۔ شیدی فولاد خاں کی ہجو بھی سیاسی نظم ہی۔ اس میں پُلیس کی بدانتظامیوں کا پول کھولا گیا ہی۔ ان نظموں کے علاوہ سودا کی ایک قطعہ بند غزل ہی جس میں انھوں نے ایک گدا کی زبان سے آئینِ حکومت بتائے ہیں۔ میر کے یہاں بھی حالات کی مصوری کے ساتھ ساتھ بادشاہِ وقت پر تنقید ہی۔ میر نے کئی مخمس لکھے ہیں۔ ان سے اس زمانے کی اقتصادی بے چینی کا اچھا اندازا ہوتا ہی۔ ایک مخمس کا ایک بند ہی:

عمدہ جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں　　سو بھی اسباب گروی رکھتے ہیں
ہیں سپاہی جو بھوکے مرتے ہیں　　لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار، پیچھے ایک ہی ڈھال

میر کے ان مفرد اشعار سے بھی اس زمانے کی اقتصادی بے چینی کا پتا چلتا ہی:

نہ بیٹھ اب امیروں کی صحبت میں میر　　ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

کیا کہیے اپنے عہد میں جتنے امیر تھے　　ٹکڑوں پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے

صناع ہیں سب خوار ازآں جملہ ہوں میں بھی　　ہی عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

میر نے دلی کی بربادی پر بھی بڑے دل دوز اشعار کہے ہیں۔ ان

سے اس زمانے کی اقتصادی حالت کا بھی اندازا ہوتا ہے:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے　　جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہند میں ہوگئے برباد ہزاروں اس سال　　شامت بخت بہ ای بار خدا کس کی ہے

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں　　تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

عبدالحیٔ تاباں کے ان اشعار سے بھی اس دور کی ابتری کا قیاس کیا جاسکتا ہے:

فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے ہائے!　　اب میسر ان کو نہیں ہوتا ہے ٹاٹ

گھر کے گھر خاک میں مل گئے فلک کے ہاتھوں
پر نہیں اس کی خرابی کے کچھ آثار ہنوز

میر طبعاً سنجیدہ و متین اور بردبار تھے۔ ان کے شہر آشوبوں میں بادشاہ پر تنقید ضرور ہے لیکن نرم لہجے میں۔ مگر قائم نے اپنے شہر آشوب میں شاہ عالم پر نہایت سخت تنقید کی ہے۔ اس مطلق العنانی کے دور میں بادشاہ وقت پر کھلم کھلا تنقید کرنا معمولی بات نہ تھی۔ قائم نے اپنا گھر بار اپنی آنکھوں سے لٹتے دیکھا تھا اس لئے ان کے لہجے میں صرف تلخی ہی نہیں بلکہ کہیں کہیں درشتی بھی آگئی ہے۔ بعض اشعار متانت سے گر گئے ہیں۔ ان کے غم و غصہ کا اس بند سے اندازا لگ سکتا ہے:

کیسا یہ شہ کہ ظلم پہ اس کی نگاہ ہے　　ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں دادخواہ ہے
یہ ایک آپ، ساتھ میں شری سپاہ ہے　　ناموس خلق سائے میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے نہ ظل الٰہ ہے

قائم کے برعکس جعفر علی حسرت کے یہاں آہ و فغاں ہی۔ بے کسی و بے بسی کا اظہار ہی:

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویراں ۔ کہ جیسے بادِ خزاں سے ہو حالت بستاں
نہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفاں ۔ گذر گیا ستم افغاں کے ظلم سے جو وہاں
فغاں! کہ ہو گیا یہ کشتِ سبز سب پامال

. . . .

جو بادشاہ وہاں کا رکھے تھا تخت اور تاج ۔ وہ اپنی قوت کو اطفال کا ہوا محتاج
خدائی ہی جسے دیتا تھا سارا ہند خراج ۔ غنیم آن کے لے اس سے اس کے شہر سے باج
وہ شکل ہی کہ کرے شیر کو شکار شغال

شاہ کمال الدین کمال کے یہاں بھی بے بسی کا اظہار ہی۔ انھوں نے اپنے شہر آشوب میں اپنے زمانے کی خستہ حالی، شاہ عالم، وزرا و امرا کی بے دست و پائی اور شہر دہلی کی تباہی کا نقشا بڑی عمدگی سے کھینچا ہی۔ ان کے شہر آشوب میں انگریزوں سے بےزاری کا اظہار بھی ہی۔

وزیر و شاہ جو ہیں ان کے ملک کا ہی یہ ڈھنگ ۔ کہ اپنے بخت سے رہتی ہی ان کو نت اٹھ جنگ
وزیر تو ہیں گرفتار یاں بقید فرنگ ۔ سکھ اور مرہٹوں نے واں کیا ہی شاہ کو تنگ
نہیں رہا ہی کچھ اقبال ان کا جز ادبار

. . . .

وہی یہ شہر ہی اور ہی وہی یہ ہندستاں ۔ کہ جس کو رشک جناں جانتے ہیں سب انساں
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہو کے سب ویراں ۔ نظر پڑے ہی بس اب صورتِ فرنگستاں
نہیں سوار رہے یاں سوائے ترک سوار

جہاں کہ نوبت و شہنائی جھانجھ کی تھی صدا ۔ فرنگیوں کا ہی اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا

اسی سے سمجھو رہا سلطنت میں کیا رتبا ۔ ہو جبکہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہی نہ وزیر، اب فرنگی ہیں مختار

اودھ کی تباہی دلی کی بربادی سے کسی طرح کم نہیں اور زیادہ عبرت ناک پہلو یہ ہی کہ شاعر کو گلۂ آشنا کرنا پڑا۔ آصف الدولہ کے بعد تخت کے حق دار وزیر علی خاں تھے۔ سعادت علی خاں نے انگریزوں سے مل کر ان کے خلاف سازش کی۔ ان کی اس ذہنیت اور انگریز دوستی پر جرات نے جل کر کہا تھا:

سمجھیں نہ امیر ان کو ابلِ تو تیر ۔ انگریزوں کے ہاتھ سے قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں وہی منہ سے بولیں ۔ بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

مصحفی کا یہ شعر بھی عوام کے جذبات کی اچھی ترجمانی کرتا ہی:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی ۔ کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

ان دو شعروں سے بھی عام لوگوں کے جذبات اور انگریز دشمنی کا اندازا لگایا جاسکتا ہی:

لعنت ہی ایسے سکے اور زر چلانے میں ۔ سر کمپنی کا کٹ کے بکا سولہ آنے میں

کیا سستی قیمت ہوگئی ٹیپے کی راہ کی ۔ دو پیسے منڈی بکتی ہی لندن کے شاہ کی

واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر کے کلام میں شکوۂ غم روزگار اور گلۂ ستمِ آسمان ضرور ملتا ہی۔ مگر سیاسی جذبے کی تلاش ان کے یہاں نہ کرنی چاہئے۔

عوام میں حریت اور وطن دوستی کا جذبہ بیدار کرنے میں اخباروں کا نمایاں حصہ ہوتا ہی۔ اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما ۱۸۲۳ع میں نکلا اور مغلیہ

قطعہ تہنیت عید سعید فرمودۂ حضرت ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی

صادق الاخبار دہلی کا پہلا صفحہ جس کے
سرے پر بہادر شاہ ظفر کا ایک قطعہ جو
انھوں نے عید کے موقع پر کہا تھا، چھپا ہی -

سلطنت کے خاتمہ تک تقریباً پینتالیس اخبار جاری ہوئے۔ تاریخ صحافت اردو کے مصنف کی رائے ہے کہ "ہندوستان کے اخبارات میں اردو کے اخبارات بھی مجموعی اعتبار سے آزاد خیال تھے اور بہت بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ بدیشی انگریزی حکومت کے خلاف جس قدر جذبہ پیدا کرسکتے تھے وہ انھوں نے پیدا کیا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جو بغاوت کی تھی اس کی زیادہ تر ذمہ داری گارسن ڈتاسی نے ان اخبارات پر عاید کی ہے۔"[۱]

اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ دو اخباروں کے نام لئے جاسکتے ہیں: صادق الاخبار اور دہلی اردو اخبار۔ صادق الاخبار کے مہتمم کو "اس جرم میں کہ وہ سرکار کی بدخواہی کی خبریں جھوٹی گڑھ کر لکھا کرتا تھا تین برس کی قید ہوئی۔"[۲] مقدمۂ بہادر شاہ کے ایک سرکاری گواہ چنی لال کا بیان ہے کہ "جمال الدین ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا تھا جس کے مضامین قطعی انگریزی حکومت کے خلاف ہوتے تھے۔ اس اخبار کا نام صادق الاخبار تھا۔"[۳]

دہلی اردو اخبار میں "ہندوستانی ریاستوں اور دہلی کے دربار کی خبروں کے ساتھ ان کی بدانتظامیوں پر سنجیدگی اور آزادی کے ساتھ تبصرے ہوتے تھے۔ اس اخبار کا اڈیٹر برائی کے خلاف آواز اٹھانا اپنا مذہبی فرض سمجھتا تھا۔ اس کے ذہن میں امیر اور غریب، ہندو مسلم اور سکھ کا امتیاز نہیں تھا۔"[۴]

۱۔ تاریخ صحافت اردو صفحہ ۲۹۶ ۲۔ بغاوت ہند صفحہ ۳۸۵ ۳۔ بہادر شاہ کا مقدمہ صفحہ ۷۰ بحوالۂ تاریخ صحافت اردو صفحہ ۱۹۶
۴۔ تاریخ صحافت اردو صفحہ ۱۰۸

اس اخبار میں اکثر ایسی خبریں شائع ہوتیں جن میں انگریزوں کے ظلم و ستم کا ذکر ہوتا یا جن میں انگریزوں کے خلاف سازش ہوتی۔ مثلاً یکم نومبر ۱۸۴۰ع کے اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی[1]:۔

«لاہور، اخبار سے واضح ہوتا ہی کہ کنور صاحب (کنور نہال سنگھ) نے دوست محمد خاں (والیٔ افغانستان) کو لکھا ہی کہ تمہارے ساتھ ہوکے میں مقابلہ سپاہ انگریزی کا کروں اور فرزندِ خانِ مذکور کو طلب کیا ہی بایں اقرار کہ میں اس کو فوجِ سکھ کا سپہ سالار بناؤں گا اور مشہور ہی کہ نیپالی لوگ بھی اس سازش میں شامل ہوجائیں گے۔»

دہلی اردو اخبار کے مالک اور اڈیٹر محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر تھے۔ جب دہلی پر انگریزوں کا دوبارا قبضا ہوا تو محمد باقر کو سولی پر چڑھادیا گیا۔ آزاد کے نام بھی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوچکا تھا۔ لیکن وہ کسی طرح بچ کر بھاگ نکلے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہی کہ ہمارے ادیب اور شاعر ہندوستان کی پہلی ہی تحریکِ آزادی میں دار و رسن کی آزمائش سے گذرے۔

غدر یا پہلی جنگ آزادی ہماری سیاسی تاریخ میں ایک نیا موڑ ہی۔ یہ صحیح ہی کہ یہ جنگ آج کل کی طرح منظم طریقے پر نہیں لڑی گئی۔ بعض طبقوں نے صرف شرکت ہی سے گریز نہیں کیا بلکہ انگریزوں کا ساتھ دیا۔ یہ حالات کا تقاضا تھا۔ آج کل کی سی تنظیم کی اس زمانے میں توقع بھی نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں

---

[1] تاریخ صحافت اردو صفحہ ۱۲۸

کیا جاسکتا کہ یہ پہلی جنگ تھی جو ہندوستانی لشکریوں اور عوام نے انگریزوں کے خلاف لڑی۔ انگریز غالب ضرور آئے مگر مقابلا سخت تھا۔ آزادی کی اس جدوجہد کےلئے زمین ہموار کرنے اور عوام میں بیداری پیدا کرنے میں علما، ادبا اور شعرا کا نمایاں حصہ ہے۔ ان میں امام بخش صہبائی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب مصطفا خاں شیفتہ، منیر شکوہ آبادی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جاسکتے ہیں۔

۱۸۵۷ع کے انقلاب کے بعد ہندوستان کی دنیا بدل چکی تھی۔ ہنگامہ و شورش کے بجائے ایک قسم کا سکون پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن یہ سکون عارضی و ظاہری تھا۔ ساکن سمندر کی تہ کے نیچے طوفانی لہریں ہر وقت اُٹھتی رہتی ہیں۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں بھی جذبات کا ایک طوفان اُٹھتا رہتا تھا۔ مگر وہ سیاسی حیثیت سے اس طرح کچل دئے گئے تھے کہ ان میں زندگی کے آثار بہت کم پائے جاتے تھے۔ ہندو مسلمان دونوں کوئی متحدہ سیاسی یا اصلاحی تحریک شروع کرنے کے بجائے اپنی اپنی قوم کا ماتم کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ع کے بعد سے انیسویں صدی کے تقریباً آخر تک اردو ادب میں یہی نقطۂ نگاہ پایا جاتا ہے۔ مگر چند دور اندیش ہندو اور مسلمانوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ سماجی اور تہذیبی حیثیت سے ہندو مسلمانوں میں زندگی پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے خاتمہ تک متعدد سوسائٹیاں مثلاً انجمن حمایت اسلام (لاہور)، انجمن پنجاب (لاہور)، انجمن تہذیب (لکھنؤ)، پراتھنا سماج، دکن ایجوکیشنل سوسائٹی، دہلی سوسائٹی وغیرہ وجود میں آئیں۔ انھی سماجی و تہذیبی سوسائٹیوں نے آگے چل کر سیاسی پروگرام کےلئے زمین ہموار کی۔

سرسید کی تعلیمی و اصلاحی تحریک سے اردو ادب میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ سید نے اپنے گرد ادیبوں کا ایک گروہ جمع کرلیا

تھا اور بقول سید سلیمان ندوی "جس کا ہر فرد ایک ادبی ریاست کا مالک تھا"۔ انھی ادبی رئیسوں کی کوششوں سے اردو میں افادی ادب پیدا ہوا۔ انھوں نے ادب کو زندگی سے الگ کوئی چیز تصور نہیں کیا بلکہ ادب کے تہذیبی اور معاشرتی تعلق کا احساس کیا۔ حالی سب سے پہلے شاعر ہیں جو ملک کی سیاسیات سے متاثر ہوئے۔ ۱۸۵۷ع کے انقلاب اور بربادی پر سب سے زیادہ جس شاعر کا دل تڑپا تھا وہ حالی ہی تھے۔ انھوں نے اس ہنگامہ کو "دریائے عتاب ذوالجلال کی موج زنی" اور "نظم عالم میں خلل" سے تعبیر کیا ہے۔ جب انگریزوں کے قدم ہندوستان میں سیاسی حیثیت سے جم گئے اور مغربی تہذیب و تمدن نے مشرقی تہذیب و تمدن کو مٹانا شروع کیا تو حالی نے فریاد کی:

کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب	عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو، شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب	آرہی ہے روشنی مغرب سے اٹھتی اک نظر
رو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی	اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دستکاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی	علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

حالی سب سے پہلے شاعر ہیں جن کا دل ہندوستان کی غلامی پر رویا۔ صاحبِ شعرالہند کے اس بیان سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ:

"حریت و آزادی کا لفظ آج بچے بچے کی زبان پر ہے۔ لیکن اس زمانے میں جب کہ یہ لفظ جرم خیال کیا جاتا تھا، سب سے پہلے حالی ہی نے ہندوستان کی غلامی کا ماتم کیا..."[1]

---

[1] شعرالہند جلد اول صفحہ ۴۰۵

اس دور میں بھی عوام میں بیداری اور زندگی پیدا کرنے میں اردو اخباروں نے نمایاں حصہ لیا۔ انگریزوں نے سیاسی غلبے کے علاوہ دماغی و اخلاقی حیثیت سے بھی اپنے آپ کو ہمیشہ ہندوستانیوں سے بہتر جانا اور ان سے قریب آنے کے بجائے اپنے اور رعایا کے درمیان ایک آہنی دیوار کھڑی کردی۔ نتیجا یہ ہوا کہ حاکم و محکوم کے درمیان بے گانگی و منافرت کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار نے انگریزوں کی ذہنیت کا یہ خلاصا پیش کیا:

" ہندوستانی کتنا ہی علم و فن میں کمال حاصل کریں اور کتنے ہی دیانت دار اور خوش کردار ہوجائیں مگر وہ انگریزوں کے نزدیک بےایمان اور غیر مہذب ہی رہیں گے اور انگریز چاہیں جتنی بدافعالیاں کریں مگر وہ شریف رہیں گے۔ " [1]

سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور قانونی حیثیت سے انگریزوں نے اپنے لئے برتری قائم کرلی تھی اور ہمیشہ ہر ممکن طریقہ سے ہندوستانیوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ اردو اخبار ان پر سخت تنقید کرتے۔ [2] مثلاً رفیقِ ہند (لاہور) ایک موقع پر لکھتا ہی:

" ایک ہندوستانی بندۂ خدا ایسی بےرحمی کےساتھ مارا جاتا ہی اور ہماری گورنمنٹ اس کے قاتلوں پر

1۔ The Awakening of the Public Opinion از پروفسر قاسم علی سجن لال مطبوعہ Hyderabad Academy, 1955.

2۔ اس موضوع پر پروفسر قاسم علی سجن لال کا مندرجہ بالا مضمون پڑھنے کے لائق ہی۔

صرف اپنی ناراضی اور افسوس کا اظہار کافی سمجھتی
ہے - کیا اگر کسی یورپین کے ساتھ یہی واقعہ کسی
ہندوستانی کے ہاتھوں ظہور میں آتا تو صرف اظہار
افسوس کر کے گورنمنٹ اسے چھوڑ دیتی ؟ [1]،،

البرٹ بل ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے - انگریزوں کے مقدمے ہندوستانی مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہیں ہوسکتے تھے - لارڈ رپن نے اس تکلیف دہ نسلی امتیاز کو ختم کرنا چاہا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس کی لیجسلیٹو مجلس کے قانونی ممبر نے ایک بل پیش کیا - یورپین اور اینگلو انڈین طبقے نے اس کی سخت مخالفت کی اور بل پاس نہ ہوسکا۔ اس واقعہ نے غافل ہندوستانیوں کو چونکا دیا ور ان میں بیداری کا جذبہ ابھر آیا - اردو اخبارات نے انگریزوں کی اس ذہنیت سے متعلق مضامین لکھے، کارٹون بنائے، نظمیں شائع کیں - منشی امراؤ علی لکھنوی نے البرٹ بل کے نام سے چار ایکٹ کا ایک ڈراما لکھا جو کتابی صورت میں شائع ہوچکا ہے - یہ ڈراما تکنیک اور انداز بیان کے لحاظ سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، مگر اس سے ہندوستانیوں کے جذبات کی ترجمانی بہرحال ہوتی ہے - اودھ پنچ میں جوالا پرشاد برق کا مضمون ،،البرٹ بل،، اپنے طنز کے لحاظ سے اہم ہے - ہزار داستان نے ،،دغا باز کون ہے ؟،، کے عنوان سے مضمون لکھا۔ پروفیسر قاسم علی سجن لال نے اس کے بعض حصوں کا انگریزی میں جو ترجمہ کیا ہے اس سے اس کی اہمیت اور ہندوستانیوں کے جذبات کا اندازا کیا جاسکتا ہے - ہزار داستان میں ایک اور مضمون جس کا عنوان ،،دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں،، شائع ہوا تھا - اس کے چند جملے یہ ہیں :

---

[1] رفیق ہند (لاہور) بحوالۂ مضمون بالا

"سب سے زیادہ انگریزوں کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکانے والا گورنمنٹ ہند کا یہ انصاف کہ یورپین اور ہندوستانی کا پلا برابر ہو، یعنی ضابطۂ فوج داری کی ترمیم ہے۔ معاذاللہ! اس ترمیم پر یورپین گویا جامۂ تن سے باہر ہوگئے۔ وجہ یہ ہو کہ اب وہ کس کے لئے ڈیم فول کہیں گے، کس کو سوز کہیں گے۔[1]"

۲۹ دسمبر ۱۸۸۳ع کی اشاعت میں وہ پھر انگریزوں پر خفگی کا اظہار کرتا ہی:

" انگریزوں کی پوری حماقت ہی کہ البرٹ بل کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندوستان کو ہم نے بزور شمشیر فتح کیا ہی، پس فاتح اور مفتوح میں فرق ضروری رہنا چاہئے ۔[2]"

۲۱ جولائی ۱۸۸۳ع کی اشاعت میں اس نے اپنے غم و غصہ کا اس طرح اظہار کیا:

ہندوستانیوں پر یہ بات اچھی طرح واضح و ثابت ہوگئی کہ یہ سمجھنا کہ ہماری سرکار فاتح اور مفتوح میں کچھ تمیز نہیں رکھتی ...... اور اس کا دل تعصب سے پاک ہی صرف دھوکا تھا۔ اب

---

[1] ہزار داستان ٥ اپریل ۱۸۸۳ ع بحوالۂ مضمون پروفسر قاسم علی سجن لال

[2] ہزار داستان ۲۹ دسمبر ۱۸۸۳ ع بحوالۂ مضمون پروفسر قاسم علی سجن لال

بالکل توقع نہ رہی کیوں کہ عذر تمیز قوم نکل آیا۔" [1]

ایک اور اخبار نے لکھا کہ انگریزوں سے مساویانہ برتاؤ کی جو توقع تھی وہ غلط ثابت ہوئی۔ [2]

اگرچہ بل ناکام رہا اور ہندوستانیوں کو بڑی مایوسی ہوئی لیکن پھر بھی اسے ناکام نہیں کہہ سکتے۔ اس نے ہندوستانیوں کی غلط توقعات کو ختم کردیا۔ انگریزوں کی ذہنیت کا عوام کو بھی اندازا ہو گیا۔ ان سب سے بڑھ کر فائدا بقول پروفسر قاسم علی سجن لال یہ ہوا کہ "اس سے ہندوستانیوں کو سبق ملا کہ اگر مٹھی بھر اینگلو انڈین اور یورپین اپنا غیرمعقول مطالبا منوا سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستانی عوامی تنظیم اور پروپگنڈے کے ذریعہ اپنے مطالبات نہ منوا سکیں۔" [2] اس طرح کہا جاسکتا ہی کہ ہندوستانیوں میں اپنی قوت و قومیت کا احساس یہیں سے شروع ہوتا ہی۔ احساس کے اسی بیج میں دو سال بعد (۱۸۸۵ع میں) کلے پھوٹتے ہیں۔ عوام کی جان فشانیوں اور قربانیوں سے وہ پودا بنتا ہی اور برگ و بار لاتا ہی۔ اخبار عام (لاہور) کے شاعر نے بجا طور پر ہندوستانیوں کو یہ پیغام دیا:

ای ساکنانِ خطۂ ہندوستاں بڑھو — آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں بڑھو
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو — کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو

اس دور کے اخباروں میں سب سے نمایاں نام اودھ پنچ (لکھنو) کا ہی۔ اس کے بانی اور اڈیٹر منشی سجاد حسین کاکوروی معاشرتی لحاظ سے قدامت پرست تھے، لیکن سیاسی حیثیت سے وہ جدید نسل کے علم برداروں میں تھے۔ انھوں نے بھی سر سید کی طرح اپنے گرد ادیبوں اور شاعروں کا

---

[1] ہزار داستان بحوالۂ مضمون پروفسر قاسم علی سجن لال

[2] مضمون پروفسر قاسم علی سجن لال

ایک اچھا حلقا بنالیا تھا۔ اودھ پنچ نے زندگی کے ہر شعبے کی طرف توجہ کی۔ اس کا نقطۂ نگاہ تصوراتی نہ تھا، عملی تھا۔ اس رنگ کے اور کئی پرچے نکلے لیکن انہیں اودھ پنچ سے کوئی نسبت نہیں۔

اودھ پنچ ۱۸۷۷ع میں جاری ہوا۔ اس وقت ملک میں سیاسی شورش نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ابتدائی پرچوں میں انگریزی حکومت سے زیادہ مغربی تہذیب و تمدن پر طنز ہے۔ جب ملک میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو اودھ پنچ نے بھی اس طرف توجہ کی۔ اب انگریزی حکومت و سیاست بھی اس کے تیروں کی زد میں آنے لگی۔ دیسی ریاستوں کی بد انتظامیوں اور بد عنوانیوں پر بھی اس میں سخت تنقید ہوتی تھی۔ اس کے نشتر کافی تیز ہوتے تھے۔ اس دور میں جبکہ اخباروں کو آج کی سی آزادی حاصل نہ تھی اودھ پنچ کا انگریزی حکومت پر دلیری کے ساتھ تنقید کرنا قابل ستائش ہے۔ سجاد حسین نے 'کھلا خط، سر بستہ مضامین، کی سرخی کے تحت مختلف وائسراؤں اور حکام کے نام جو خط لکھے ہیں وہ ان کی اخلاقی جرات، بےباک صداقت اور سیاسی بصیرت کا اچھا ثبوت ہیں۔ اودھ پنچ کے کارٹون بھی نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ ان کی نشتریت بعض اوقات بہت تیز ہوجاتی ہے۔ مگر ان میں زہرناکی نہیں ہوتی۔ یہ اچھے طنز کے لئے ضروری ہے۔ رشید احمد صدیقی کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ «طنز و ظرافت کا یہ پہلو (کارٹون) اردو میں کم یاب بلکہ نایاب تھا۔ اودھ پنچ کے بعض کارٹون اپنی ندرت اور جامعیت کے اعتبار سے یورپین صحائف کے بعض بہترین کارٹونوں سے لگا کھاتے ہیں۔»[1]

اودھ پنچ کے مضمون نگاروں اور شاعروں کی فہرست کافی لمبی ہے۔

---

[1] طنزیات و مضحکات صفحہ ۱٦۵

ان میں سید محمد آزاد ۔ چکبست اور اکبر الہٰ آبادی خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں۔ اکبر قدامت پرست تھے۔ انگریزی حکومت کے ملازم تھے۔ لیکن وہ بیرونی اقتدار کے مخالف تھے۔ انھیں اپنے ملک و قوم کی غلامی کا احساس تھا۔ وہ انگریزوں کی سیاست اور شاطرانہ چالوں سے بے زار تھے۔ ہنگامہ و شورش انھیں پسند نہ تھی۔ مگر وہ اپنے وطن کی عظمت کا احساس ضرور رکھتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ زیادہ تر اشاروں میں ہی۔ وہ کھلم کھلا کچھ بھی نہ سکتے تھے۔ لیکن اس کی تلافی انھوں نے اپنے تیروں اور نشتروں سے کردی۔ ان کے اس شعر میں:

محفل ان کی، ساقی ان کا   آنکھیں میری، باقی ان کا

جس بے بسی اور مظلومی کا اظہار پایا جاتا ہی وہ ایک دفتر میں نہیں سما سکتا۔

بیسویں صدی کی ابتدا سے ہماری قومی جد و جہد میں ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہی۔ حقیقت یہ ہی کہ بیسویں صدی کا آغاز سارے ایشیا کے لئے ایک نیا پیغام تھا۔ چین میں بغاوت ہوئی، ترکی میں انقلاب آیا، ایران نے بیداری کی کروٹ لی، جاپان نے روس کو شکست دے کر یورپ کی برتری کے پندار کو ختم کردیا۔ ان حالات سے ہندوستان کا اثر قبول کرنا ضروری تھا اور اس نے اثر قبول کیا۔ اردو ادب بھی بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوا۔ حسرت موہانی، لالا لاجپت رائے، ظفرعلی خاں وغیرہ نے خصوصاً اپنے مضامین اور نظموں کے ذریعہ ہندوستانی عوام میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی دور میں پریم چند کی پانچ وطنی کہانیوں کا ایک مجموعہ (سوز وطن) شائع ہوا جسے حکومت انگریزی کے حق میں خطرناک سمجھا گیا اور اس کی کُل کاپیاں ' بحق سرکار، ضبط کرلی گئیں۔ یہ

پریم چند کی ابتدائی کوشش تھی لیکن یہ افسانے اپنے مقصد کے لحاظ سے کامیاب کہے جاسکتے ہیں۔ شاعری کا نیا انداز جو حالی و آزاد نے شروع کیا تھا ملک میں مقبولیت حاصل کررہا تھا۔ اب بڑے دل کش و ولولہ انگیز انداز میں وطن کے ترانے گائے جارہے تھے۔ اقبال کی ہمالیا، نیا شوالا، تصویر درد، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اسی دور کی یادگار ہیں۔ چک بست کی 'خاک وطن' بہت مقبول ہوئی۔ سرور جہاں آبادی کی نظم 'پھولوں کا کنج' بھی اپنے اندر بڑی دل کشی رکھتی ہے۔ اقبال نے آگے چل کر 'شعاع امید' کے عنوان سے جو نظم لکھی وہ اپنے خلوص، سوز اور تڑپ کی وجہ سے غیرفانی بن چکی ہے۔ آنند نرائن ملا کی 'زمین وطن' اس فہرست میں ایک نہایت خوش گوار اضافہ ہے۔ وطن دوستی کے جذبات کے علاوہ شعریت و غنائیت کے لحاظ سے بھی یہ نظم اردو کی اعلا درجے کی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ حامداللہ افسر، ساغر وغیرہ کی بعض وطنی نظمیں بھی اچھی ہیں۔ بعض شعرا نے سلاطین سلف کی یادگاروں سے متعلق نظمیں کہی ہیں۔ بہ ظاہر وہ عمارتوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن درپردا وطنیت کا ایک محدود نقطۂ نظر بھی ان میں پایا جاتا ہے۔ اس قسم کی نظموں کے سلسلے میں اسماعیل میرٹھی، صفی لکھنوی اور سکندرعلی وجد کے نام خاص طور پر لئے جاسکتے ہیں۔

اسی زمانے میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوا۔ اگرچہ ابھی عوام نے تحریک کا کچھ زیادہ اثر قبول نہیں کیا تھا لیکن ہمارے شاعر اور ادیب اس سے متاثر ہوئے۔ اکبر نے اس تحریک کا یوں خیرمقدم کیا:

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں
پہنچائے گا قوت شجرِ ملک کی بُن میں

تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہی اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہی چھیڑا دیس کی دُھن میں

...

دُھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دہاتی
بسکٹ سے ہی ملائم، پوری ہو یا چپاتی

لیکن اکبر کو قوم کی بے بسی کا بھی احساس تھا:

کامیابی کا سودیشی پر ہر اک در بستہ ہی
چونچ توتا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہی

اقبال کی دوررس نگاہوں نے بھی مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ شاخ نازک پر بننے والا آشیانا بہت جلد ٹوٹنے والا ہی۔ یہ شاعر کی عظمت کا ثبوت ہی۔ ۱۹۰۵ع کے لگ بھگ انھوں نے چند مضامین بھی لکھے تھے۔ «ان مضامین میں انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہی کہ ہماری غلامی اور افلاس کا اصل سبب یہ ہی کہ صنعتی حیثیت سے ہمارا ملک پچھڑا ہوا ہی اور جب تک ملک میں صنعتی ترقی نہ ہوگی اس وقت تک بیرونی تسلط سے نجات حاصل کرنا مشکل ہی۔»[۱]

اگرچہ ۱۹۰۶ع میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑچکی تھی اور شبلی کے اثر سے نوجوان مسلم طبقا سیاست سے دل چسپی لینے لگا تھا لیکن مجموعی حیثیت سے مسلمان اس میدان سے دور تھے۔ ۱۹۱۱ع میں جب جنگ بلقان چھڑی تو انہیں برطانوی سامراجیت کا احساس ہوا اور وہ بہت بے چین ہوئے۔ نظمیں کہی جانے لگیں، جلسے ہونے لگے، اخباروں میں مضامین

---

[۱] سردار جعفری، رسالۂ صبا (حیدرآباد) اردو کانفرنس نمبر

چھپنے لگے۔ شبلی کی 'شہر آشوب اسلام، جو جذبات کی ترجمانی اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ایک غیرفانی نظم ہے اسی پُرآشوب زمانے کی یادگار ہے۔ اس دور کی دوسری نہایت اہم نظم اقبال کی 'حضور رسالت مآب میں، ہے۔ اقبال کے ہم عصر ظفر علی خاں کا بیان ہے کہ "جنگ طرابلس کے زمانے میں اقبال کا کلام مسلمانان عالم پر رجزخوانی کا اثر رکھتا تھا"۔[1] ہاشمی فرید آبادی کی 'چل بلقان چل، 'ماتم طرابلس، اور 'بس اب ہو آج سے آغاز میری کارفرمائی، بھی عوام کے جذبات کی اچھی ترجمانی کرتی ہیں۔

اس عہد میں جو اخبار نکلے ان میں الہلال، ہمدرد، ہمدم، مدینہ، مسلم گیزٹ خصوصیت سے اہم ہیں۔ الہلال پہلا اردو اخبار ہے جس نے مسلمانوں کے جمود و تعطل کو دور کرنے کی کوشش کی اور ان میں سیاسی بیداری کی روح پھونکی۔ الہلال کی آواز ایک اونچے پہاڑ پر سے گرتے ہوئے آبشار کے مانند تھی۔ آبشار خوب صورت بھی ہوتا ہے اور پُرجلال بھی۔ سرور نے بہت صحیح کہا ہے کہ ابوالکلام نے "مذہبی احساس کو سیاسی شعور اور سیاسی شعور کو ادبی رنگ دیا"۔[2] اسی دور میں اور اسی اخبار میں شبلی نے سیاسی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ یہ اپنی قسم کی پہلی چیز تھی۔ یہ نظمیں اپنی نشتریت کی وجہ سے اردو ادب میں اہمیت رکھتی ہیں۔ اس انداز کی تقلید آگے چل کر ظفرعلی خاں نے کی اور کامیاب رہے۔ 'ہمدرد، محمدعلی کا اخبار تھا۔ وہی اس کے اڈیٹر بھی تھے۔ محمدعلی کا جوش، بے باک صداقت، جرات اور سامراج دشمنی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ محمد علی نے اپنے گرد انشاپردازوں کا ایک حلقا بنالیا تھا۔ یہ بڑے ذہین لوگ تھے۔ محفوظ علی بدایونی، محمد فاروق دیوانہ،

---

[1] سب رس (حیدرآباد) اقبال نمبر صفحہ ۸۷ بحوالۂ اقبال کامل صفحہ ۲۴۲

[2] ادب اور نظریہ: صفحہ ۲۶۷

ولایت حسین وغیرہ کے سیاسی مضامین، لطیفے اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے اور دلوں پر دیرپا اثر چھوڑتے تھے۔ 'ہمدم، مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔ ہمدرد کی طرح یہ بھی سامراجیت کا کھلم کھلا مخالف تھا۔ 'مدینہ، اپنے توازن و سنجیدگی کے لئے ہمیشہ ممتاز رہا ہے مسلم گیزٹ شبلی کی کوشش سے نکلا تھا۔ وحیدالدین سلیم اس کے اڈیٹر تھے۔ اس کے مضامین بھی تند و تیز ہوا کرتے تھے۔ شبلی کا مشہور مضمون 'مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ، اسی اخبار اور اسی دور کی یادگار ہے۔

۱۹۱۴ع میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔[1] اس میں ترکی جرمنی کے ساتھ تھا۔ اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردی ترکوں کے ساتھ تھی۔ نتیجا یہ ہوا کہ پرس ایکٹ کے تحت الہلال، ہمدرد وغیرہ کی ضمانتیں ضبط کرلی گئیں اور بہت سے مسلم لیڈر نظر بند کردئے گئے۔ شبلی کی نظم 'جنگ یورپ اور ہندوستانی، بھی خطرناک سمجھی گئی اور ان کے نام گرفتاری کا وارنٹ نکلا۔ لیکن گرفتار ہونے سے پہلے وہ قید زندگی سے رہا ہوگئے۔ ۱۹۱۶ع سے ہوم رول کی صدا ہندوستان کے گوشے گوشے سے سنائی دینے لگی۔ چکبست نے اس صدا کا نسبتاً زیادہ اثر قبول کیا۔ ان کی نظموں میں اپنی بے بسی، وطن کی عظمت اور انقلاب کی ضرورت کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان میں خلوص کے ساتھ شعریت ہے اور یہ دلوں پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔

۱۹۱۸ع میں جنگ ختم ہونے کے بعد جب برطانیا نے خلاف وعدہ

---

[1] اکبر کا ایک شعر ہے:

حرج کیا رُپیا جو کاغذ کا چلا   غم نہ کھا روٹی تو گیہوں کی رہی

ہندوستانیوں کو ان کے سیاسی حقوق نہیں دئے بلکہ رولٹ ایکٹ کی شکل میں ان کی غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کر دیا تو وہ بہت برہم ہوئے۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے ہونے لگے۔ جلیان والا باغ (امرت سر) کے جلسے میں حکومت نے اپنے اقتدار کا مظاہرا کیا۔ چند سکنڈ میں پانسو مقتول اور پندرہ سو آدمی زخمی ہوئے۔ لوگوں کو پیٹ کے بل چلایا گیا۔ بچوں کو بید سے پیٹ پیٹ کر بےہوش کیا گیا۔ مقرروں کی تقریروں، شعرا کی نظموں اور اخبار نویسوں کے مضامین نے وہ کام نہیں کیا جو اس حادثہ نے کیا۔ سارے ملک میں حریت و آزادی کی لہر دوڑ گئی۔ ہندو مسلم کی تفریق مٹ گئی۔ وطن دوستی کا جذبہ ہر دل میں بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں کی برہمی کا ایک اور سبب بھی تھا جنگ ختم ہونے کے بعد برطانیا نے ایشیاے کوچک میں ترکی کے مقبوضات فرانس اور انگلستان میں تقسیم کرلئے۔ یہ سراسر وعدہ خلافی تھی۔ مسلمانوں نے جدوجہد شروع کی کہ ترکی کے مقبوضات اسے واپس مل جائیں۔ محمد علی ایک وفد انگلستان لے گئے لیکن اس جدوجہد کا نتیجا کچھ نہ نکلا۔ خلافت کا مسئلہ در اصل سارے ہندوستان کا مسئلہ تھا۔ اگر ایشیا پر برطانیا کا اقتدار بڑھ جاتا تو ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں اور مضبوط ہو جاتیں۔ آخر ہندو مسلمانوں نے مل کر تحریک خلافت شروع کی۔ اس تحریک کا اس قدر اثر ہوا کہ بقول ڈاکٹر اشرف «عام لوگوں کے جوش اور انگریز دشمنی کا یہ عالم تھا کہ مولانا محمد علی کا اعتدال آمیز رویہ بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور خواجہ حسن نظامی جیسے زاویہ نشینوں نے 'لکھو تکبیر' جیسے مضامین لکھے جو چھپتے ہی ضبط کر لئے گئے۔»[1] ۱۹۲۰ع میں تحریک ترک موالات شروع ہوئی۔ سارے ملک میں ایک طوفان سا آگیا۔ ایثار و قربانی اور قید و بند کا دور

---

[1] رسالۂ جوہر (جامعۂ ملیہ) جوبلی نمبر

شروع ہوگیا۔

اردو ادب نے ان حالات کا اثر قبول کیا۔ نئے نئے اخبار وجود میں آئے۔ رسالے چھپنے لگے۔ تند و تیز مضامین کی اشاعت ہونے لگی۔ شعرا کی نظمیں روح کو تڑپانے اور قلب کو گرمانے لگیں۔ ان دونوں تحریکوں کا اثر ملک و قوم پر اس قدر تھا کہ بقول ڈاکٹر اشرف «غلام بھیک نیرنگ، چودھری خوشی محمد خاں ناظر، آغا حشر بلکہ سید ہاشمی فریدآبادی جیسے جمود پسند اور انقلاب نا آشنا شبلی، حسرت موہانی اور اقبال سے بڑھ کر شرر فشانی کیا کرتے تھے اور ان کا یہ کلام ہماری انقلابی شاعری میں ہمیشہ یادگار رہے گا»۔[1]

اس دور میں جن ادیبوں اور شاعروں کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جاسکتے ہیں وہ محمد علی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور اقبال ہیں۔ ابوالکلام کے یہاں نسبتہً زیادہ جوش و خروش ہے۔ لیکن ان کی آواز دماغ کی آواز ہے۔ بقول آل احمد سرور "وہ بلندیوں میں پرواز کے عادی ہیں۔ زمین پر مشکل سے قدم رکھتے ہیں"[2]۔ محمد علی کی آواز دل کی آواز ہے۔ وہ آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ سرور نے بالکل صحیح کہا ہے کہ «ابوالکلام نے ذہن کو آزاد کیا، محمد علی نے دلوں کو۔»[3]۔ محمد علی کی شخصیت میں جو رنگارنگی اور خلوص تھا اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ ان کے مضامین اور غزلوں میں جو سوز و گداز اور تاثیر پائی جاتی ہے وہ اسی رنگا رنگی اور خلوص کا نتیجا ہے۔ محمد علی نے نثر میں بہت کھلم کھلا باتیں کی ہیں لیکن غزلوں میں انھوں نے گل و بلبل اور جام و مینا کا پردا

---

[1] رسالۂ جوہر (جامعۂ ملیہ) جوبلی نمبر [2] ادب اور نظریہ صفحہ ۲۶۷ [3] ایضاً

استعمال کیا ہی ۔ اس سے شعریت تو بڑھ گئی مگر جوش و اثر کم ہوگیا۔ پھر بھی ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہی جن میں "عشق کی آن بان اور جہاد آزادی کے سپاہی کی آن بان بڑی دل‌کشی سے مل جل گئے ہیں۔" [1]

خاک جینا ہی اگر موت سے ڈرنا ہی یہی ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہی یہی

کہہ دو رضواں سے نہیں سایۂ طوبا درکار اپنی جنت ہی یہیں چھاؤں میں تلواروں کی
جب نہیں وعدے کو ایفا سے ذرا بھی سروکار پھر کمی کیا ہو تمھارے لئے اقراروں کی

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح اس کے لئے چمن کی خزاں کیا، بہار کیا

یہ کیسی بزم ہی اور کیسے اس کے ساقی ہیں شراب ہاتھ میں ہی اور پلا نہیں سکتے

یہ بھی کیا پیروئ حق ہی کہ خاموش ہیں سب ہاں انا الحق بھی ہو، منصور بھی ہو، دار بھی ہو

ظفر علی خاں اپنی سیمابی طبیعت کی وجہ سے سیاسی دنیا میں اپنے لئے کوئی بہت بلند مقام پیدا نہ کرسکے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے اپنی نثر و نظم کے ذریعہ ملک و قوم کی بہت خدمت کی۔ ان کے متعلق سرور کی یہ رائے بہت صحیح ہی کہ "وہ تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ نعرۂ مجاہدین دلوں میں گھستا جارہا ہی۔ لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ ایک دودھاری تلوار ہی جو دونوں طرف ستھراؤ کرتی جارہی ہی اور نظم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ ہمالیا کے چشمے ابل رہے ہیں۔" [1] ان کی اکثر نظموں کو شاید دوام حاصل نہ ہوسکے۔ یہ ان کی صحافتی

---

[1] ادب اور نظریہ

زندگی کا اثر ہو۔

حسرت میں بھی محمد علی کی طرح بڑا خلوص تھا۔ وہ انقلابی تھے۔ انہیں توپ کے دہانے پر کھڑے ہوکر جان دینا منظور نہ تھا۔ وہ توپ کے دہانے کا رخ دشمن کی طرف موڑ دینا چاہتے تھے۔ ان کا یہ نقطۂ نظر ان کے مضامین اور خطبات میں اکثر پایاجاتا ہو۔ غزلوں میں ان کی شخصیت اتنی نمایاں نہیں ہوتی، پھر بھی ان کی بعض غزلیں سیاسی شاعری کا اچھا نمونا ہیں۔ غزل میں سیاسی مضامین سب سے پہلے حسرت نے شامل کئے۔

اقبال کی وطنی شاعری سے متعلق بہت کافی لکھا جا چکا ہو۔ میں یہاں صرف ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سردار جعفری نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ :

> "بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقبال ۱۹۰۸ع سے پہلے وطن‌پرست اور ہندوستان کی آزادی کے خواہاں تھے اور ۱۹۰۸ ع کے بعد وہ 'مسلمان' ہوگئے اور ان کا وطن پرستی کا جذبہ ختم ہوگیا۔ میں سمجھتا ہوں یہ اقبال کی اتنی بڑی توہین ہو جس کی کوئی حد نہیں......
>
> "وہ صرف مسلمانوں کے شاعر نہیں ہیں۔ انہیں فرقہ پرست کہنا ان پر اور ان کی شاعری پر ظلم کرنا ہو اس لئے کہ ان کا پیام ساری انسانیت کے لئے ہو اور وہ آزادی، ترقی اور مادی و روحانی سر بلندی کے لئے

آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کی شاعری آزادی کی
جدوجہد کے ساتھ چلتی ہی اور اس کو طاقت
بخشتی ہی۔ ہماری آزادی کی کوئی ایسی منزل نہیں
جس کا پتا اقبال کے کلام سے نہ چلتا ہو۔" [1]

اس دور میں ہزاروں نظمیں کہی گئیں۔ ظاہر ہی ان سب کو دوامِ نصیب نہیں ہوسکتا۔ لیکن ان سے اس بات کا ثبوت ضرور ملتا ہی کہ شعرا نے قومی تحریک میں حصہ لیا۔ ان نظموں میں قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہی۔ اسے حریت کا درس دیا گیا ہی۔ عمل کا پیغام سنایا گیا ہی اتحاد و یگانگت کی ترغیب دلائی گئی ہی۔ اکبر کا یہ قطعہ جو پنڈت مدن موہن مالویا کی فرمائش پر کہا گیا تھا اسی دور صلح وآشتی کی یادگار ہی۔

محرم اور دسہرا ساتھ ہوگا نباہ اس کا ہمارے ہاتھ ہوگا
خدا ہی کی طرف سے ہی یہ سنجوگ تو کیوں رکھیں نہ باہم صلح ہم لوگ

اس دور میں نئے نئے اخبار بھی بہت نکلے۔ حقیقت (لکھنؤ)، زمیندار (لاہور)، پرتاپ (لاہور)، بندے ماترم (لاہور)، تیج (دہلی)، ملاپ (لاہور)، خلافت (بمبئی)، انقلاب (لاہور)، الجمعیۃ (دہلی)، مسلم (دہلی)، ویر بھارت (لاہور)، وغیرہ اسی دور حریت میں نکلے۔ ان اخباروں نے آزادی کی تحریک کو ہوا دی۔ انگریزی حکومت کے خلاف تند و تیز لہجے میں مضامین لکھے، پرجوش نظمیں چھاپیں، برطانوی سیاست پر تنقید کی اور عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔ ان کے اڈیٹروں کو تنبیہ کی گئی۔ ان سے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی گئی۔ اخباروں کی ضمانتیں ضبط کرلی گئیں۔ جب ان تمام

---

[1] صبا (حیدرآباد) اردو کانفرنس نمبر صفحہ ۸۹

پر بھی جوش و خروش کا بند نہ ٹوٹا تو آخر حکومت نے انہیں سزائے قید دی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نہ جذبۂ حریت کم ہوا، نہ حق کی صدا بند ہوئی اور نہ تحریک ختم ہوئی۔ تحریک اگر ماند پڑی تو آپس کے نفاق سے۔ یہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک المیہ ہے۔

خلافت کی تحریک کے دوران میں بہت سے مسلمان حکومتِ برطانیا کے خلاف احتجاج کے طور پر ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان، ترکی وغیرہ چلے گئے۔ بہت سے مہاجرین تاشقند، سمرقند، بخارا وغیرہ بھی پہنچے۔ روس میں ابھی چند سال پہلے رعایا کی حکومت قائم ہوئی تھی اور اشتراکی نظریہ بڑے زوروں پر اشاعت پا رہا تھا۔ ہندوستانی مہاجرین میں سے اکثر اس نظریہ سے متاثر ہوئے۔ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو اپنے ساتھ ملک کے لئیے ارمغان روس اشتراکی نظریہ کی صورت میں لائے۔ ادھر مزدور طبقا سرمایا داروں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر اپنی تنظیم کر چکا تھا اور ان کی تحریک زوروں پر تھی۔ فیکٹری ایکٹ بن چکا تھا۔ ۱۹۲۳ع اور ۱۹۲۴ع میں اہم ہڑتالیں ہوئیں اور دونوں میں مزدور اپنے مطالبات منوانے میں کام یاب رہے۔ آخر گورنمنٹ کو ٹریڈ یونین ایکٹ بنانا پڑا۔ مگر چوں کہ سرمایا داروں کی جنگ زرگری جاری رہی، مزدوروں کے مطالبات بھی اپنی جگہ پر اٹل رہے۔ جو لوگ اشتراکی خیالات روس سے لے کر آئے تھے انہیں کام کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ اس طرح اشتراکی نظریہ ہندوستان میں جڑ پکڑ گیا۔ ۱۹۲۶ع میں کان پور میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس ہوئی۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر حسرت موہانی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبے میں کمیونزم اور اس کے اصول اور کمیونسٹ پارٹی کے اغراض و مقاصد وضاحت اور سلجھاؤ کے ساتھ سمجھائے ہیں۔ لیکن مزدوروں کے درد کو جس شاعر نے سب سے پہلے محسوس کیا، ان کی بے بسی پر بے چین ہوا اور انہیں ان کی اہمیت جتائی

وہ اقبال تھے۔ سب سے پہلے اقبال نے مزدوروں اور دہقانوں کو مخاطب کیا۔ انھیں بیداری کا پیغام دیا۔ ان میں ولولہ اور امنگ پیدا کی۔ اقبال نے ۱۹۱۲ع میں دہقان کو اس کی اہمیت جتائی:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو ای دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

اقبال ہی نے سب سے پہلے مزدور کو یہ پیغام دیا:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہی
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہی

اقبال کی 'خضر راہ' اگرچہ مسلم نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہی لیکن اس میں عام انسان کا درد ہی، صرف مسلمان کا نہیں۔ جس عہد میں یہ نظم کہی گئی ہی ساری دنیا شورش و بےچینی کے دور سے گذررہی تھی۔ اس میں زمانے کی چیخ صاف سنائی دیتی ہی۔ سرور نے ٹھیک کہا ہی کہ یہ نظم New Testament کی حیثیت رکھتی ہی۔ جس جوش و روانی اور دردمندی کے ساتھ اس میں مزدوروں کی وکالت کی گئی ہی اور جس مجاہدانہ لہجہ میں انہیں بیداری اور عمل کا پیغام دیا گیا ہی وہ اردو کی کسی دوسری نظم میں نہیں پایا جاتا۔

حسرت نے بھی اشتراکی تحریک سے بہت پہلے مزدوروں سے ہم دردی کا اظہار کیا اور انھیں ان کی خوش‌حالی کا مژدہ سنایا تھا:

نہ سرمایا داروں کی نخوت رہے گی نہ حکام کا جور بےجا رہے گا
زمانا وہ جلد آنے والا ہی جس میں کسی کا نہ محنت پہ دعوا رہے گا

رفتہ رفتہ اشتراکی نظریہ روس و ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی پھیل گیا۔ ادب نے بھی اس کا اثر قبول کیا۔ ۱۹۳۶ع میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بِنا پڑی۔ ہندوستان میں بھی اسی سال ترقی پسند مصنفین کی ایک انجمن قائم ہوئی۔ اس میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ پریم چند، مجنوں، جوش وغیرہ جیسے کہنہ مشق افسانہ نگار و ادیب و شاعر بھی شامل تھے۔ اب قومی و وطنی ترانے کے ساتھ ساتھ کسان، مزدور، بے کاری، افلاس وغیرہ بھی ہماری شاعری کے موضوع قرار پائے۔ ملوکیت و سرمایا داری کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ ہونے لگا۔

اشتراکی تحریک اور جوش کی شاعری کا اثر تقریباً تمام نوجوان شعرا پر پڑا۔ احسان دانش، سردار جعفری، مجاز، مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد وغیرہ اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سردار جعفری کی 'نئی دنیا کو سلام، اور 'جمہور، اردو ادب میں خوش گوار اضافہ ہیں۔ دونوں نظموں میں بڑی تازگی اور زندگی ہی۔ 'جمہور، اقبال کے ساقی نامہ سے متاثر ہوکر کہی گئی ہی۔ اس میں شاعر نے ایک نئی صبح اور نئے آفتاب کے طلوع ہونے کی خوش خبری دی ہی۔

پریم چند، اعظم کریوی، علی عباس حسینی، کرشن چندر وغیرہ نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ کسانوں اور مزدوروں کے جذبات کی اچھی عکاسی کی ہی۔ انھوں نے صرف ان کی بے کسی و بے بسی پر ماتم نہیں کیا ہی بلکہ ان کی حمیت و غیرت کے جذبے کو ابھارا ہی۔ پریم چند سب سے پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے دیہات اور اس کی زندگی کو اپنے افسانوں میں داخل کیا۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں ہندوستان کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہی۔ پریم چند کے افسانوں اور ان کی مقبولیت نے ملک میں بہت

سے افسانہ نگار پیدا کئے۔ انھوں نے مزدوروں اور دہقانوں کی وکالت و حمایت کے ساتھ ساتھ غلامی کے خلاف نفرت کا بھی جذبہ پیدا کیا۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادی حاصل کرنے کا بھی پیغام ملتا ہے۔ انفرادی آزادی کی جد و جہد کا پیغام سب سے پہلے اقبال نے دیا۔

ہماری آزادی کی جد و جہد کے ساتھ ساتھ ہمارا کس بل بھی بڑھتا گیا۔ ۱۹۲۹ع میں ملک میں سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ اردو کے اخباروں، ادیبوں اور شاعروں نے حسب معمول اس تحریک کا خیر مقدم کیا اور اپنے مضامین اور نظموں کے ذریعہ اسے ہوا دی۔ اس دور میں پرانے لکھنے والوں میں سے بہتوں نے لکھنا بند کردیا اور بہت سے اس دنیا ہی میں نہ رہے۔ ان کی جگہ نوجوان پود نے لی۔ بہت سے شاعر شباب کی سرسبز وادی کو ترک کرکے سیاست کے خارزار میں آگئے۔ اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی کا نام خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔ حریت پسندی کے جذبات ان کی ابتدائی شاعری میں بھی پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۱ع میں 'زنداں کا گیت' لکھا اور 'شکست زنداں' کا خواب دیکھا۔ لیکن سول نافرمانی کے زمانے میں اور ترقی پسند تحریک شروع ہونے کے بعد ان کے جذبات میں زیادہ شدت پیدا ہوئی۔ ان کی آواز کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ اونچی ہوجاتی ہے، لب و لہجہ غیر شاعرانہ ہوجاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اردو کے ایک نقاد کو ان کے یہاں 'شیطانی جلال' نظر آتا ہے۔ مگر پھر بھی ان کا نام انقلابی شعرا کی فہرست سے خارج نہیں کیا جاسکتا جوش کے متعلق عزیز احمد کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ "باوجود ان کے (جوش کے) اس تمام جوش و خروش، اس تمام ابال اور شورش کے کبھی کبھی ان کے خلوص اور عقیدے پر بھی شک ہوتا ہے۔ اس کی وجہ جوشِ الفاظ کی فراوانی لیکن جوش کردار کی کمی ہے۔

پھر بھی انھوں نے اردو ادب میں اپنے لئے ایک لازوال جگہ پیدا کرلی ہے۔،،[1]

اقبال اور جوش کا اثر نوجوان شعرا نے عموماً قبول کیا ان میں ساغر، آنند نرائن ملا، فراق، سکندر علی وجد، مجاز، مخدوم محی الدین، سردار جعفری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا نے بھی سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادی کےلئے جد وجہد کی۔

دوسری جنگ عظیم نے ہندوستان کی سیاست پر گہرا اثر ڈالا۔ اسی جنگ کے دوران میں 'ہندوستان چھوڑ دو' کی تحریک شروع ہوئی۔ سارا ملک بیدار ہوچکا تھا اور حریت کا جذبہ ہر دل میں موج زن تھا۔ آتش شوق تیز سے تیز تر ہورہی تھی۔ اردو ادب نے یہاں بھی وقت کا ساتھ دیا۔ عوام کو آثار وقت سے آگاہ کیا، آزادی کا گیت گایا، زمانے کا چیلنج سنایا، زلف چلیپا کی برہمی کو مشتہر کیا، موسم کے اشارے بتائے، سحر نو کے طلوع ہونے کا مژدا سنایا اور ایک نئ صبح وطن کی بشارت دی۔ اس دور کی دو نظمیں خصوصاً ہماری انقلابی شاعری میں یادگار رہیں گی۔ جوش کی نظم 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام' ان عیوب سے قطعی پاک ہے جو عام طور پر ان کی نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے لہجے میں خلوص اور دردمندی ہے۔ اسلوب بیان دلکش ہے۔ پوری نظم اثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ انگریزوں کے پچھلے مظالم کو ایک ایک کرکے گنایاگیا ہے اور آخر میں انھیں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ وقت کا فرمان بدل چکا ہے اور اب

اک کہانی وقت لکھےگا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

---

[1] ترقی پسند ادب صفحہ ۱۱۶

دوسری نظم جگن ناتھ آزاد کی "سبھاش چندر بوس" ہی۔ اتنے نرم ولطیف اور پُرتاثیر لہجے میں اس دور میں کم نظمیں کہی گئی ہوں گی۔ سبھاش چندر بوس کی زبان سے شاعر نے ہندوستان کے عوام کے جذبات کی اچھی ترجمانی کی ہی۔ نہ الفاظ کا طنطنہ ہی نہ تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار۔ پوری نظم بڑے سبک انداز میں کہی گئی ہی۔ موسیقی و ترنم بھی ہی اور دل کشی و تاثیر بھی۔ اپنی پستی کا احساس بھی دلایا گیا ہی اور اس پستی سے اُبھرنے کا جذبہ بھی پیدا کیا گیا ہی:

عشق بازی لے گیا ہی عقل بے چاری ہی دنگ | نوجوانوں کے دلوں میں سرفروشی کی امنگ
نعرۂ جی ہند سے ساری فضا معمور ہی | فتح ونصرت کی دعاؤں سے ہوا معمور ہی
اور ہم آغوش اجل سرہنگ زادوں کی قسم | مجھ کو ای شاہِ وطن اپنے ارادوں کی قسم
حاکمِ دہلی، مآلِ شہرِ دہلی کی قسم | لال قلعہ کی، زوالِ شہرِ دہلی کی قسم

میں تری کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لاؤں گا
اور ترے مرقد پہ نصرت یاب ہوکر آؤں گا

ہماری آزادی کی جد و جہد کا کوئی موڑ ایسا نہیں جہاں اردو ادب نے اس کا ساتھ نہ دیا ہو۔ بقول سردار جعفری "اردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کو قومی دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے بین قومیت سے ملائے اور اس طرح ایک زیادہ جان دار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا [1]"۔ لیکن ہمارا سارا سیاسی ادب قابل احترام نہیں۔ عموماً ہمارے یہاں سستی خطابت اور خواہ مخواہ کی چیخ پکار ملتی ہی۔ بجائے نعرا بلند کرنے کے گلا پھاڑا جاتا ہی۔ جدید نسل کے شعرا میں علم کی بھی کمی ہی اس لئے ان کی فکر میں بلندی اور خیالات میں

---

[1] صبا (حیدرآباد) اردو کانفرنس نمبر ص ۸۹

گہرائی نہیں پائی جاتی۔ اخباروں میں جو کچھ لکھا گیا اس کا بیشتر حصہ جذبات پر مبنی ہے۔ منطقی استدلال کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین اور نظموں کو دوام نصیب نہ ہوسکا۔ مگر اس کے باوجود ایسا کافی سرمایا موجود ہے جسے زمانا کبھی بھلا نہیں سکتا۔ اسی قسم کے سرمائے کا ایک انتخاب یہاں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سمندر کے چند قطرے ہیں سمندر نہیں۔

انجمن اسلام
بمبئی ۱

عبد الرزاق قریشی

پہلا حصہ

۱ ۔ جنگِ آزادی اور دہلی مرحوم

۲ ۔ وطن دوستی

جنگِ آزادی اور دہلی مرحوم

جنگِ آزادی کی اسباب

[جنگ آزادی کے سلسلہ میں انگریزوں کو یہ
کامل یقین تھا کہ اس خونریزی کے پیچھے مسلمانوں
اور صرف مسلمانوں کا ھاتھ ہی کیونکہ وہ اس طرح
اپنا کھویا ہوا سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی آخری
کوشش کرنا چاہتے تھے - اس لئے وہ کسی حالت
میں بھی مسلمانوں سے متعلق بھلائی یا صفائی کا ایک
لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتے تھے - لیکن سر سید
نے عواقب و نتائج کے کامل علم کے باوجود اس
طرف بہادرانہ قدم بڑھایا اور اسباب بغاوت ہند میں
نہایت جرات کے ساتھ بتایا کہ اِس تحریک کی تہ
میں کسی خاص جماعت کا کوئی مذہبی یا سیاسی جذبہ
نہ تھا بلکہ یہ تحریک نتیجہ تھی ان غلط کاریوں کاجن
میں انگریز کچھ تو اپنی عدم واقفیت کی بنا پر اور
کچھ حکومت کے نشہ کی وجہ سے مبتلا ہوگئے
تھے - سر سید کی رائے میں غدر یا جنگِ آزادی
کے یہ اسباب تھے -]

اول - غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا -

دوم - جاری ہونا ایسے آیئن اور ضوابط اور طریقۂ حکومت کا جو ہندوستان
کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت
رسانی کرتے تھے -

سوم - ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گذرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ کی طرف سے پھٹا جاتا تھا۔

چہارم - ترک ہونا ان امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجا لانا ہماری گورنمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لئے واجب اور لازم تھا۔

پنجم - بد انتظامی اور بے اہتمامی فوج کی ۔

غالب (مرزا اسد اللہ خاں)

داغِ ہجراں

[ذیل کے اشعار غالب نے علاء الدین احمد خاں کو
سنہ ۱۸۵۸ ء میں ایک خط میں لکھ کر بھیجے تھے جو
آگے چل کر دیوان میں شامل کئے گئے۔[1]]

بسکہ فعال مایرید ہی آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہی آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہی — گھر بنا ہی نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہی ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہ ہی رونا تن ودل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

---

[1] خطوط غالب مرتبۂ غلام رسول مہر

یادگارِ عندلیب

ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا ،،آتی نہیں اب کیوں صداے عندلیب،،
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
یہ نشانی رہ گئی ہی اب بجاے عندلیب

بربادئ دہلی

۱

(منشی ہرگوپال تفتہ کے نام)

شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ ع

وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ محبت در پیش آئے ـ شعر کہے ـ دیوان جمع کئے....
....ناگاہ وہ زمانہ رہا نہ وہ معاملات ـ نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط ـ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا...... مبالغہ نہ جاننا امیر و غریب سب نکل گئے ـ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے ـ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے ـ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ـ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں.....

اپنے مکان میں بیٹھا ہوں ـ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے ـ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں ـ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں ـ جرنیلی[1] بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ع تک بدستور ہے ـ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں ـ

---

[1] فوجی حکومت

۲

(میر مہدی مجروح کے نام)

۲ فروری ۱۸۵۹ع

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہی
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہی کہ کیا ہوتا ہی

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہی اور یہ حالت ہی کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہی - لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر بیٹھتا ہی - جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہی اسے پکڑ کر حوالات میں بھیجدیتا ہی - حاکم کے یہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہی - آٹھ دن قید رہتا ہی - اس سے علاوہ بہت سے تھانوں پر حکم ہی کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ[1] مقیم ہی اور کون ٹکٹ رکھتا ہی - تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے.........

کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان وکان کیوں بناتے ہیں - جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنادو - اور یہ بھی مشہور ہی کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں - جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدرِ مقدور نذرانہ دے - اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہی - روپیہ دے اور ٹکٹ لے - گھر برباد ہوجائے آپ شہر میں آباد ہوجائے - آج تک یہ صورت ہی - دیکھئے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہی - جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں - جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں - الملک اللہ و الحکم اللہ ! ! ....

---

[1] آج کل کی زبان میں اسے پرمٹ (Permit) کہہ سکتے ہیں -

۳

(میر مہدی مجروح کے نام)

سہ شنبہ ۸ نومبر ۱۸۵۹ع

شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہی [1]«ٹون ڈیوٹی» کوئی چیز ہی وہ جاری ہوگئی ہی۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی، [2]دارلبقا فنا ہوجائے گا۔ رہے نام اللہ کا! بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ غلہ گراں ہی، موت ارزاں ہی، سونے کے مول اناج بکتا ہی۔

٤

(میر مہدی مجروح کے نام)

پرسوں میں........مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازہ کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرالق و دق ہی اینٹوں کے جو ڈھیر پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہوجائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئ بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے برابر ہوگیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگرے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہوگیا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہوجائیگا۔

---

[1] چنگی [2] مفتی صدرالدین آزردہ کی درسگاہ

اللہ اللہ ! دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد ! ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں ! دلی کہاں ! ! ....

۵

(انوار الدولہ سعید الملک نواب سعد اللہ خاں کے نام)

سنہ ۱۸۶۰ ع

.... پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر۔ اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر[1] خاکیوں کا۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا۔ اس میں تاب وطاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم لیکن جس کو تپ آئی اس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا.....

٦

(بنام علاء الدین احمد خاں علائی)

یکشنبہ ۱٦ فروری ۱۸٦۲ع

کل تمہارے خط میں دوبار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ ای میری جان ! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں جس میں تم نے تحصیل علم کیا۔ وہ دلی نہیں جس

---

[1] انگریزی فوج

میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہی جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہی۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیتہ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں۔۔۔۔۔۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے ۔۔۔۔۔۔

۷

(میر مہدی مجروح کے نام)

جویائے حالِ دہلی و الور سلام لو۔ مسجدِ جامع واگذاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔۔۔۔۔۔ ۷ نومبر، ۱٤ جمادی الاول سالِ حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوا ہی۔ ان للہ و ان الیہ راجعون ! ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔

آزردہ (مفتی صدر الدین خاں)

فغانِ دہلی - ۱

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا اہل و نا اہل سے کچھ خلط انہیں زنہار نہ تھا
انکی خلوت سے کوئی واقف وہمراز نہ تھا آدمی کیا ہی فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں ان کو کہ ڈالیں سر پر

عیش وعشرت کے سوا کچھ بھی نہ تھا جنکو یاد لٹ گئے، کچھ نہ رہا، ہو گئے بالکل برباد
ٹکڑے ہوتا ہی جگر سن کے یہ انکی فریاد پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھو دہلی آباد

کب تلک داغ دل ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہوجائے زمیں شق تو سما جائیں ہم!

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہی سر ہی اور جوش جنوں سنگ ہی اور چھاتی ہی
ٹکڑے ہوتا ہی جگر جی ہی پہ بن جاتی ہی مصطفٰے[1] خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہی

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی[2] ہو

۱- نواب مصطفٰے خاں شیفتہ جنہیں بغاوت کے الزام میں سات برس کی قید ہونی تھی اور جن کی جائداد ضبط ہوگئی تھی۔
۲- امام بخش صہبائی بڑے پایہ کے عالم تھے۔ فارسی میں خصوصاً کمال رکھتے تھے۔ بغاوت کے الزام میں انہیں اور ان کے خاندان کے تمام افراد کو گولی ماری گئی۔

سالک (قربان علی بیگ)

فغانِ دہلی - ۲

جہاں میں شہر ہیں جتنے جہاں جہاں آباد　　بس ان بلاد میں تھا منتخب جہاں آباد
اُجڑ کے یاں سے نہ پوچھو ہوا کہاں آباد　　گیا عدم کو دوبارہ ہوا وہاں آباد
فلک نے کس سے کہوں کیا مٹادیا اسکو
ارم کا جوڑ سمجھ کر اٹھا لیا اس کو

یہ انقلاب ہی یا ہی قیامتِ صغرا　　کوئی نہیں ہی کہ جسکے رہے ہوں ہوش بجا
ہوئی ہو آدمی کی شکل شہر سے عنقا　　بنا ہی ہو کا مکاں بس ہر اک گلی کوچا
ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد
ہر ایک گاوں بنا ہی مگر جہاں آباد

کسی کے لب پہ ہی نالہ کسی کی چشم ہی تر　　کسی کا چاک گریباں ہی اور کوئی مضطر
کسی کا ہاتھ ہی دل پر کوئی ہی تھامے جگر　　غرض کہ رنج سے خالی نہیں ہی کوئی بشر
بجائے زمزمہ ہر جائے شیون و غم ہی
محلِ عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہی

داغ (نواب مرزا)

فغانِ دہلی - ۳

فلک زمین و ملائک مآب تھی دلّی　　بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دلّی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دلّی　　مگر خیال سے دیکھاتو خواب تھی دلّی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہاں کی شام تھی مانندِ صبح نورانی   یہاں کے ذرے میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تیرہ تھا لعل رمانی   یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی
یہ شہر وہ ہی کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغِ رشکِ تجلّی ظہور تھا اس کا

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا   تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا   غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلی تھیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی تھیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے   ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
کہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے   غرض یہاں کے لئے اک جہان روتا ہے
جو کہئے جو ششِ طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگِ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے   غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو رندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے   قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقامِ امن جو ڈھونڈو تو راہ بھی نہ ملے
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملے

لکھوں کہاں تلک القصہ حالِ بربادی   لکھوں کہاں تلک اس آسماں کی جلادی
کسی کو قیدِ محن سے نہیں ہے آزادی   کہ داغ داغ ہے دل ہر کوئی ہے فریادی
الٰہی پھر اسے آباد و شاد دکھلا دے
الٰہی پھر اسے حسب مراد دکھلا دے

ظہیر دہلوی (ظہیر الدین)

مرثیۂ دہلی - ۱

بل بے دہلی و زہے شوکت و شان دہلی! لامکاں بن گیا اک ایک مکانِ دہلی
مل گئی خاک میں سب شوکت و شان دہلی نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی
ای فلک! اپنے گریبان میں منھ ڈال ذرا ہای یہ ظلم و ستم اور کسانِ دہلی
زمزمے بھول گئے نغمہ طرازانِ چمن ہی ہر اک نوحہ گر و مرثیہ خوانِ دہلی
رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی
فلکِ پیر نے مٹی میں ملایا سب کو پھرتے ہیں خاک بسر پیر و جوانِ دہلی
چرخ بدبیں یہ غضب ہی نہ انھیں دیکھ سکا چند اشخاص تھے باقی جو نشان دہلی
رات دن گریہ ہی اور سنگ ہی اور سینہ ہی اور ظہیرِ جگر افکار و بیانِ دہلی

شیفتہ (نواب مصطفا خاں)

مرثیۂ دہلی - ۲

ہای دہلی و زہے دل شدگانِ دہلی! آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی
وہی جلوہ نظر آتا ہی تصور میں ہمیں مٹ گئے پر بھی یہ باقی ہی نشانِ دہلی
کل یوم ھو فی شان کی ہی جلوہ گری کیا ہوا گر نہ رہے شوکت و شانِ دہلی
گر نہ کہویں کہ یہ دہلی ہی تو ہرگز نہ پڑے دہلی والوں کو بھی دہلی پہ گمانِ دہلی
شیفتہ اور ستائش کے نہیں ہم خواہاں یہی بس ہی کہ کہیں ہی یہ زبانِ دہلی

مجروح (میر مہدی)

مرثیۂ دہلی - ۳

ذکر بربادیٔ دہلی کا سنا کر ہمدم — نیشترِ زخمِ کہن پر نہ لگانا ہرگز
آبِ رفتہ نہیں پھر بحر میں پھر کر آتا — دہلی آباد ہو یہ دھیان نہ لانا ہرگز
وہ تو باقی ہی نہیں جن سے کہ دہلی تھی مراد — دھوکا اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز
گیتی‌افروز اگر حضرتِ نیر رہتے — اتنا تاریک نہ ہوتا یہ زمانا ہرگز
اب تو یہ شہر ہی اک قالبِ بیجاں ہمدم — کچھ یہاں رہنے کی خوشیاں نہ منانا ہرگز
درِ میخانہ ہوا بند صدا ہی یہ بلند — یاں حریفانِ قدح خوار نہ آنا ہرگز
رہی یارانِ گذشتہ کی کہانی باقی — یہ تو بھولا ہی نہ بھولے گا فسانا ہرگز

حالی (خواجہ الطاف حسین)

مرثیۂ دہلی - ۴

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا ای دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا ای بلبل! — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہی دلِ شوریدہ بہانے مطرب — دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا ای چشم — دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت ای سیاح! — دیکھ اس شہر کے کھنڈرونمیں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک — دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — ای فلک! اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

ہم کو گر تونے رلایا تو رلایا ای چرخ! — ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

کبھی ای علم وہنر! گھر تھا تمھارا دلّی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی ہرگز — یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کردیا مرکے یگانوں نے یگانہ ہم کو — ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغ و مجروح کوسن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھوگے کبھی لطفِ شبانا ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہی حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو روکے رلانا ہرگز

---

۲ - وطن دوستی

حُبِّ وطن

ای وطن ! ای مرے بہشتِ بریں ! کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں ؟
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہی ؟ یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہی ؟
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جاں نثار ؟ یا کہ دنیا ہی تیری عاشقِ زار ؟
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں ؟ ای وطن ! تُو تو ایسی چیز نہیں
جنّ و انسان کی حیات ہی تو مرغ و ماہی کی کائنات ہی تو
ہی نباتات کا نمو تجھ سے روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہی تجھ سے نشو و نما سب کو بھاتی ہی تیری آب و ہوا
تیری اک مشتِ خاک کے بدلے لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہموطنو ! اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہوں مسلمان اس میں یا ہندو بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ لگی غیروں کی تم پہ پڑنے نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا کبھی دُرّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتلِ عام کیا کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی ایک شائستہ قوم مغرب کی
ملک روندے گئے ہیں پیروں سے چین کس کو ملا ہے غیروں سے

چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ بس بہت سوئے اُٹھو ہوش میں آؤ
قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں؟
قافلوں سے اگر ملا چاہو ملک اور قوم کا بھلا چاہو
گر رہا چاہتے ہو عزت سے بھائیوں کو نکالو ذلت سے
قوم کا مبتذل ہے جو انساں بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز ہو فقیری میں بھی وہ با اعزاز
عزتِ قوم چاہتے ہو اگر جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
اب نہ سید کا افتخار صحیح نہ برہمن کو شدر پر ترجیح
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

آزاد (محمد حسین)

حبِّ وطن

ای آفتابِ حب وطن! تو کدھر ہی آج
تو ہی کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہی آج

تجھ بن جہاں ہی آنکھوں میں اندھیر ہو رہا
اور انتظامِ دل ہی زبر زیر ہو رہا

ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہو گئے
کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہو گئے

حب وطن کی جنس کا ہی قحط سال کیوں
حیراں ہوں آجکل ہی پڑا اس کا کال کیوں

کچھ ہو گیا زمانہ کا الٹا چلن یہاں
حب وطن کے بدلے ہی بغض الوطن یہاں

بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں

کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو
ای آفتاب! ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو

عالم سے تا کہ تیرہ دلی دور ہو تمام
اور ہند تیرے نور سے معمور ہو مدام

الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہموطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم

تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور

سب اپنے حاکموں کے لئے جاں نثار ہوں
اور گردنِ حریف پہ خنجر کی دھار ہوں

علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں
اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

لبریزِ جوشِ حب وطن سب کے جام ہوں
سرشارِ ذوق و شوقِ دلِ خاص و عام ہوں

کیفی (پنڈت برج موہن)

صبحِ وطن

آنکھ سورج کی سرِ شام جھپک رہتی ہی
شب کے آتے نہ چمک ہی نہ دمک رہتی ہی

زینتِ بزمِ قمر رات ہی تک رہتی ہی
منہ اندھیرے نہ وہ رونق نہ چمک رہتی ہی

چاند سورج کے لئے رکھا ہی قدرت نے گہن
ماند ہوگی نہ کبھی روشنئ صبحِ وطن

صبح ہر روز جو ہوتی ہی تو کیا ہوتا ہی   دشت و گلزار پہ احسانِ صبا ہوتا ہی
غنچہ گل ہوتا ہی، گل لخلخہ سا ہوتا ہی   باغ نغموں سے عنا دل کے بھرا ہوتا ہی

دل کھلے صبح وطن سے بندھے الفت کی ہوا
نغمہ ہو دیس کا ہر تارِ نفس سے پیدا

شامِ غربت میں غریبوں کا سہارا ہو یہی   دہر کا نظم ونسق جس نے سنوارا، ہو یہی
قرۃ العینِ تمدن ہی، دلآرا ہی یہی   روحِ تہذیب ہو اور آنکھ کا تارا ہو یہی

عذرِ لنگ اس سے ہوئی ابلقِ ایام کی چال
گردشِ لیل و نہار اس پہ موثر ہو محال

اقبال (ڈاکٹر)

نیا شوالہ

سچ کہدوں ای برہمن! گر تو برا نہ مانے   تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا   جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر وحرم کو چھوڑا   واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہی تو خدا ہی
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہی

آ! غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھادیں   بچھڑوں کو پھر ملادیں، نقشِ دوئی مٹادیں
سونی پڑی ہوئی ہو مدت سے دل کی بستی   آ! اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ   دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملادیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے   سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہی
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہی

اقبال

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہی دل وطن میں سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں گلشن ہی جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
ای آب رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم، وطن ہی ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے اب تک مگر ہی باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہی کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری صدیوں رہا ہی دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

سرور جہان آبادی (درگا سہائے)

خاکِ وطن

آہ ای خاکِ وطن! ای سرمۂ نورِ نظر!!
آہ ای سرمایۂ آسائشِ جان و جگر!

تیرے دامن میں شگفتہ تھے کبھی قدرت کے پھول
گندھ رہے تھے تیری چوٹی میں کبھی وحدت کے پھول

تیرے کنجوں میں ترنم ریز تھے مرغانِ قدس
تیرے ویرانے میں بھی خاکِ وطن! تھی شانِ قدس

جب تمدن کا بندھا عالم میں شیرازہ نہ تھا
شاہدِ قدرت نے جب رخ پر ملا غازہ نہ تھا
بادۂ تہذیب سے خالی تھا جب یورپ کا خم
ایشیا کا آہ! جب بیڑا تھا تاریکی میں گم
جب نہ تھی یونان میں علم و ہنر کی روشنی
جلوہ افروزِ خرد تھی تیرے گھر کی روشنی

اڑ رہا تھا پرچمِ جم جاہئی اکبر یہیں
رزم گہ میں خوں فشاں رانا کا تھا خنجر یہیں
شان اونچی تھی تری، اونچا گھرانا تھا ترا
بام و در اونچے تھے، اونچا آستانا تھا ترا
نجمِ شہرت جو کبھی تھے شوکتِ افلاک کے
تھے وہ ای خاکِ وطن! ذرّے یہیں کی خاک کے
اُف ری تیرے شعلۂ سوزِ محبت کی تپش!
تیرے پروانوں کے دل میں تھی قیامت کی تپش!
کھینچ کر جذبہ جو لایا گھر سے بابر کو ترا
لے اُڑا یونان سے سودا سکندر کو ترا
آہ ای خاکِ وطن! ای خانہ آرائے ہنر!!
آہ ای جولانگہِ برقِ تماشائے ہنر!
تو وہی ہی اب بھی اور تیرے مناظر ہیں وہی
تھے جو پہلے اب بھی قدرت کے مظاہر ہیں وہی
اب بھی تیرے آبشاروں کی فضا ہی خوشگوار
اب بھی تیرے سبزہ زاروں کی فضا ہی خوشگوار

اب بھی ہیں زرخیز تیرے آہ! قطعاتِ زمیں
سیر کے قابل ہیں اب بھی تیرے کنجِ دل‌نشیں

غنچہ و گل ہیں وہی اور ہی وہی شانِ چمن
تھے جو پہلے ہیں وہ اب بھی سرو وریحانِ چمن

جنبشِ بادِ صبا میں جاں‌فزائی ہی وہی
سبزۂ صحرا میں اب بھی دلربائی ہی وہی

چوٹیاں اب بھی ہمالہ کی وہی ہیں سر بلند
پھینکتی ہیں اب بھی کرنیں چاند سورج کی کمند

تازگی اب بھی ہی تجھ پر سربسر چھائی ہوئی
ولولوں میں دل کے پستی ہی مگر چھائی ہوئی

آہ ای خاک وطن! ای درد مند و بیقرار!!
آہ ای شوریدہ قسمت! ای پریشاں روزگار!!

اُڑ رہا تھا پرچمِ شوکت ترا افلاک پر
سرنگوں ہی تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر

تیری شہرت کے نگیں خاکِ عدم میں ہیں نہاں
اب نہ وہ تختِ مرصع ہی نہ تاجِ زرفشاں

جھلملا کر بجھ گئے ہیں تیرے ایواں کے چراغ
ہیں جگر کے داغ اب تیری شبستاں کے چراغ

اڑ گیا نورِ سحر، تاریکیٔ غم چھا گئی
نیرِ اقبال ڈوبا، شامِ ماتم چھا گئی

پھر بھی ای خاک وطن! اف رے وفاداری تری!!
چار سو ہی دہر میں نہرِ کرم جاری تری

سرور جہاں آبادی

پھولوں کا کنج

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں — حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں
خون جگر سے سینچیں ہر نخل آرزو کو — اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں
ایک ایک گل میں پھونکیں روح شمیم وحدت — اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں
فردوس کا نمونہ اپنا ہو کنج دلکش — سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں
چھایا ہو ابر رحمت کاشانۂ چمن میں — رم جھم برس رہی ہوں چاروں طرف گھٹائیں
مرغان باغ بن کر اڑتے پھریں ہوا میں — نغمے ہوں روح افزا اور دلربا صدائیں
حُب وطن کے لب پر ہوں جانفزا ترانے — شاخوں پہ گیت گائیں، پھولوں پہ چہچہائیں
چھائی ہوئی گھٹا ہو موسم طرب فزا ہو — جھونکے چلیں ہوا کے اشجار لہلہائیں

اس کنج دلنشیں میں قبضہ نہ ہو خزاں کا — جو ہو گلوں کا تختہ، تختہ ہو اک جناں کا
بلبل کو ہو چمن میں صیاد کا نہ کھٹکا — خوش خوش ہو شاخ گل پر غم ہو نہ آشیاں کا
حُب وطن کا مل کر سب ایک راگ گائیں — لہجہ جدا ہو گرچہ مرغان نغمہ خواں کا
ایک ایک لفظ میں ہو تاثیر بوے الفت — انداز دلنشیں ہو ایک ایک داستاں کا
موسم ہو جوش گل کا اور دن بہار کے ہوں — عالم عجیب دلکش ہو اپنے گلستاں کا

مِل مِل کے ہم ترانے حُب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

چکبست (برج نرائن)

خاکِ ہند

ای خاکِ ہند! تیری عظمت میں کیا گماں ہی — دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہی
تیری جبیں سے نورِ حسن ازل عیاں ہی — اللہ رے زیب و زینت! کیا اوجِ عزوشاں ہی

ہر صبح ہی یہ خدمت خورشیدِ پُرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہی چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے ہیں جاری — چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری — چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو — سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا بدن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو — سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہی — اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہی
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہی — فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہی

کشمیر سے عیاں ہی جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہ رہا ہی دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہی پھولوں میں اور پھلوں میں — کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہی بجلی کی بادلوں میں — پستی سی آگئی ہی پر دل کے حوصلوں میں

گل شمعِ انجمن ہی گو انجمن وہی ہی
حُبِ وطن نہیں ہی خاکِ وطن وہی ہی

برسوں سے ہورہا ہی برہم سماں ہمارا دنیا سے مِٹ رہا ہی نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں ازل سے خوابِ گراں ہمارا اک لاشِ بے کفن ہی ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہورہے ہیں
عیش وطرب کے بندے غفلت میں سورہے ہیں

ای صورِ حب قومی! اس خواب سے جگادے بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنادے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹادے اٹھتے ہوے شرارے اس راکھ سی دکھادے

حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہوکر
سر میں خمار ہوکر دل میں سرور ہوکر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک رنگیں طبیعتوں کو رنگیں سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مبارک ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اِس خاک میں ملیں گے

وطن

مری جان ہو کہ مرا بدن
تری جلوہ گاہ ہی ای وطن
تری خاک ان کا خمیر ہی
مرے خون میں یہ جھلک تری
مری نبض میں یہ چپک تری
مری سانس تری صفیر ہی

تری خاک جگ کا خلاصہ ہی
ترا حسن ایک تماشا ہی
تری پھیلی گود کہ باغ ہی
تری خاک پاک ذلیل ہی
تو غلاموں کی دلیل ہی
تری پود شرم کا داغ ہی

تجھے ماسوا نے گرا دیا
ہمیں ماسوا نے مٹا دیا
ہوئے تفرقوں سے تمام ہم
تجھے جب تلک کہ بھلا رکھا
ہمیں وقت نے بھی مٹا رکھا
بنے گھر میں اپنے غلام ہم

جنہیں پیت ہی انہیں جیت ہی
یہی جگ میں جیت کی ریت ہی
ترے پوت اپنوں سے غیر ہیں
ہمیں غیریت یہ مٹانی ہی
ہمیں جیت آپ یہ پانی ہی
اسی گھر کے غیر سے غیر ہیں

ترے بوت بھائی بھائی ہوں ترے دل سے سب ہی فدائی ہوں
کہ تو آپ اپنی مثال ہو

ترے زور کی یہی دھاک ہو کہ جہاں برائی سے پاک ہو
ترا علم حق کا کمال ہو

آنند نرائن ملّا

زمینِ وطن

زمینِ وطن ! ای زمینِ وطن !!
ازل میں جہاں سب سے پہلے حیات
لئے اپنی آغوش میں کائنات
جلاتی ہوئی شمع ذات و صفات
حجابِ عدم سے ہوئی جلوہ زن
زمینِ وطن ! ای زمینِ وطن !!
جہاں بستر برف سے مست خواب
اُٹھا آنکھ ملتا ہوا آفتاب
لٹاتی ہوئی جلوۂ بے نقاب
جہاں آئی پہلی سنہری کرن
زمینِ وطن ! ای زمینِ وطن !!
جہاں تیرے جلوے ہویدا ہوئے
جہاں اہل دل ان پہ شیدا ہوئے
جہاں گوتم اور کرشن پیدا ہوئے
جہاں ساز فطرت ہوا نغمہ زن
زمینِ وطن ! ای زمینِ وطن !!

گئے چھوڑکر اپنے اپنے نشاں
ہوئے باری باری جہاں کامراں
جہاں آکے اُترا ہر اک کارواں
مغل، آریا، ترک، تاتار، ہن
زمینِ وطن! ای زمینِ وطن!!

کہاں ہیں ترے سورما صف شکن؟
ترے اہلِ دانش، ترے اہلِ فن؟
کہاں ہی ترا اقتدارِ کہن؟
ترے رام لچھمن، بھرت، شترگن
زمینِ وطن! ای زمین وطن!!

کسے آئے گا آج اس کا یقیں
اشوک اور اکبر کی ہی سرزمیں
ترے در پہ گھستی تھی دنیا جبیں
کبھی تو ہی تھی سجدہ گاہِ زمن
زمینِ وطن! ای زمینِ وطن!!

ترے کوہ و دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشکِ خلدِ بریں
کسی نے تجھے یوں بنایا حسیں
کہ جیسے سنواری گئی ہو دلہن
زمین وطن! ای زمینِ وطن!!

یہ دلّی کے نقش و نگارِ خموش
یہ چتوڑ کی خاکِ لالہ فروش

یہ کیلاش کی چوٹیاں لالہ پوش

تجھے ڈھونڈتی ہیں عروجِ کہن

زمینِ وطن ! ای زمینِ وطن !!

یہ معصوم بچے ترے شیر خوار

امیدیں لئے شوق سے ہمکنار

گلے ان کے ہیں اور غلامی کے بار

اور آئے نہ تیری جبیں پر شکن

زمینِ وطن ! ای زمینِ وطن !!

تجھے صولتِ بابری کی قسم !

تجھے عصمتِ پدمنی کی قسم !

تجھے خاکِ پانی پتی کی قسم !

پھر اک بار دکھلا جلالِ کہن

زمینِ وطن ! ای زمینِ وطن !!

بدلنے کو ہی موسمِ روزگار

ہواوں میں ہی ایک کیفِ خمار

تری سمت پھر آرہی ہی بہـــار

لئے پھر گل و لالۂ ونسترن

زمینِ وطن ! ای زمینِ وطن !!

اخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے

مساواتِ انساں کا پھر نام لے

روایاتِ ماضی سے پھر کام لے

وطن کو بنا درحقیقت وطن

زمینِ وطن ! ای زمینِ وطن !!

ساغر نظامی

قومی گیت

دعوا ہی ہر آن ہمارا
سارا ہندستان ہمارا

جنگل اور گلزار ہمارے — دریا اور کہسار ہمارے
کوچے اور بازار ہمارے — پھول ہمارے ، خار ہمارے

ہر گھر ، ہر میدان ہمارا
سارا ہندستان ہمارا

گو نہیں ہم میں فوجی قوت — پھر بھی بہت ہی دل میں ہمت
اور ہمارے ساتھ ہی قدرت — اب کوئی طاقت کوئی حکومت

روک تو دے طوفان ہمارا
سارا ہندستان ہمارا

ہم سے بھارت کی رونق ہی — آزادی دن رات سبق ہی
اپنی دھنک ہی اپنی شفق ہی — ہر ذرّہ پر اپنا حق ہی

کھیت اپنے، دہقان ہمارا
سارا ہندستان ہمارا

مندر ، مسجد اور میخانہ — بادہ ، ساغر اور پیمانہ
جنگل ، بستی اور ویرانہ — ہر محفل اور ہر کاشانہ

ہر در ، ہر ایوان ہمارا
سارا ہندستان ہمارا

ہند کا مالک ہر ہندی ہو — صرف یہاں اک قوم بسی ہو
بار نہ پائے خواہ کوئی ہو — چاہیے وہ خود اپنی ہی خودی ہو

دیکھ ذرا ارمان ہمارا
سارا ہندستان ہمارا

نہال سیوہاروی

وطن

سرورِ دیدہ و دل عالمِ دیارِ وطن — ہزار خلد در آغوش ہی بہارِ وطن
وطن کا جب لبِ شاعر پہ نام ہوتا ہی — تو اک حدیثِ محبت کلام ہوتا ہی
فضائے دل سے وفاؤں کے رنگ اٹھتے ہیں — تمام عشق کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں
اگر جہاں میں مذاقِ حیات پست نہیں — وہ آدمی ہی نہیں جو وطن پرست نہیں
وطن کے سرو و سمن کی ادائیں کیا کہنا ! — وطن کے باغ، وطن کی ہوائیں کیا کہنا !!
ہر ایک حسنِ سراپا ارے معاذ اللہ ! — وطن کے چشمہ و دریا ارے معاذاللہ !!
وطن کا روپ ہی ہر ایک لاکلام عزیز — وطن کی صبح ہی دلکش، وطن کی شام عزیز
عزیز اپنے وطن کی ہیں چاندنی راتیں — پسند اپنے چمن کی ہیں چاندنی راتیں
برس رہی ہی پیالہ شراب کیا کہنا ! — وطن میں دلکشئ آفتاب کیا کہنا !!
وطن کا چاند، وطن کے نجوم اچھے ہیں — وطن کے پھولوں کو جی بھر کے چوم اچھے ہیں

علی سردار جعفری

یہ ہندوستاں !

یہ ہندوستاں رشکِ خلدِ بریں — اگلتی ہی سونا وطن کی زمیں
کہیں کوئلے اور لوہے کی کاں — کہیں سرخ پتھر کی اونچی چٹاں
کہیں سنگ مرمر کی شفاف سِل — پھسلتا ہی جس کی صفائی پہ دل

بہت سے خزینے ہیں اس خاک میں ہزاروں دفینے ہیں اس خاک میں
گل و لالہ و یاسمن کے ایاغ مہکتے ہوئے آم کے سبز باغ
ہرے اور بھرے جنگلوں کی بہار جھلاجھل چمکتے ہوئے ریگ‌زار
یہ سورج کی رنگین کرنوں کا جال کہ جس طرح فطرت نے کھولے ہوں بال
افق سے اُبلتا ہوا رنگ و نور فضاوں میں پرواز کرتے طیور
کہستان کے یہ سنہرے عقاب ہواوں میں اُڑتے ہوئے آفتاب
کنول جھیل میں مسکراتے ہوئے چراغاں کا منظر دکھاتے ہوئے
یہ پھولوں سے گل پیرہن شاخسار غزالوں سے معمور یہ مرغزار
تڑپتی مچلتی ہوئی بجلیاں سمندر میں ملتی ہوئی ندیاں
یہ نیلم اور الماس کے کوہسار یہ چاندی کے پگھلے ہوئے آبشار
یہ مخمل میں لپٹی ہوئی وادیاں ہمالہ کی گل پوش شہزادیاں
یہ گنگا کا آنچل، یہ جمنا کی ریت یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت

مگر یہ خزانے ہمارے نہیں
ہمارے نہیں ہیں، تمہارے نہیں

دوسرا حصہ

۱ ۔ برطانوی حکومت اور غلامی کا احساس

۲ ۔ سیاسی بیداری کا آغاز

۱۔ برطانوی حکومت اور غلامی کا احساس

[۱۸۵۷ع کے انقلاب کے بعد ہندوستان کی دنیا بدل چکی تھی۔ ہنگامہ و شورش کے بجائے ایک قسم کا سکون پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن یہ سکون عارضی و ظاہری تھا۔ اسی لئے بہت جلد ختم ہوگیا۔ مغربی تعلیم کے زیر اثر ہندوستانیوں میں مادی اور اقتصادی تبدیلی پیدا ہوئی اور اس تبدیلی نے ان میں جذبۂ قومیت پیدا کیا۔ ملک میں مختلف مذہبی اور سماجی اصلاحی تحریکیں اُٹھیں اور کورانہ تقلید کی بندشیں ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگیں۔ اسی مذہبی اور سماجی آزادی کی خواہش نے آگے چل کر قوم میں سیاسی بیداری پیدا کی۔

ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی ابتدائی تاریخ کو تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہی:

پہلا دور : ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۷ء تک۔ اس دور میں عارضی سکون تھا۔ کہیں کہیں تشدد آمیز تحریکیں اُٹھیں۔ لیکن چونکہ ان میں کوئی تنظیم نہ تھی اس لئے ناکام رہیں۔

دوسرا دور : ۱۸۷۷ء سے ۱۹۰۵ء تک۔ ۱۸۷۷ سے ملک کی سیاسیات میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ اخبارات حکومت پر اعتراض کرنے لگے۔ انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی۔ قومیت کا احساس پیدا ہوا اور حکومت سے مطالبات ہونے لگے۔

تیسرا دور : ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱٤ء تک۔ چونکہ حکومت قوم کے مطالبات کو ہمیشہ ٹھکراتی رہی اس لئے ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جس نے محض تجویزیں پاس کرنے کی جگہ عملی کارروائی پر زور دینا شروع کیا۔]

قومی ترقی کا پہلا زینا

[۲٦ جنوری ۱۸۸۲ء کو امرت سر کی انجمنِ اسلامیہ
نے سر سید کی خدمت میں سپاس‌نامہ پیش کیا تھا۔
اس کے جواب میں مرحوم نے جو تقریر کی تھی اس
کے بعض اقتباسات ذیل میں دئے جاتے ہیں۔]

مدرسة العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہی۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہی بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہی۔ مدرسة العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کو درست کرنے کے لئے اور جو افسوسناک محرومی ان کو یورپین سینز اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی اس کو رفع کرنے کو قائم کیا گیا۔ مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مفقود ہی دونوں کو دی جاتی ہی۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو، کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ممالک میں ہم نیٹو یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ممالک والے خدابخش اور گنگارام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ غیر ملکوں میں جب ہم لوگ جاتے ہیں تو ہندو اور مسلمان کے نام سے نہیں پکارے جاتے ہیں بلکہ نیک دل لوگوں سے نیٹو یعنی ہندوستانی اور تنگ دل لوگوں سے نیگرو یعنی کالے منہ یا وحشی ہندوستانی کا لقب دونوں کو برابر ملتا ہی اور یہی سبب ہی کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہی۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں، ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پیئیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں، ایک ہی طرح کے وسائلِ ترقی دونوں کے لئے موجود نہ کئے جاویں ہماری عزت نہیں ہوسکتی۔.........

سرکاری نوکری کی بھی نسبت مجھ کو یہ کہنا چاہئے کہ کوئی وقار، کوئی عزت اس قوم کو حاصل نہیں ہوسکتی جب تک وہ حکمراں قوم کے ساتھ درجہ حاصل نہ کرے اور اپنے ملک کی حکومت میں حصہ نہ لے۔ دوسری قومیں مسلمانوں یا ہندوؤں کو محرری یا ادنا عہدوں پر دیکھ کر عزت نہیں کرتیں اور نہ کرسکتی ہیں بلکہ جو گورنمنٹ اپنی رعایا کو اس قسم کے اعزاز سے محروم رکھے وہ بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھی جاسکتی۔ عزت جبھی حاصل ہوگی جب ہمارے ملکی بھائی حکمراں قوم کے ساتھ برابر کے عہدے رکھتے ہوں۔ گورنمنٹ نے صداقت، نیک نیتی، نیک دلی اور انصاف سے اپنے ہر ملک کی رعایا کو ان عہدوں کو پانے کا برابر کا حق دیا ہی۔ البتہ ہندوستانیوں کے لئے بہت سی مشکلات اور بے انتہا موانع ہیں۔ مگر ہم کو استقلال کے ساتھ کوشش کرنی چاہئے۔ کسی تکلیف کے، کسی مشکل کے، کسی مصیبت کے خوف سے پیچھے نہ رہنا چاہئے۔ ہمارے ہندوستان کے بھائی بنگالیوں نے جو اس زمانہ میں ہندوستان کی تمام قوموں کے فخر اور سرتاج ہیں کوشش کرکے ایک درجن بنگالی سویلین بنائے ہیں۔ مگر ان کے بھائیوں کو، وہ کسی ملک کے ہوں خواہ پنجاب کے یا ہندوستان کے، مسلمان ہوں یا ہندو، ان کو شرم نہیں آتی کہ وہ پیچھے رہے جاتے ہیں اور اپنی قوم کی آنکھوں میں، غیر قوم کی آنکھوں میں ذلیل ہوتے ہیں۔ بنگالیوں کے بعد میں اور ہندو بھائیوں کی بھی قدر کرتا ہوں کہ انھوں نے بہت کچھ کیا ہی۔ مگر میں اس کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے ابھی کام پورا نہیں کیا۔ ابھی ان کو بہت کچھ کرنا چاہئے۔ ہم مسلمانوں کو سب سے زیادہ غیرت کرنا چاہئے کہ وہ سب سے پیچھے ہیں۔ اگر ان کو یہ خیال ہی کہ ان کے بزرگ بڑے معزز اور ممتاز تھے تو ان کو اور بھی زیادہ غیرت کرنا لازم ہی۔ مسلمانوں کا فرض ہی کہ کوشش کرکے اپنے ملک میں ایسے عہدے حاصل کریں جن کے حاصل کرنے کا حق گورنمنٹ نے ان کو

بخشا ہی ۔ گو میں نے یہ جملہ خاص مسلمانوں کی نسبت کہا لیکن اگر میں
للہ بہاری، گنگا رام، خدابخش میں سے کسی کو مجسٹریٹ یا کمشنر یا اسی طرح
کے کسی عہدے کی کرسی پر بیٹھا دیکھوں تو مجھ کو برابر کی خوشی ہوگی
کیونکہ اسی وقت ہمارے ملک کے لوگوں کو دوسری قوم کی نظروں میں کسی
قدر عزت حاصل ہوگی ۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تعلیم کے ساتھ کچھ اس
طرف بھی رغبت ہو کہ ہمارے ملک کے لوگ مقابلہ کا امتحان دے کر سول
سروس میں داخل ہوں ۔

جوالا پرشاد برق

اِلبرٹ بِل

[لارڈ رپن (۱۸۸۰ع سے ۱۸۸٤ع) کے زمانہ تک
انگریز ملزموں کے مقدمے ہندوستانی مجسٹریٹ کے
سامنے پیش نہیں ہوسکتے تھے ۔ رپن نے اس امتیاز
کو ختم کرنا چاہا اور اس مقصد کے حصول کے
لئے اس کی کاونسل کے قانونی ممبر اِلبرٹ نے کاونسل
کے سامنے ایک بل پیش کیا ۔ ہندوستان میں رہنے
والے انگریزوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور
رپن کو اس میں ترمیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ فیصلہ
یہ ہوا کہ انگریز ملزموں کے مقدموں کا فیصلہ جیوری
کے ذریعہ ہوا کرے گا جس کے آدھے ممبر انگریز
ہوں گے اور آدھے ہندوستانی ۔ ذیل کے مضمون
میں اسی بل کی ناکامی پر غم و غصہ کا اظہار کیا
گیا ہی ۔]

لو سارا طلسم ٹوٹ گیا ۔ ایک چھلاوا تھا جو چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہوگیا ۔ یکایک ایک بلائے آسمانی پھٹ پڑی ۔ ایک اینٹ کی خاطر مسجد ڈھائی ۔

پیارا بل ہاتھ سے بے ہاتھ ہوگیا ۔ اس کی پیدائش پر کیا کیا ناز تھے ۔ اس کے والدین نے اسے کیسے کیسے لاڈ سے پالا ۔ بچپن میں کیسی کیسی داشت کی ۔ رات کو رات، دن کو دن نہ سمجھا ۔ مگر دشمنوں کی نظر کھاگئی ۔ سوتیلی ماں کے پالے پڑا ۔ ماں باپ ہاتھ مل کر رہ گئے ۔ ہماری امیدوں کا خون ہوگیا...... کلیجہ دھک سے ہوا ۔ کیسی کچھ دل پر چوٹ لگی ۔ رہن کا زمانہ ۔ ہم خوشیاں مناتے بغلیں بجاتے مست پڑے ہوئے تھے ۔ آخر کو پالا ہمارے ہی ہاتھ رہے گا ۔ مگر یکایک پردۂ غفلت جو آنکھوں سے اُٹھا تو بھور ہوگیا ۔ ان اینگلو انڈین سے خدا سمجھے ۔ عین موسم بہار میں ہمارا آشیانہ نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا ۔ کمبخت "کنکارڈ،، نے منحوس شکل دکھائی ۔ سخن سازوں نے ملکۂ معظمہ کے پروکلیمیشن کے الفاظ میں نئے نئے معنی پہنائے پیارے رہن کو مجبور کیا ۔ وہ بھی برے پھنسے ۔ کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑا ممبران کاونسل کے نقار خانہ میں طوطی کی آواز کسی نے نہ سنی ۔ آخرش وہ بھی انہیں کے ساتھ سر ہلانے لگے ۔

جاکر قفس میں عاشق صیاد ہوگیا
بلبل کا حال قابلِ فریاد ہوگیا

انصاف اُلٹے استرے سے مونڈا گیا ۔ بغاوت نے نقارۂ فتح کڑم دھڑم بجا دیا......... اختیار ملا، مگر برائے نام ۔ جیوری کی بنچ بلا کی طرح پیچھے لگی ۔ مگر ہمت نہ ہارنا چاہیئے ۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو ۔ ہندیو ! دشمنوں سے سبق لو ۔ کچھ کھو کے اب تو سیکھو ۔ دیکھو حقوق کے

لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہی - جس کی لاٹھی اس کی بھینس - اگر ہم بھی گورنمنٹ ہاوس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے ، فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے ، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی جاتا - مگر شر ہمارا شیوا نہیں۔۔۔۔۔۔ہائے! سال بھر کی محنت کھاری کنوئیں میں ڈوب گئی - کیا کیا خیالی قلعے بنائے تھے - مگر ,, کنکارڈ ،، کے ایک ہی گھونسے نے ان کا صفایا کردیا - جن پر ہمیں بھروسا تھا ، جو ہماری خیرخواہی کا دم بھرتے تھے وہی دغا دے گئے - وقت پر نکل کھڑے ہوئے - کاندھا ڈال دیا - گویا ہم بیچو بیچ سمندر میں ایک ٹاپو پر اترے تھے - کھانا پکایا ، دسترخوان بچھایا - جیسے ہی کھانے کو ہاتھ بڑھایا کہ دفعتہً جزیرا ہلنے لگا اور دم کے دم میں سب غڑاپ سے سمندر میں - افوہ ! دھوکا ہوا تھا - وہ جزیرا نہ تھا - وہیل مچھلی کی پشت تھی - خیر

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا !

سجاد حسین کاکوروی

کھلا خط، سربستہ مضامین

بنام ملکۂ وکٹوریا قیصرِ ہند

سکندر حشم دامت ظلہا ! میں نے اپنے پہلے خط میں دوسرے کا وعدہ کیا تھا - اسی جہت سے ، اگرچہ مجھے ساری دنیا کے بکھیڑوں اور تم کو اپنی پارلیمنٹ کے جھگڑوں ، وزرا کے استعفا سے مہلت کم ہی ، مگر ایفائے وعدہ کرتا ہوں -

سب سے پہلے پیش پا افتادہ مضمون وزارت کا ہی - جو کچھ ہوا اور تم نے اور گلیڈسٹن نے کیا وہ تو ہوچکا - اس کا ذکر نہیں - کیا وجہ کہ میری

عادت ہی معاملاتِ گذشتہ کو بجز مورخانہ تجربہ کے اور کسی لائق نہیں سمجھتا۔ تم نے سالسبری کو وزارت دی ۔ اچھا کیا نہ برا ۔ آخر تم بیچاری کرتیں بھی کیا۔ بس یہی اندھوں میں کانے راجا تھے ۔ اب نظرِ تعمق سے ملاحظہ کیجئے تو ایسے فرقوں کا کم زور ہوتے جانا جو قدیم باتوں کا (جن میں شخصی حکومت بھی شامل ہی) حامی ہو بادشاہوں کی ذات، کے واسطے فالِ نیک نہیں۔

لارڈ رنڈاف چرچل جو بد قسمتی سے ہندوستان کے وزیر ہند ہوئے ہیں بجائے خود تیز آدمی ہیں۔ مگر کم سنی اور دُرشت گوئی اور بدزبانی مانعِ ترقی ہی ۔

معاملاتِ ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں اور میری رائے میں تم بھی اس کی ۔ آج تک تمہارے ملک اور پارلیمنٹ میں جس قدر توجہ ہوئی ہی وہ بالکل ناکافی ہی اور لاپرواہی سے مملو۔ یہ سمجھ لو کہ آزادگی اور شوریدگیٔ قوم کی دست برد سے اعزاز قیصری محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہی ۔

بھلا کچھ تو ہی کہ ہر اولوالعزم کو جہاں زمانے نے کسی قدر بھی وسعت دی اس نے اسی طرف کو رخ کیا ۔ ظاہر میں اگرچہ میں یہاں کا باشندہ نہیں مگر دراصل میں ساری دنیا کا رہنے والا ہوں ، ازل سے اس ملک کی خوبیاں مجھ پر اس طرح روشن ہیں جیسے بادشاہوں میں آج کل زارِ روس۔ سکندر نے میرے ہی مشوروں پرکاربند ہوکر ادھر کا قصد کیا تھا ۔ مگر افسوس! اس کی فوج نے وہی ارادے ایک دوسرے عنوان سے برتے جس کے جام سے آج کل تمہاری قوم بدمست ہی اور اس کا نتیجہ جو ہوا اس سے میرا یا سکندر ہی کا دل آگاہ ہی اور تھا ۔ جب تک ہندوستان انگلستان کا ضمیمہ اور دم چھلاّ بنا رہے گا ، وہاں کا ادنا سے ادنا گورا ہندوستان میں دیوتا بن کر جہاز سے اُترے گا تب تک ہندوستان

ہندوستان نہ ہوگا۔ لاکھ رُپی کی بات تم کو یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ ہر شی کی خوبئ ذاتی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہی جب تک اس کی ذات میں فرق نہ آئے۔ آم تب ہی تک آم ہی جب تک املی نہیں بنایا گیا ہی۔ پس اسی طرح ہندوستان اسی وقت تک ہندوستان ہی جب تک ہندوستان کی ذات میں خلل نہیں آتا۔

تہذیب اور ترقی، صدق اور راستی کے جانی دشمن ہیں۔ مگر کیسے؟ جیسے مارِ آستین۔ حکما کہتے ہیں کہ نیکی کو کسی طمع سے عمل میں لانا نیکی نہیں۔ اصل نیکی وہ ہی جو ازخود بِلا ارادہ سرزد ہو۔ پس مہذب دوستی ہرگز طمع اور نمائش کی آلائش سے پاک نہیں ہوتی۔ تم مہذبوں کے لمبے چوڑے عہدنامے، اقرار نامے جنھیں تم اسٹامپ رجسٹری سے آراستہ پیراستہ کرتے ہو بجنسہ اس ہندوستانی سبزہ رنگ، ملیح، دلربا معشوق کی طرح ہیں جو انگریزی صابون سے عارضِ باصفا کو دھوکر آنکھوں کے پپوٹے سیاہ کرڈالتی ہی۔

پس نتیجۂ سخن یہ ہی کہ آج کل کسی کی دوستی اور عہد پر اعتماد نہ کرو۔ عہد نامے چاک کرنے، اقرار توڑنے اور دوستی دشمنی کرنے کے واسطے ہوتی ہی۔ انگریزی مثل ”ٹرسٹ اِن گاڈ اینڈ کیپ یور پاوڈر ڈرائی،، (خدا پر بھروسا رکھو اور اپنی بارود خشک رکھو) پر عمل کرو اور دیکھو جنگ‌گاہِ عالم میں کیا تماشا ہوتا ہی..........

مثل مشہور ہی آپ کاج مہا کاج۔ تمہاری قوم بڑی خود غرض اور خود مطلب ہی۔ تم سے تو چاہتی ہی کہ خدمت لے۔ مگر تمہاری خدمت پر چون و چرا کرتی ہی۔ پس ایک نصیحت آخری تم کو کرتا ہوں۔ اگر اس پر عمل کیا تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔ ورنہ گلیڈ سٹن کی طرح اِس کان سے سنا اُس کان سے اُڑادیا تو تم جانو تمہارا کام جانے۔ اپنے تاج کے نہایت درخشاں اور تاباں

جواہر کو پہلے اس ترتیب سے جدا کرو کہ نہ تو اس فرنگی کی طرح اس کو صدمہ پہنچاو جس نے اورنگ زیب سے دوستی کے واسطے لیا اور کاٹ چھانٹ کر ستیاناس کیا، اور نہ اپنے تاج کو بدنما بناو۔ اس کے بعد ایک جداگانہ تاج بنواو اور اس میں وہ جواہر لگاکر کسی اپنی اولاد کے سر رکھو۔ ہم خوش ہمارا خدا خوش۔ الكناية ابلغ من التصريح

اودھ پنچ (لکھنو)

ہندوستان کا افلاس

ہندوستان کے افلاس اور تباہی کی متواتر خبریں انگلستان میں شہرت پذیر ہوئیں تو بعض رحم دل ممبرانِ پارلیمنٹ کا دل پسیجا اور حکام کی رپورٹوں کو اس کے خلاف دیکھ کر قصد کیا کہ چل کر ایک نظر خود بھی دیکھ لینا ضروز ہی، گویا حکام کہتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت سرسبز ہی۔ ہندوستان کے گدھے کی پیٹھ کا گوشت نوچو جہاں تک ناخنوں میں طاقت ہو۔ یہ گوشت اصلی گوشت نہیں ہی بلکہ بدگوشت ہی۔ اس کا نوچنا مضر نہیں بلکہ انجام کار راحت رساں ہوگا۔ گدھا فربہ ہی۔ اس پر بار بھی لادا جائے اور منزل پر پہنچو تو اسی کا گوشت نوچو۔ اسی کی لید جلاکر اسی کی کھال کی ہانڈی بناکر پکاو اور کھاو۔ یہ دودھ بھی دیتا ہی۔ کباب کھاکر دودھ بھی پیو اور صبح کو بار بھی لادو اور آپ بھی سوار ہوجاو۔ تیز نہ چلے تو ہنٹر سے خبر لو۔ لطف یہ ہی کہ کاٹھ کا گدھا ہی۔ نہ کھانے کی حاجت نہ پینے کی ضرورت۔ اس پر نہ مٹّھا نہ منہ زور۔

جب وہ خود رونق افروز ہوئے تو حکام ان کی باریک بین آنکھوں پر
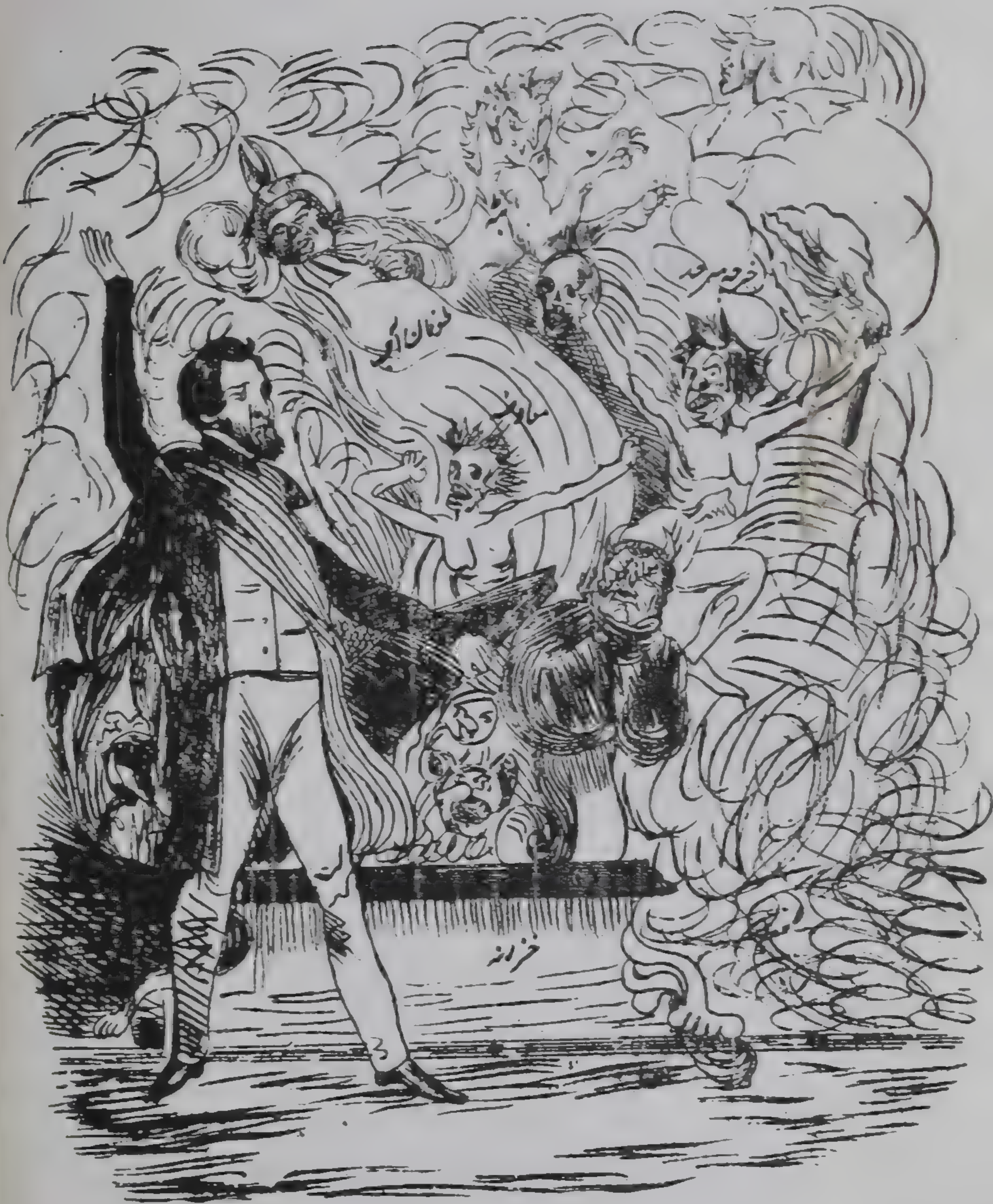
خزانۂ ہندوستان میں مال

پردا نہ ڈال سکے اور جو کچھ دیکھنا تھا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کیا بیان کیا جائے کہ کیا دیکھا۔ خوف کی پھانسی گلے میں پڑی ہو۔ ڈر کے مارے زبان خشک ہی۔

ہر سانس میں آتا ہی مرے منہ کو جگر آج!

سیاحوں نے کاشت کاروں کی بھی حالتِ زار دیکھی۔ دیہات کو بھی گئے۔ ان ٹوٹے ہوئے جھونپڑوں کو بھی دیکھا جن میں ہندوستانی لوگ بسر کرتے ہیں۔ کاشت‌کاروں کے بچوں کو دیکھا جو اگرچہ اپنے ماں باپ کو جان سے زاید عزیز ہیں لیکن افلاس‌گردی کے طفیل میں موٹھ اور باجرے کی سوکھی روٹی کے ٹکڑے روکھے پھیکے کھاتے ہیں اور اسے بھی غنیمت جانتے ہیں اور بے‌شک یہ تو قسمت والوں کی غذا ہی ورنہ کروڑوں آدمی جنگل کی گھاس‌پات کو اُبال‌کر یا خام کھاکر بسر کرتا ہی۔

سیاحوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک مقام پر دو بنگلے ہیں۔ ایک سوداگر کے پاس ہی جس کے وہ پچاس رُپی کرایہ کے دیتا ہی۔ دوسرا کسی حاکم کے قبضہ میں ہی جس کے پانچ رُپی مالک کو ملتے ہیں۔ لیکن دونوں کی حیثیت یکساں ہی۔ اگر کچھ تفرقہ ہی تو کرایہ کے دینے والے کی شان و شکوہ میں ہی۔

ادا اُس کی کہتی ہی میں ہوں مسیحا ٭ قضا سن کے کہتی ہو قاتل یہی ہی

ہندوستان کا حالِ زار آئینہ ہی۔ تیس برس کی مدت میں انگلستان نے کس قدر ترقی کی! انصاف شرط ہی اور حاکمانہ بات کا جواب گدھے کے سر

کے سینگ۔ پانیر[1] وغیرہ کہتے ہیں کہ کاشت کاروں کو پہلے سے تعلیم کردی گئی تھی۔ جھوٹے کے آگے سچا رودیتا ہی۔ سچ کا زمانہ لدگیا۔ سچ بات سعداللہ کہیں سب کے من سے اترے رہیں۔ کیا یہ بھی پہلے سے معلوم تھا کہ کس طرف سے گذر ہوگا؟ کیا گھروں پر چھپّر بھی بدلوائے گئے تھے؟ کیا ہندوستان کے کاشت کاروں کی بھی حالت جناب افلاس الدولہ بہادر کے متواتر حملات نے تباہ نہیں کردی ہی؟

اب وہ زمانہ ختم ہوگیا جس میں ہندوستان کی دردناک آوازیں ہندوستان کے گنبد سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ اب ہندوستان کے حالات چھُپ نہیں سکتے۔ اب تو ہندوستان کی، فاقوں کی کثرت سے یہ نوبت ہی کہ گوشت پوست، رگ پٹھا ندارد۔ صِرف ہڈیوں کا ڈھانچا ہی، وہ بھی خشک جس کا گودا تک کھالیا گیا ہی۔

سیاحانِ موصوف ہندوستان کے بہت سے تبرکات پارلیمنٹ کے عجائب گھر میں رکھنے کے واسطے لے گئے ہیں۔

راقم
ایک مسلمان

---

[1] POINEER انگریزی زبان کا ایک مشہور اخبار لکھنو سے نکلتا ہی۔ برطانوی حکومت کے زمانہ میں یہ اپنی ہندوستان دشمنی کے لئے بدنام تھا۔

سوال از آسمان و جواب از ریسمان

حساب و جبر و مقابلہ

سوال ۱ :— ہندوستانی کھانوں میں سب سے اچھا کون کھانا ہوتا ہی اور انگریزی کھانوں میں کون ؟

جواب :— دو صدی پہلے تو پلاو، قلیا، قورما، فیرنی، متنجن، سنبوسا اور محبوبی وغیرہ وغیرہ عمدہ ہندوستانی کھانے تھے۔ مگر فی الحال کھساری کا ستو نعمتِ غیرمترقبہ شمار کیا جاتا ہی اور وہی دو صدی پہلے جوشاندہ آلو اور جوشاندہ گوشت بغیر نمک کا عمدہ انگریزی کھانا تھا۔ مگر اب رائس، دال، کری، بیف، مٹن، پورک وغیرہ وغیرہ ہیں۔

سوال ۲ :— (الف) ہندوستانی دن میں کتنی دفعہ کھاتے ہیں اور انگریز دن میں کتنی دفعہ اور کون کون وقت کھاتے ہیں ؟

جواب :— امیر ہندوستانی دن میں ایک دفعہ کھاتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ بےچاروں کو میسر ہی نہیں اور غریب بےچارے کبھی دو دن میں اور کبھی تین دن میں ایک مرتبہ کھاتے ہیں۔ انگریز دن بھر میں پانچ دفعہ۔ صبح کو سات بجے چار بسکٹ اور ایک پیالی چائے۔ نو بجے دن کے جس وقت آفس جانے لگتے ہیں کچھ توس اور شوربا اور انڈے۔ پھر دو بجے آفس میں بیرا لے کر پہنچتا ہی۔ اس کو ٹفن کہتے ہیں۔ پھر پانچ بجے شام کو آفس سے آکر۔ اس کے بعد نو بجے شب کے۔ اس کو سپر کہتے ہیں۔ یہ کھانا

کھاکر سو رہتے ہیں۔ پھر نہیں کھاتے۔ بعضوں کا خیال ہی کہ چند بار کھانے ہی کی وجہ سے یہ سب خصوصاً وہ جو ہندوستان میں کچھ دنوں رہ جاتے ہیں توند اور پینڈے کے بھاری ہوجاتے ہیں۔

سوال ۲ :— (ب) کس وقت انگریزوں کا بڑا کھانا ہوتا ہی اور اس کو کیا کہتے ہیں ؟

جواب :— بڑا کھانا روز نہیں ہوتا۔ جب کبھی بنظرِ تفریح یا شکار کرتے ہوئے کسی دیسی ریاست کی طرف نکل جاتے ہیں تو اُس ریاست کے ناعاقبت اندیش خوشامدی کارکن ان کی دعوت کرتے ہیں۔ اسی کو ہم لوگ بڑا کھانا کہتے ہیں اور انگریز ٹی پارٹی کہتے ہیں۔

سوال ۳ :— چٹنیوں میں کون سی چٹنی زیادہ مزہ‌دار ہوتی ہی اور اچاروں میں کون سا اچار ؟

جواب :— چٹنی تو لہسن و مرچ کی مزہ‌دار ہوتی ہی اور اچار کے بارے میں مرحوم نظیر اکبرآبادی لکھ گئے ہیں: کیا زور مزہ‌دار ہی آچار چوہوں کا!

سوال ٤ :— انگریزی کھانوں میں پُڈنگ بنانے کا کیا طریقہ ہی اور ہندوستانی کھانوں میں بریانی پکانے کا کیا عنوان ہی ؟

جواب :— پُڈنگ بنانے کا طریقہ یہ ہی کہ ہندوستان سے گیہوں رُپی من کے حساب سے خریدکر انگلینڈ چلان ہوتا ہی۔ وہاں اس کا مائدا بنتا ہی اور وہاں سے رُپی سیر کے حساب سے یہاں روانہ کیا جاتا ہی۔ اسی مائدے میں گھی اور دودھ اور چینی ملاکر آگ پر چڑھا دیتے ہیں۔ جب تیار ہوجاتا ہی تو اس میں سور کی چربی بجائے گلاب

اور کیوڑے کے ڈالتے ہیں ۔ہاں کرسمس کی ڈالیوں میں جو میوے
اے آتے ہیں وہ بھی اس میں پڑتے ہیں۔ بریانی پکانے کا طریقہ یہ
ہی کہ سیر بھر موٹے چاول کو جو کسی زمانے میں ہاتھی کو
کھلاتے تھے پانی کے ساتھ اُبالتے ہیں۔ پھر دو گٹے پیاز کے
بکریوں کی چربی میں بُھن کر مع چربی اس چاول میں ملا دیتے
ہیں۔ بس بریانی تیار ہوجاتی ہی ۔

تاریخ

سوال ۱ :— خون کے مجرم کو قانون کی کس دفعہ کی رو سے سزا دی جائے گی ؟

جواب :— ہندوستانی کو سزا دینے کے لئے کسی دفعہ کی ضرورت نہیں۔ جب
چاہئے قید کیجئے اور جب چاہئے پھانسی دیجئے۔ مگر کوئی
انگلش نژاد، وفادار رعیت دس ہندوستانی کو بھی مارڈالے تو کچھ
پرواہ نہیں۔

سوال ۲ :— سزائے حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کن کن مجرموں کے لئے مقرر
کی گئی ہی ؟

جواب :— پہلے تو یہ سزا صرف دو تین جرموں کے لئے تھی۔ مگر اب دو
جرم اس میں اور بڑھائے گئے ہیں۔ ایک تو کسی انگریز سے
مقابلہ کے ساتھ باتیں کرنی ، دوسرے گورنمنٹ کی کسی بات پر
نکتہ چینی کرنی۔

الپنچ (پٹنا)

ہم نے افلاک کو سو رنگ بدلتے دیکھا
اپنی قسمت کے نوشتہ کو نہ ٹلتے دیکھا

پیارے الپنچ ! سال کا بدلنا بھی کچھ عجیب و غریب تماشے سے کم نہیں ہے۔ جدھر سنئے اسی کا غل ہے، شور ہے، دھوم ہے، ہنگامہ ہے۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ جدھر دیکھئے ناچ ہے، گانا ہے۔ مگر سُر، تان، تال، لے، لپیٹ، پلٹا، چڑھاو، اُتار وغیرہ وغیرہ سے کچھ بحث نہیں۔ ان کو کہئے تھیٹر کے کندۂ ناتراش ایکٹروں کی طرح آئیں بائیں شائیں گا بجا رہے ہیں۔ اِس کی دُم اُس کے سر میں، اُس کا سر اِس کی دُم میں۔ اشعار کل ناموزوں، بے معنی، بے مطلب، رذئل، خرافات، واہی تباہی الاپ رہے ہیں۔ کوئی یہ تو پوچھے کہ بھئی سال بدلا تو اچھا ہوا۔ خس کم جہان پاک ! مبارک باشد !! پر یہ تو بتاو اتنی خوشیاں کاہے کی ہیں ؟ لوگ کیوں پتلون سے باہر، گون کے اندر ہورہے ہیں ؟ فرض کیا کہ منحوس، کم بخت سال گیا اور نیا آیا جس کی یہ گرماگرم آوبھگت ہے تو پھر یہ کس کو معلوم کہ یہ حضت کیا رنگ لائیں گے۔ سچ پوچھو تو یہ پھیر بدل کی مسرت ہی بے کار ہے۔ نہ ہم بدلے نہ تم بدلے۔ نہ زمین بدلی نہ آسمان بدلا۔ نہ دن بدلا نہ رات بدلی۔ نہ کالے بدلے نہ گورے بدلے۔ اس وقت تک تو بالکل بجنسہ وہی سب باتیں جو تھیں وہ ہیں۔ ہاں خوشی تو جب کرتے کہ سال کے بدلتے اس بےچارے مفلس، آفت زدہ ہندوستان کی قسمت پوری بدل جاتی، ہُن برستا، سارا ملک مالامال ہوجاتا، گورنمنٹ آف انڈیا ٹیکسوں کی بھرمار کے بدلے کچھ اپنے پیارے انگلینڈ سے لاکر یہاں کی غریب رعایا کی دستگیری کرتی یا اُن کی بےچارگی پر ترس کھاکے یہ سب تباہ کن قانونی دفعوں کو بدل ڈالتی تو البتہ ایسی لمبی چوڑی خوشی کا موقع تھا۔

کھلا خط، سربستہ مضامین

بنام [1]-لارڈ لینسڈاون صاحب بالقابہ خطابہ

مائی لارڈ ! آپ تو بہت خوش ہوں گے کہ بااین ہمہ ہیچ کاری و ہیچ میرزی ہندوستان سے جاتے وقت آپ کو بہت سے ایڈرس ملے۔ لوگوں نے شکر گذاری کا اظہار کیا اور آپ کی جدائی کا قلق بھی بہت کچھ بظاہر حال آپ پر جتایا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ آپ کے جاتے وقت ایڈرس اس قدر گراں مایہ اور قابل قدر نہیں رہ گئے ہیں جیسے سابق میں ہوتے تھے.........

ہندوستان میں داخل ہونے سے قبل انگلستان ہی میں آپ نے ایک تقریر فرمائی جس نے ہم لوگوں کو ایک حد تک مطمئن کردیا۔ پھر ورودِ ہندوستان پر پہلے ہی جو تقریریں آپ نے کیں وہ بھی ہمارے واسطے کسی قدر طمانیت بخش تھیں صرف اس بنا پر کہ ان کے ذریعہ سے ہم کو اپنے توقعات وسیع کرنے کی اجازت ہوگئی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ہم لوگوں کو اس بات کا یقین اس وقت تک نہ تھا کہ اس قسم کی تقریریں محض دل خوش کن اور تفریحی ہوتی ہیں جن سے خیالاتِ واقعی کا اظہار منظور نہیں ہوتا اور صرف "تو مرا بسخن خوش کردی من ترا بسخن خوش کردم" پر عمل درآمد کیا جاتا ہے.....

ہم لوگ اپنی جگہ پر خوش تھے کہ شاید اب کچھ دن پھریں۔ مگر خیالی امیدوں کے وہ سبز باغ محض نقش برآب نکلے اور گلہائے رنگا رنگ کا نظرفریب گلدستہ بالکل بے بو باس نکلا۔ آپ ہندوستان پر پانچ برس حکومت کرکے تشریف لے بھی چلے اور ہماری امیدیں یہی کہتی رہ گئیں

[1] لارڈ لینسڈاون ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹٤ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا۔

تم آپ چلے ہم کو کیا کس کے حوالے

آپ نے آتے ہی آتے بجٹ کے پیش ہونے کے وقت یہ اُمید دلائی کہ آئندہ سے بجٹ پر آزادانہ مباحثہ ہوا کرے گا۔ مگر آپ ہی فرمائیے کہ آپ نے کبھی اس وعدہ کے وفا کرنے کا بھی خیال کیا؟

ہم کو آپ سے اگر کچھ شکایت ہے تو یہی کہ اول تو آپ نے سرے سے پیچیدہ معاملات کے حل کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی اور جو کبھی کچھ توجہ بھی کی تو ایسی کہ تسمہ نہ لگا رکھا جس سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!

حیدرآباد میں آندھی پہ آندھی آئی، طوفان پہ طوفان اُٹھا۔ بنے بنائے، سجے سجائے گھر بگڑ گئے۔ سیکڑوں ہونہار اور بارآور پودے، درخت جڑ پیڑ سے نیست و نابود ہوگئے اور آپ نے آنکھ اُٹھاکر بھی نہ دیکھا۔ ایک بار آپ نے گلفشانی کی تو کیا کہ جس سے رہی سہی آبرو پر بھی پانی پھر گیا اور جو نہ ہونا تھا سو ہوا۔ اسی طرح کشمیر کو دیکھئے۔ بے چارہ کب سے تڑپ رہا تھا۔ آپ نے وہ کاری ہاتھ لگایا کہ لگی بھی نہ رہی۔ ہندوستان میں مذہبی بلوا ہوا۔ ایک تلاطم برپا رہا۔ انصاف سے کہئے گا آپ کے خوابِ استراحت میں بھی کبھی کچھ خلل پڑا؟ یارانِ باصفا کے جلسے میں بیٹھ کر بھلا کسی وقت بھی آپ کو اس خوں ریزی کے خیال نے متفکر کیا؟ بنارس، اعظم گڈھ، بریلی، رنگون کے بلوے ایک طرف۔ کلکتہ کی شام بازار کا بلوا اور بمبئی کا بلوا تو ضرور ایسا تھا کہ خاص توجہ کا مستحق تھا۔ مگر آپ کو اتنی فرصت کب تھی کہ آپ اِس طرف متوجہ ہوتے! ....

۳ مارچ ۱۸۹۲ء

لد شانزدہم،

ہ پنچ (لکھنؤ)

طعام می طلبند یا آب ؟

[1] عمر رضامندی کے مسئلہ میں آپ نے بالکل بےالتفاتی عام رائے کی جانب صرف فرمائی جس نے بہت سی امیدوں کو قطع کردیا اور معلوم ہوگیا کہ آپ خود اپنی رائے تو کیا مگر اپنے صلاح‌کاروں کے اشاروں پر چلنا پسند کرتے ہیں اور کسی دوسرے کی بات سننا بھی نہیں چاہتے.........

[2] کابل مشن کی کامیابی پر ضرور ہم آپ‌کو مبارک‌باد دیتے۔ مگر کیا کہیں خزانۂ ہند کی ابتریوں کو دیکھتے جی نہیں چاہتا کہ ایک ساتھ مبارک‌باد بھی دیں اور شکوہ بھی کریں۔ آپ نے کاش اس‌کا خیال کرلیا ہوتا کہ ہندوستان کے دیوالیہ ہونے میں اب کیا کسر رہی ہی جسے آپ ان اخراجات کے ذریعہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے زمانۂ حکومت میں گورنمنٹ آف انڈیا کا کارخانہ اُس پھوہڑ اور بےسلیقہ عورت کا سا رہا ہی جو اپنی ہی بدسلیقگی کے سبب آئے دن بڑبڑاتی اور تہی‌دستی کا شکوہ نوکِ زبان رکھتی ہی۔

[3] توسیعِ کاونسل کی بابت آپ شکریہ کےمستحق ہیں۔ لیکن یاد رکھئے گا کہ ہم کو یہ شکایت بھی ہی کہ آپ‌کی گورنمنٹ نے اپنے حدودِ اختیارات کی وسعت کو بھی ہم لوگوں کے فوائد پر وقف نہیں فرمایا۔

---

[1] Age of Consent Act پہلے دس سال کی عمر تک لڑکیوں کی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس قانون کے ذریعہ بارہ سال کی عمر مقرر ہوئی۔

[2] اس مشن کے ذریعہ ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات خوشگوار ہوگئے۔ لیکن یہ بھی طی پایا کہ امیرِ افغانستان کو بجائے دس لاکھ کے ۱۸ لاکھ کی سالانہ رقم دی جایا کرے گی۔

[3] ۱۸۹۲ء میں اِنڈین کاونسل ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں غیر سرکاری ممبروں کی تعداد بڑھائی گئی۔

چونکہ چلتے وقت آپ نے ہم لوگوں کی نسبت عمدہ خیالات ظاہر کیے ہیں ہم کو اُمید ہی کہ آپ اِن خیالات کی نشو و نما آب و ہوائے وطن میں اچھی طرح کریں گے۔

راقـــــــــــــــم

ہمارے لختِ جگر اُٹھ کے دیکھ لو تم بھی
زمانہ اور ہی یہ رنگ بھی نظر میں رہے

پریم چند

دنیا کا سب سے ان مول رتن

دلفگار ایک پُرخار درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہارہا تھا۔ وہ حسن کی دیوی یعنی ملکۂ دلفریب کا سچا اور جاں باز عاشق تھا......دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تُو میرا سچا عاشق ہی تو جا اور دنیا کی سب سے بیش بہا شی لے کر میرے دربار میں آ۔ تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی......آج تین دن سے یہ ستم رسیدہ شخص اسی پُرخار درخت کے نیچے اسی وحشت ناک میدان میں بیٹھا ہوا سوچ رہا ہی کہ کیا کروں؟ دنیا کی سب سے بیش بہا شی مجھ کو ملے گی، ناممکن، اور وہ ہی کیا؟ قارون کا خزانہ؟ آبِ حیات؟ تاجِ خسرو؟ جامِ جم؟ تختِ طاوس؟ زرِ پرویز؟ نہیں، یہ چیزیں ہرگز نہیں۔ دنیا میں ضرور ان سے بھی گراں تر، ان سے بھی بیش بہا چیزیں موجود ہیں۔ مگر وہ کیا ہیں؟ کہاں ہیں؟ کیسے ملیں گی؟ یا خدا! میری مشکل کیونکر آسان ہوگی؟ دلفگار انھی خیالات میں چکر کھارہا تھا اور عقل کام نہ کرتی تھی........

آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ دلفگار یکایک خدا کا نام لے کر اُٹھا اور ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔ بھوکا پیاسا، برہنہ تن، خستہ و زار۔ وہ برسوں ویرانوں اور آبادیوں کی خاک چھانتا پھرا........ مگر وہ چیز جو دنیا کی سب سے بیش بہا شی تھی نہ میسر ہوئی اور نہ اس کا کچھ نشان ملا۔

ایک روز وہ بھولتا بھٹکتا ایک میدان میں جانکلا جہاں ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ بیچ میں کئی عمامے اور عبا والے ریشائیل قاضی شانِ تحکم سے بیٹھے ہوئے باہم کچھ گُفرفش کررہے تھے اور اس جماعت سے ذرا دور ایک سولی کھڑی تھی۔ دلفگار کچھ تو ناتوانی کے غلبہ سے اور کچھ یہاں کی کیفیت دیکھنے کے ارادے سے ٹھٹک گیا۔ کیا دیکھتا ہی کہ کئی برقنداز ایک دست و پا بہ زنجیر آدمی کو لئے چلے آرہے ہیں۔ سولی کے قریب پہنچ کر سب سپاہی رک گئے اور قیدی کی ہتھکڑیاں، بیڑیاں سب اُتارلی گئیں۔ اِس بدقسمت شخص کا دامن صدہا بےگناہوں کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہورہا تھا اور اِس کا دل نیکی کے خیال اور رحم کی آواز سے مطلق مانوس نہ تھا۔ اسے کالا چور کہتے تھے۔ سپاہیوں نے اسے سولی کے تختے پر کھڑا کردیا۔ موت کی پھانسی اس کی گردن میں ڈال دی اور جلاّدوں نے تختہ کھینچنے کا اِرادہ کیا کہ بدقسمت مجرم چیخ کر بولا ”اللہ! مجھے ایک دم کے لئے پھانسی سے اُتاردو تاکہ اپنے دل کی آخری آرزو نکال لوں۔ یہ سنتے ہی چاروں طرف سناٹا چھاگیا۔ لوگ حیرت میں آ آکر تاکنے لگے۔ قاضیوں نے ایک مرنے والے شخص کی آخری استدعا کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا اور بدنصیب، سیہ‌کار کالا چور ذرا دیر کے لئے پھانسی سے اُتار لیا گیا۔

اسی مجمع میں ایک خوب‌صورت بھولا بھالا لڑکا ایک چھڑی پر سوار ہوکر اپنے پیروں پر اُچھل اُچھل کر فرضی گھوڑا دوڑارہا تھا اور اپنے

عالمِ سادگی میں ایسا مگن تھا گویا وہ واقعی کسی عربی زہوار کا شہسوار ہی۔ اس کا چہرا اس سچی مسرت سے کنول کی طرح کھلا ہوا تھا جو چند دنوں کے لئے بچپن ہی میں حاصل ہوتی ہی اور جس کی یاد ہم کو مرتے دم تک نہیں بھولتی۔ اس کا سینا ابھی تک معصیت کے گرد و غبار سے بے لوث تھا اور معصومیت اسے اپنی گود میں کھلا رہی تھی۔

بدقسمت کالا چور پھانسی سے اُترا۔ ہزاروں آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس لڑکے کے پاس آیا اور اسے گود میں اٹھاکر پیار کرنے لگا۔ اسے اس وقت وہ زمانہ یاد آیا جب وہ خود ایسا ہی بھولابھالا، ایسا ہی خوش و خرّم اور آلائشاتِ دُنیوی سے ایسا ہی پاک و صاف تھا۔ ماں گودیوں میں کھلاتی تھی۔ باپ بلائیں لیتا تھا اور سارا کُنبا جانیں وار کرتا تھا۔ آہ! کالے چور کے دل پر اس وقت ایام گذشتہ کی یاد کا اتنا اثر ہوا کہ ان آنکھوں سے جنھوں نے نیم بسمل لاشوں کو تڑپتے دیکھا اور نہ جھپکی تھیں آنسو کا ایک قطرا ٹپک پڑا۔ دلفگار نے لپک کر اُس دُریکتا کو ہاتھ میں لے لیا اور اس کے دل نے کہا بےشک! یہ شی دنیا کی سب سے انمول چیز ہی جس پر تختِ طاوس اور جامِ جم اور آبِ حیات اور زر پرویز سب تصدق ہیں۔

اس خیال سے خوش ہوتا، کامیابی کی اُمید میں سرمست دلفگار اپنی معشوقہ دلفریب کے شہر مینوسواد کو چلا.........آخر کوہ و دریا طی کرکے وہ شہر مینوسواد میں آپہنچا اور دلفریب کے درِ دولت پر جاکر التماس کی کہ خستہ و زار دلفگار بفضل خدا تعمیلِ ارشاد کرکے آیا ہی اور شرفِ قدمبوسی چاہتا ہی۔ دلفریب نے فی الفور حضور میں بلا بھیجا اور ایک زرنگار اوٹ سے فرمائش کی کہ وہ ہدیۂ بیش‌بہا پیش کرو۔ دلفگار نے ایک عجیب امید و بیم کے عالم میں وہ قطرا پیش کیا اور اس کی ساری کیفیت نہایت موثر

لہجہ میں بیان کی۔ دلفریب نے کل روداد بغور سنی اور تحفہ ہاتھ میں لے کر ذرا دیر تک غور کرکے بولی ”دلفگار! بےشک تو نے دنیا کی ایک بیش قیمت چیز ڈھونڈھ نکالی۔ تیری ہمت کو آفرین! اور تیری فراست کو مرحبا!! مگر یہ دنیا کی سب سے بیش‌قیمت چیز نہیں۔ اس لئے تو یہاں سے جا اور پھر کوشش کر۔ شاید اب کی تیرے ہاتھ دُرِ مقصود لگے اور تیری قسمت میں میری غلامی لکھی ہو۔۔۔۔ کچھ دیر تو دلفگار آنسو بہاتا رہا۔ بعد ازآں سوچنے لگا کہ اب کہاں جاوں؟ مدتوں کی رہ‌نوردی و بادیہ‌پیمائی کے بعد یہ قطرۂ اشک ملا تھا۔ اب ایسی کون سی چیز ہی جس کی قیمت اس دُرآبدار سے زائد ہو۔۔۔۔۔۔۔۔

دلفگار نے پورب سے پچھم تک اور اُتر سے دکھن تک کتنے ہی دیاروں کی خاک چھانی۔ کبھی برفستانی چوٹیوں پر سویا۔ کبھی ہول‌ناک وادیوں میں بھٹکتا پھرا۔ مگر جس چیز کی دُھن تھی وہ نہ ملی، یہاں تک کہ اس کا جسم ایک تودۂ استخواں ہوگیا۔

ایک روز شام کے وقت وہ کسی دریا کے کنارے خستہ حال پڑا ہوا تھا۔ نشۂ بےخودی سے چونکا تو کیا دیکھتا ہی کہ صندل کی ایک چِتا بنی ہوئی ہی اور اس پر ایک نازنین سولھوں سنگار کئے بیٹھی ہوئی ہی۔ اس کے زانو پر اس کے پیارے شوہر کی لاش ہی۔ ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے ہیں اور پھولوں کی برکھا کررہے ہیں۔ یکایک چتا میں خودبخود ایک شعلہ اُٹھا۔ ستی کا چہرا اس وقت ایک پاک جذبہ سے منور ہورہا تھا۔ مبارک شعلے اس کے گلے میں لپٹ گئے اور دم زدن میں وہ پھول سا جسم تودۂ خاکستر ہوگیا۔ معشوق نے اپنے تئیں عاشق پر نثار کردیا اور دو فدائیوں کی سچی، لافانی اور پاک محبت کا آخری جلوہ نگاہِ ظاہر سے پنہاں ہوگیا۔ جب سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تو دلفگار چپکے سے اُٹھا اور اپنے گریبانِ چاک میں یہ تودۂ خاک سمیٹ

لیا اور اس مشتِ خاک کو دنیا کی سب سے گراں بہا چیز سمجھتا ہوا کامرانی کے نشہ میں مخمور کوچۂ یار کی طرف چلا۔ اب کی جوں جوں وہ منزلِ مقصود کے قریب آتا تھا اس کی ہمتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ کوئی اس کے دل میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا، اب کی تیری فتح ہی، ....آخر وہ شہر مینوسواد میں داخل ہوا اور دلفریب کے آستانِ رفعت نشان پر جاکر خبر دی کہ دلفگار سرخرو اور باوقار لوٹا ہی اور حضوری میں باریاب ہوا چاہتا ہی۔ دلفریب نے عاشقِ جاں باز کو فوراً دربار میں بلایا اور اُس چیز کے لئے جو دنیا کی سب سے بیش بہا جنس تھی ہاتھ پھیلادیا۔ دلفگار نے وہ مشتِ خاک اس میں رکھ کر اس کی ساری کیفیت نہایت دل سوز الفاظ میں کہہ سنائی اور معشوقۂ دل پذیر کے نازک لبوں سے اپنی قسمت کا مبارک اور جاں فزا فیصلہ سننے کے لئے منتظر ہو بیٹھا۔ دلفریب نے اس مشتِ خاک کو آنکھوں سے لگایا۔ کچھ دیر تک دریاے تفکر میں غرق رہنے کے بعد بولی "اے عاشقِ جاں نثار دلفگار! بے شک یہ خاکِ کیمیا صفت جو تو لایا ہی دنیا کی ایک نہایت بیش قیمت چیز ہی اور میں تیری صدقِ دل سے ممنون ہوں کہ تو نے ایسا بیش بہا تحفہ مجھے پیش کیا۔ مگر دنیا میں اس سے بھی زیادہ گراں قدر کوئی چیز ہی۔ جا، اسے تلاش کر اور تب میرے پاس آ۔ میں تہِ دل سے دعا کرتی ہوں کہ خدا تجھے کامیاب کرے.........

مدتوں تک پُرخار جنگلوں، شرربار ریگستانوں، دشوار گذار وادیوں اور ناقابلِ عبور پہاڑوں کو طی کرنے کے بعد دلفگار ہند کی پاک سرزمین میں داخل ہوا.......شام ہوتے ہوتے وہ ایک کفِ دست میدان میں پہنچا جہاں بے شمار نیم کشتہ و نیم جاں لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ زاغ و زغن اور وحشی درندوں کی گرم بازاری تھی اور سارا میدان خون سے شنگرف ہورہا تھا۔ یہ ہیبت ناک نظارا دیکھتے ہی دلفگار کا جی دہل گیا۔ "خدایا! کس عذاب میں

جان پھنسی۔،، مرنے والوں کا کراہنا، سسکنا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینا، درندوں کا ہڈیوں کو نوچنا اور گوشت کے لوتھڑوں کو لے بھاگنا، ایسا ہول ناک سین دلفگار نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا، یہ میدانِ کارزار ہی اور یہ لاشیں سورما سپاہیوں کی ہیں۔ اتنے میں قریب سے کراہنے کی آواز آئی۔ دلفگار اس طرف پھرا تو دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شخص جس کا مردانہ چہرا ضعفِ جاں کنی سے زرد ہوگیا ہی زمین پر سرنگوں پڑا ہوا ہی۔ سینے سے خون کا فوارا جاری ہی۔ مگر شمشیرِ آب دار کا قبضہ پنجے سے الگ نہیں ہوا۔ دلفگار نے ایک چیتھڑا لے کر اس کے دہانِ زخم پر رکھ دیا تاکہ خون رک جائے اور بولا ،،ای جواں مرد! تو کون ہی؟،، جواں مرد نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجہ میں بولا ،، کیا تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟ کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لختِ جگر ہوں۔،، یہ کہتے کہتے اس کے تیوروں پر بل پڑگئے۔ زرد چہرا خشمگیں ہوگیا اور شمشیرِ آب دار پھر اپنا جوہر دکھانے کے لئے چمک اٹھی۔ دلفگار سمجھ گیا کہ یہ اس وقت مجھے دشمن خیال کررہا ہی۔ ملائمت سے بولا ،،جواں مرد! میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ ایک آوارۂ وطن، غربت زدہ مسافر ہوں۔ ادھر بھولتا بھٹکتا آنکلا۔ براہ کرم مجھ سے یہاں کی مفصل کیفیت بیان کر۔،، یہ سنتے ہی زخمی سپاہی نہایت شیریں لہجہ میں بولا ،، اگر تو مسافر ہی تو آ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا کیوں کہ یہی دو انگل زمین ہی جو میرے پاس باقی رہ گئی ہی اور جو سوائے موت کے کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔ افسوس ہی کہ تو یہاں ایسے وقت آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتادیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لئے کیسی بےجگری سے جان دیتا ہی۔ یہ آس پاس جو تو لاشیں دیکھ رہا ہی

یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں۔ (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقے میں نہیں مر رہا ہوں۔ (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا؟ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لئے زندہ رہوں؟ نہیں، ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔"

جواں مرد کی آواز مدھم ہوگئی۔ اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ خون اس کثرت سے بہا کہ اب خودبخود بند ہوگیا۔ رہ رہ کر ایک آدھ قطرہ ٹپک پڑتا تھا۔ آخر کار سارا جسم بے دم ہوگیا۔ قلب کی حرکت بند ہوگئی اور آنکھیں مُند گئیں۔ دلفگار نے سمجھا اب کام تمام ہوگیا کہ مرنے والے نے آہستہ سے کہا "بھارت ماتا کی جے!" اور اس کے سینے سے آخری قطرۂ خون نکل پڑا۔ ایک سچے محب وطن اور دیس بھگت نے حب الوطنی کا حق ادا کردیا۔ دلفگار اس نظارے سے بے حد متاثر ہوا اور اس کے دل نے کہا، بے شک! دنیا میں اس قطرۂ خون سے بیش قیمت شے نہیں ہوسکتی۔ اس نے فوراً اس رشکِ لعلِ رمانی کو ہاتھ میں لے لیا اور اس دلیر راجپوت کی بسالت پر عش عش کرتا ہوا عازمِ وطن ہوا اور وہی سختیاں جھیلتا ہوا بالآخر ایک مدت دراز میں ملکۂ اقلیم خوبی اور دُرِ صدفِ محبوبی کے درِ دولت پر جاپہنچا اور پیغام دیا کہ دلفگار سرخرو و کامگار لوٹا ہے اور دربارِ گہربار میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے اسے فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا۔ خود حسبِ معمول پردۂ زرنگار کے پس پشت بیٹھی اور بولی "دلفگار! اب کی تو بہت دنوں بعد واپس آیا ہے۔ لا! دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز کہاں ہے؟" دلفگار نے پنجۂ حنائی کا بوسہ لے کر وہ قطرۂ خون اس پر رکھ دیا اور اس کی مشرح کیفیت پُرجوش لہجہ میں سنائی۔ وہ خاموش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یکایک

پردۂ زرنگار ہٹ گیا اور دلفگار کے روبرو ایک دربارِ حسن آراستہ نظر آیا۔ دلفریب بصد شانِ رعنائی مسندِ زریں کار پر جلوہ افروز تھی۔ دلفگار یہ طلسمِ حسن دیکھ کر متحیر ہو گیا اور نقشِ دیوار کی طرح سکتہ میں آگیا کہ دلفریب مسند سے اُٹھی اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہو گئی۔ رقاصانِ دل نواز نے شادیانے گانے شروع کیے۔ حاشیہ نشینانِ دربار نے دلفگار کو نذریں گذرانیں اور ماہ و خورشید کو بہ عزتِ تمام مسند پر بٹھادیا۔ جب نغمۂ دل پذیر بند ہوا تو دلفریب کھڑی ہو گئی اور دست بستہ ہو کر دلفگار سے بولی "ای عاشقِ جاں نثار دلفگار! میری دعائیں تیر بہدف ہوئیں اور خدا نے میری سن لی اور تجھے کام یاب و سرخرو کیا۔ آج سے تو میرا آقا ہو اور میں تیری کنیزِ ناچیز۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک مُرصع صندوقچہ منگایا اور اس میں سے ایک لوح نکالا جس پر آبِ زر سے لکھا ہوا تھا:—

"وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے
دنیا کی سب سے بیش قیمت شو ہو۔"

حالی

آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا حاصل ہو آزادی جنہیں
قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم

ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اُتنی ہی کم

عافیت کی قدر ہوتی ہو مصیبت میں سوا
بے نوا کو ہو زیادہ قدرِ دنیا و درم

تعرف الاشیاء بالاضداد ہو قولِ حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم

سن کے اک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا
ہو سقر موری کے کیڑے کے لئے باغ ارم

حالی

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں آزاد ہوجاتا ہی جب لیتا ہی سانس
یاں غلام آکر، کرامت ہی یہ انگلستان کی

اس کی سرحد میں غلاموں نے جوں ہی رکھا قدم
اور کٹ کر پاوں سے اک ایک بیڑی گر پڑی

قلبِ ماہیت میں انگلستان ہی گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلبِ ماہیت میں ہندستان بھی

آن کر آزاد یاں، آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہوکر غلام اس کی ہوا جن کو لگی

حالی

قانون

کہتے ہیں ہر فرد انساں پر ہی فرض ماننا قانون کا بعد از خدا
پر جو سچ پوچھو، نہیں قانون میں جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا
اس میں پھنس جاتے ہیں جو کم زور ہیں اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست وپا
پر اسے دیتے ہیں توڑ اک آن میں جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
حق میں کم زوروں کے ہی قانون وہ اور نظر میں زور مندوں کی ہی لا
(Law)

اکبر الہ آبادی (اکبر حسین)

برٹش راج

بہت ہی عمدہ ہی ای ہمنشین! برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہی

جو چاہیے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل بیچ میں ہو، ڈھیلی اسکی چول بھی ہی

نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے
تمہاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہی

جگہ بھی ملتی ہی کاونسل میں آنریبل کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہی

طرح طرح کے بنالو لباس رنگا رنگ
علاوہ روئی کے ریشم بھی ہی اور اُول بھی ہی

چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ آنکھ محو ہی، خاطر اگر ملول بھی ہی

اندھیری رات میں جنگل میں ہی عیاں انجن
کہ جس کو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہی

شگفتہ پارک ہیں ہر طرف رہرواں کے لئے
نظر نواز ہی پتی، حسین پھول بھی ہی

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
توحرج ہی کیا ہی جوساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہی

اکبر الہ آبادی

جلوۂ دربارِ دہلی[1]

سر میں شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا

جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا

سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا
حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

---

[1] یہ دربار یکم جنوری ۱۹۰۱ء کو اڈورڈ ہفتم کے جشنِ تاج پوشی کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ جشن میں خود اڈورڈ نے شرکت نہیں کی تھی بلکہ ڈیوک آف کناٹ اس کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ لارڈ کرزن اس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا۔

خیموں کا اک جنگل دیکھا
برمھا اور ورنگل دیکھا

اس جنگل میں منگل دیکھا
عزت‌خواہوں کا دنگل دیکھا

کچھ چہروں پر مردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی

کچھ چہروں پر زردی دیکھی
دل نے جو حالت کردی، دیکھی

اچھے اچھوں کو بھنکا دیکھا
منھ کو اگرچہ لٹکا دیکھا

بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
دل دربار سے اٹکا دیکھا

سرخی مڑک پر کٹتی دیکھی
آتش‌بازی چھٹتی دیکھی

سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
مفت کی دولت لٹتی دیکھی

ایک کا حصہ منّ و سلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا

ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
میرا حصہ دور کا جلوا

اوج برٹش راج کا دیکھا
رنگِ زمانہ آج کا دیکھا

پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر
حکمت و دانش اُن کے اندر

تحت میں ان کے بیسوں بندر
اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوجِ بخت ملاقی اُن کا
محفل ان کی، ساقی اُن کا

چرخِ ہفت طباقی اُن کا
آنکھیں میری، باقی اُن کا

۱- دربارِ دہلی[1]

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار
حکمِ حاکم سے ہوا تھا اجتماعِ انتشار

آدمی اور جانور اور گھر مزین اور مشین
پھول اور سبزا، چمک اور روشنی، ریل اور تار

کیروسین اور برق اور پٹرولیم اور تارپین
موٹر، ایروپلین اور جمگھٹے اور اقتدار

مشرقی پتلوں میں تھی خدمتگزاری کی امنگ
مغربی شکلوں سے شانِ خودپسندی آشکار

شوکت و اقبال کے مرکز حضورِ امپرر
زینت و دولت کی دیوی امپرس عالی تبار

بحرِ ہستی لے رہا تھا بے دریغ انگڑائیاں
ٹیمز کی امواج جمنا سے ہوئی تھیں ہم کنار

انقلابِ دہر کے رنگین نقشے پیش تھے
تھی پئے اہلِ بصیرت باغِ عبرت میں بہار

ذرے ویرانوں سے اُٹھے تھے تماشا دیکھنے
چشمِ حیرت بن گئی تھی گردشِ لیل و نہار

مصلحت آمیز ہر طرز و طریقِ انتظام
حکمت آگیں ہر ادائے حاکمانِ نامدار

جامے سے باہر نگاہِ نازِ فاتحانِ ہند
حدِ قانونی کے اندر آنرابلوں کی قطار

خرچ کا ٹوٹل دلوں میں چٹکیاں لیتا ہوا
فکرِ ذاتی میں خیالِ قوم غائب فی المزار

دعوتیں، انعام، اسپیچیں، قواعد، فوج، کمپ
عزتیں، خوشیاں، امیدیں، احتیاطیں، اعتبار

پیش رو شاہی تھی، پھر ہز ہائنس، پھر اہلِ جاہ
بعد اسکے شیخ صاحب اُنکے پیچھے خاکسار

---

[1] یہ دربار ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کے جشنِ تاج پوشی کے موقع پر ہوا تھا جس میں خود جارج اور اس کی ملکہ میری نے شرکت کی تھی۔

تصویرِ درد

نہیں منت‌کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہی بے زبانی ہی زباں میری

یہ دستور زباں بندی ہی کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہی زباں میری

ٹپک ای شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہی داستاں میری

الہی پھر مزا کیا ہی یہاں دنیا میں رہنے کا
حیات جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

مرا رونا نہیں رونا ہی یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں کہ ہر اک گل کی ہی گویا خزاں میری

۲

رلاتا ہی ترا نظارا ای ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت‌خیز ہی تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نشان برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا باغ میں گل‌چیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہی
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہی، ہونے والا ہی
دھرا کیا ہی بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاوگے ای ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

۳

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہی مجھے ہر شمع دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں کو چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ہی ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہی تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

٤

ترا نظارا ہی ای بوالہوس! مقصد نہیں اس کا
بنایا ہی کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو

شجر ہی فرقہ آرائی، تعصب ہی ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہی کہ جنت سے نکلواتا ہی آدم کو

پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کرلیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

۵

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہی
یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہی

محبت ہی وہ منزل ہی کہ منزل بھی ہی صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہی

مرض کہتے ہیں سب اس کو یہ ہی لیکن مرض ایسا
چھپا اس میں علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہی

اُجاڑا ہی تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہی؟

سکوت آمیز طولِ داستانِ درد ہی ورنہ
زباں بھی ہی ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہی

اقبال

آزاد اور محکوم

آزاد کی اک آن ہی محکوم کا اک سال   کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت   محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور   محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا   ہی بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

اقبال

آزاد اور محکوم

آزاد کی رگ سخت ہی مانند رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہی مانند رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پُرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن، نفس گرم
محکوم کا سرمایۂ فقط دیدۂ نم ناک
محکوم ہی بیگانۂ اِخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہو چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہم دوش
وہ بندۂ افلاک ہی، یہ خواجۂ افلاک

اقبال

مکروفنِ خواجگی

موت ہی سخت تر جس کا غلامی ہی نام
مکروفنِ خواجگی کاش سمجھتا غلام!
شرعِ ملوکانہ میں جدتِ احکام دیکھ
صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام
ای کہ غلامی سے ہو روح تری مضمحل
سینۂ بےسوز میں ڈھونڈھ خودی کا مقام

اقبال

بیدردئ ایام

آج وہ کشمیر ہی محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہی آہِ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہی جب مرعوبِ سلطان وامیر
کہہ رہا ہی داستاں بیدردئ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تردماغ
ہی کہاں روزِ مکافات؟ ای خدائے دارو گیر!

الہام اور آزادی

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام ہو اُس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہو ایسی ہوجاتی ہو خاکِ چمنستاں شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہو بلبل میں نمودار کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز
اس مردِ خودآگاہ و خدامست کی صحبت دیتی ہو گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے غارت گرِ اقوام ہو وہ صورتِ چنگیز

جوش ملیح آبادی (شبیر حسن خاں)

ندائے آسمانی

سنو ای ساکنانِ خاکِ پستی
ندا کیا آرہی ہو آسماں سے

کہ آزادی کا ایک لمحہ ہو بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

---

٢ ۔ سیاسی بیداری کا آغاز

[ہندوستان میں قومیت کا احساس انیسویں صدی کے آخری حصہ میں پیدا ہوچکا تھا، لیکن سیاسی بیداری کا آغاز حقیقتاً ۱۹۰۵ء سے ہوا۔ ایک طرف لوگ طاعون، قحط، گرانی، صنعت و حرفت کی کمی اور ٹیکسوں کی بھرمار سے پریشان تھے اور دوسری طرف حکومت کانگرس کے مطالبات سے برابر بے توجہی برتتی رہی۔ اس لئے ملک میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جس نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے عملی کارروائی پر زور دینا شروع کیا۔ بال گنگادھر تلک، لالا لاجپت رائے، چندرپال اور اربندو گھوش اس جماعت کے لیڈر تھے۔ دوسری جماعت اس بات کی حامی تھی کہ باضابطہ طور پر اپنے مطالبات کو منوایا جائے۔ اس کے رہنما دادابھائی نوروز جی، سریندر ناتھ بینرجی، گوپال کرشن گوکھلے اور بدرالدین طیب جی تھے۔ دونوں جماعتیں رائے عامہ کو متاثر کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگرس میں ایک نئی روح پیدا ہوئی اور ۱۹۰۶ء کے اجلاس (کلکتا) میں حکومت سے سوراج کا مطالبہ کیا گیا اور بدیسی چیزوں کے بائیکاٹ اور قومی نظامِ تعلیم کی تجویزیں پاس ہوئیں۔ ۱۹۰۷ء میں نئی پارٹی کانگرس سے الگ ہوگئی اور اس کے مطالبات میں اور زیادہ شدت پیدا ہوگئی۔ اسی سال دہشت انگیز انقلابیوں کی بھی ایک جماعت وجود میں آئی جو یورپ کے انارکسٹوں کے اصول کی پیرو تھی۔ لیکن یہ تحریک صرف بنگال تک محدود رہی۔

مسلمان بحثیت مجموعی اب تک سیاست سے دور رہے تھے، لیکن اب وہ بھی سیاسی معاملات سے دلچسپی لینے لگے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی جس کے مختلف مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ تمام ہندوستانی مل کر ملک کی بھلائی اور ترقی کے لئے کوشش کریں۔ مسلمانوں میں انگریز دشمنی کا جذبہ اُس وقت اور تیز ہوگیا جب انگریزوں نے ترکوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کیں۔]

حسرت موہانی (سید فضل الحسن)

مسلمان، نیشنل کانگرس اور پولیٹکل ایجیٹیشن

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں جب کہ تعلیم یافتہ مسلمانانِ بمبئی اور مدراس کی طرح شمالی ہندوستان کے مسلمان بھی کانگرس سے ہمدردی کا عملی اور علانیہ اظہار کرنے لگیں گے۔

ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ اس زمانہ میں بھی کانگرس کی شرکت کو مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے ہیں ان کے پاس سوا اس کے اور کوئی دلیل نہیں ہی کہ ''ہم سرسید کی پالیسی کے پیرو ہیں۔''

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سرسید اپنے زمانے میں قوم کے مسلمہ رہنما تھے۔ اس وقت مسلمانوں کے حق میں انہوں نے جو کچھ کیا بہتر کیا۔ اگر انہوں نے مسلمانوں کو کانگرس سے علاحدہ رہنے کی نصیحت اس بنا پر کی کہ غدر کے بعد سرکار انگلشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور ان کو بغاوت کا ملزم سمجھتی تھی تو بہت خوب کیا۔ اگر اُنہوں نے مسلمانوں کی توجہ کو تمام معاملاتِ ملکی سے علاحدہ کرکے صرف اعلا تعلیم کی جانب مائل کردیا تو اور بھی خوب کیا۔ لیکن ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانہ کی اب تک وہی حالت ہی جو سرسید کے وقت میں تھی؟ کیا سرکار انگریزی کو اب بھی کسی متنفس پر بغاوت کا شبہ ہی؟ ہم پھر سوال کرتے ہیں کہ آیا اب بھی ہم کو اس نصیحت پر بلا چون و چرا عمل کرنا چاہئے کہ گورنمنٹ کی عنایت ہمارے لئے کافی ہی؟ اور بفرضِ محال گورنمنٹ نے عنایت کی بھی تو آیا یہ مہربانی اس کی ہمارے حق میں مفید بھی ہوگی؟

ہمارے نزدیک اس نصیحت سے بڑھ کر مضر دوسری کوئی نصیحت

نہیں ہوسکتی۔ ممکن ہو کہ سرسید کے زمانے میں کسی مصلحت سے گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ رعایت کرتی ہو لیکن اب کہ بارہا مسلمانوں نے رعایت کی درخواست کرکے دیکھ لیا ہو کہ انگریز مروت و لحاظ کی وجہ سے کسی کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا عادی نہیں ہو۔ وہ ان کی اس ذلیل درخواست کو ملامت کے ساتھ رد کردیتا ہی اور جواب دیتا ہو کہ لیاقت پیدا کرو۔ اس پر بھی مسلمانوں کا اس غفلت اُمید میں پڑا رہنا صد ہزار افسوس کے لائق ہو.........

سب سے بڑا اعتراض شرکتِ کانگرس کے متعلق یہ پیش کیا جاتا ہو کہ ہم ابھی دیگر اقوام ہند کے برابر تعلیم یافتہ نہیں ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ برابری کی شرکت ہم سے نبھ نہ سکے گی اور اس لئے ہم کو ابھی صرف تعلیم کی جانب متوجہ رہنا چاہئے۔ جب اس میں کمال ہوجائے گا تب ملکی معاملات میں بھی دخل دیں گے۔

اس کا جواب کسی قدر ہمارے دوست شیخ عبد اللہ صاحب بی۔اے، اِل اِل۔بی نے اردوے معلا کے کسی گذشتہ نمبر میں دیا تھا کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ علمی ترقی کے ساتھ سوشل اور پولیٹکل حالت میں بھی ترقی نہ کرے۔

بعض لوگ یہ بھی شبہ کرتے ہیں کہ اگر مسلمان کانگرس میں شریک بھی ہوئے تو یہ اس کے جزوضعیف ہوں گے اور اس لئے نقصان میں رہیں گے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ کسی گروہ کی طاقت کا دارومدار تمام تر اس کی تعداد پر ہی نہیں ہوتا۔ دیکھو کہ کانگرس میں پارسیوں کا زور کس قدر ہو اور پھر یہ بھی دیکھو کہ ان کی آبادی ہندوستان میں کس قدر ہو۔

اصل یہ ہی کہ قوت اصل میں قابلیت اور کوشش و جھد کی ہو نہ کہ تعداد کی۔ ہم مانتے ہیں کہ کچھ دنوں تک مسلمانوں کی آواز کانگرس میں ضرور کم‌زور رہے گی، لیکن اگر ہم‌کو انتہا تک پہنچنا ہی تو بغیر ابتدا کے چارا نہیں ہی۔ ہم‌کو چاہئے کہ کچھ دن اس مجمعِ بزرگ میں رہ‌کر وہاں کی راہ و رسم سے واقفیت حاصل کریں۔ اپنی قوم میں تقریر کرنے والے اور پالیٹکس سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد کو بڑھانے کی فکر کریں۔ پھر ہر ملکی معاملہ میں شریک ہوکر اور کوشش کرکے اپنی آواز کو طاقت‌دار بنائیں۔ صرف آرزو سے کوئی کام نہیں ہوسکتا جب تک اس آرزو کا نتیجہ ہمت اور کوشش اور استقلال نہ ہو.......

یہ صحیح ہی کہ بعض اخبار اعلا درجہ کے نہیں ہیں۔ لیکن بمقابلۂ سابق آج وہ ملک کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ آپ کانگرس میں جو تجویزیں منظور کرتے ہیں وہ ہمارے تعلیم یافتہ گروہ تک پہنچتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح اخبار کے کالموں میں حکام اور رعایا تک ہروقت پہنچائی جاتی ہیں۔

پولیٹکل ایجیٹیشن کا کام جو کانگرس نے اختیار کیا ہی اسے اس طرح پر اخبار برابر انجام دے رہے ہیں اور اخباروں کی اس سرگرمی کا فخر کانگرس کو حاصل ہی۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ملک کے مختلف صوبے پہلے کی بہ نسبت اب زیادہ متحد نظر آتے ہیں۔ ہم سب ایک ہی قسم کے قومی جذبوں سے جوش میں آتے ہیں۔ ایک ہی کامیابی سے پُرجوش ہوتے ہیں اور ایک ہی ناکامی پر مایوس ہوجاتے ہیں۔ ایک ہی قسم کی اُمیدوں میں شریک ہوتے ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ کو کبھی خیالِ قومیت کی ترقی کا احساس ہوا ہی تو

وہ بھی آزمائش ہی۔ ان تمام امور کا فخر آج کانگرس کو حاصل ہی۔

گذشتہ ۱۶،۱۵ سال کے عرصہ میں ان باتوں کو جن معمولی کوششوں کے ذریعہ سے ہم نے حاصل کیا ہی اس کے دیکھتے ہوئے کسی کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہی..... بہت سی باتوں میں ایجیٹیشن سے بہت فائدہ پہنچا۔ مثلاً رپورٹ یونیورسٹی کمیشن کی بہت سی دفعیں نرم کردی گئیں۔ افیشیل سیکرٹ بل کی سختی بھی کسی قدر کم کردی گئی اور اس سے قبل جنوبی افریقا کی فوجوں کا خرچ ہندوستان کے ذمہ نہ رہا یا ملک معظم کے دربار تاج پوشی کے زمانہ میں مہمانان ہند کا خرچ سفر و قیام ہندوستان کو نہ دینا پڑا وغیرہ۔

لیکن ان سب کامیابیوں کے باوجود بہت سے لوگ پھر بھی گرداب مایوسی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

غرض کہ خلاصۂ کلام یہ قرار پایا کہ لوگوں کا یہ شبہ کہ کانگرس ایک محض بے سود مجمع ہی بالکل غلط ہی۔ نیز بعض لوگوں کا یہ خیال کہ پولٹیکل ایجیٹیشن سے کوئی فائدہ نہیں، حقیقت سے بہت دور ہی۔

لالا لاجپت رائے

ہماری موجودہ پولیٹکل حیثیت

ایک جانب سے اینگلو انڈین حضرات کا یہ دعوا ہی کہ اہل ہندوستان تو ان کے مفتوح ہیں اور وہ فاتح ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس ملک کو بہ زور شمشیر فتح کیا ہی اور وہ بہ زور شمشیر ہی اس پر قابض ہیں۔ مگر تاریخ

کے صفحات اور واقعات ان کے ان دعووں کی پوری تائید نہیں کرتے ۔ اصل بات یہ ہی کہ جس وقت انگریزوں نے ہندوستان میں اپنا دخل جمانا شروع کیا اس وقت ہندوستان کا پولیٹکل نقشا ایسا بگڑا ہوا تھا کہ اس نقشے میں بازی لے جانا زیادہ تردانائی، فراست اور حکمتِ عملی کا کام تھا نہ کہ تلوار کا، اور ایسا ہی ہوا ۔ انگریزوں نے جو فتوحات اپنے حریفوں پر حاصل کیں انمیں ایک بھی ایسی نہیں ہی جو محض انگریزی تلوار کے زور سے حاصل کی گئی ہو ۔ سلطنتِ مغلیہ کے کمزور ہوجانے پر ہندوستان میں ایک طوفانِ عظیم بپا ہوا اور اس طوفان کے صدمے سے بہت سے دیرینہ سال پولیٹکل درخت اپنی جگہ سے اکھڑ گئے ۔ پانی کی اُچھال سے جگہ جگہ دلدلیں بن گئیں ۔ سلطنتِ مغلیہ کو کوئی ایک طاقت شکست دے کر اپنا راج قائم کرتی تو شاید اس قدر بدامنی ملک میں نہ پھیلتی ۔ مگر اصلیت یہ ہی کہ خاندان مغلیہ کی طاقت اندر ہی سے بوسیدہ ہوکر نیست و نابود ہوگئی ۔ جب کوئی عظیم الشان درخت گھن لگنے سے پولا ہوجاتا ہی تو بیرونی دشمنوں اور حملہ آوروں کا کام نہایت آسان ہوجاتا ہی ۔ مختلف دشمن مختلف مقامات پر اپنے اپنے نفع کو مدنظر رکھ کر ایک دم حملہ کرتے ہیں اور گو وہ مختلف مگر مجتمع کوششوں کی بدولت بنیاد سے اکھڑ جاتا ہی مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی یہ اقتدار حاصل نہیں ہوتا کہ اس مُکل درخت کی مُکل جگہ پر اپنا تسلط جمالے ۔ ایسے وقت میں پولیٹکل طاقت کے حاصل کرنے میں تلوار اس قدر مدد نہیں دیتی جیسے کہ دانائی اور حکمتِ عملی ۔ ایسے موقع پر یہ حکمتِ عملی کا کام ہی کہ درپردہ بندشوں سے ان مختلف منتشر طاقتوں کو بعض کو دلاسے سے، بعض کو لالچ سے، بعض کو دھوکا و فریب سے، بعض کو خوف ورجا سے یہ یقین دلادے کہ ان سب کا یا ان سب میں سے کثیر تعداد کا نفع اس میں ہی کہ وہ ایک ظاہرا زبردست طاقت کی سرپرستی قبول کرلیں اور اس کے ماتحت ہوکر دوسرے دشمنوں کو نیچا دکھادیں ۔ چنانچہ طاقت برطانیا

نے بھی ہندوستان میں ایسا ہی کیا اور مختلف ہندوستانی طاقتوں کی امداد سے اپنے خوف‌ناک دشمنوں پر غلبہ پایا۔ جوں ہی دشمن تتر بتر ہوگئے اور انہیں سامنے آنے کی تاب نہ رہی، اسی دم اس کی افضل حکمتِ عملی نے یک‌بیک عجب قسم کے انصاف کا رویہ اختیار کیا۔ تمام سابقہ اقداروں پر پانی پھیر کر آہستہ آہستہ اپنے ساتھیوں اور مددگاروں کے پر کاٹ ڈالے اور ایسا قابو میں کرلیا کہ انہیں اُڑنے کی تاب نہ رہی۔ بس پھر کیا تھا۔ جب میدان صاف ہوا اور حکمتِ عملی سے ملک پر قبضہ ہوگیا تو رعایا کے ساتھ بھی نہایت دل‌خوش‌کن قول‌وقرار کئے گئے۔ اگرچہ ابتدا میں ظلم وستم بھی بہت ہوا، مگر گاہے گاہے مظلوموں کی شنوائی بھی ہونے لگی۔ رعایا جو کچھ عرصہ سے محض ظالم‌وستم ہی کی عادی تھی اس برائے‌نام داد رسی پر فریفتہ ہوگئی۔ چند ایمان‌دار، نیک‌دل، انصاف‌پسند، رعایاپرور انگریزی افسروں کی خوش اخلاقی اور ان کی دادگستری نے صدیوں کی ظلم رسیدہ رعایا کے دلوں پر ایسا رسوخ پایا کہ انہوں نے اس امن‌اور انصاف کے زمانے کو نہایت غنیمت سمجھا۔ اس فلاحِ عامہ کی دُھن اور جوش میں انگریزی جھنڈے نے نہ نابالغ رئیسوں کے حقوق کا لحاظ رکھا نہ بیوگان کی بےچارگی پر ترس کھایا۔ حکمتِ عملی اور فائدۂ عوام کے نام سے سب مٹادئیے، حتٰی کہ رنجیت سنگھ کی پیشین‌گوئی پوری ہوگئی اور تمام برِّاعظم پر کشمیر سے لے کر راس‌کماری تک اور برما سے لے کر بلوچستان تک نقشے کا رنگ سرخ ہوگیا۔

اب یہ دعوا ہی کہ ہم نے ملک کو بہ‌زور شمشیر لیا ہی اور اپنے فائدے کےلئے لیا ہی اور اب بھی بہ‌زورِ شمشیر ہی اس کو رکھ رہے ہیں اور ایسی صورت میں ہمارا حق ہی کہ جس‌قدر فائدہ اُٹھاسکتے ہیں اس ملک سے اُٹھائیں۔ اہلِ ملک ہماری رعایا ہیں۔ جس طرح ہمارا دل چاہے گا انسے کام لیں گے۔ اگر ہم

ان کے ساتھ انصاف سے برتاو کریں اور ان کو کچھ حقوق عطا کریں تو یہ ہماری عالی ہمتی اور فراخ حوصلگی ہی اور ہمارا فائدہ بھی اسی میں ہی - اس سے زیادہ اہلِ ملک کے کوئی حقوق نہیں ہیں - برابری اور ہمسری کا دعوا لچر اور بےہودا ہی -

دوسری جانب ایک جماعت انگریزی مدبّروں اور انگریزی داناوں کی ایسی ہی جو تلوار کا لفظ کبھی زبان پر نہیں لاتی - یہ جماعت اہلِ ہندوستان اور دیگر تمام دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی ہی کہ انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط پانا منجملہ ان خدائی مکاشفات کے ہی جو وہ مالکِ زمین و آسمان وقتاً فوقتاً اپنی تنگ آئی ہوئی مخلوق پر کرتا رہتا ہی ، یعنی ان کی رہائی اور بہتری کے لئے کسی انسان یا انسانی جماعت کو بھیج دیتا ہی - ان کے خیال میں خداوند کریم نے انگریزوں کو اس ملک میں ہندوستان و اہلِ ہندوستان کی بہبودی کے لئے بھیجا تھا - ان کا یہ دعوا ہی کہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا مدعا محض ہندوستان اور ہندوستانیوں کا افادہ ہی - وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی راج نے ہندوستان کو امن، ترقی، تجارت، تعلیم، روشنی اور تہذیب کی اعلا برکتیں عطا کیں اور انگریزی راج ہندوستان میں اس لئے ہی کہ وہ خود ہندوستان اور ہندوستانیوں کو دنیا کی سب اقوام کے ہم پلّہ بنادے - ملکۂ معظمۂ مرحومہ کا اعلانِ اعظم جو انھوں نے غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں منتشر کیا تھا غالباً اسی قسم کے کسی مدبر کے قلم سے نکلا تھا - ان مدبّروں سے جب یہ شکایت کی جاتی ہی کہ ہندوستان میں سرکاری برتاو اور لحاظ میں کالے اور گورے میں کیوں تمیز روا رکھی جاتی ہی ؟ یہاں تک کہ قانون میں بھی بعض صورتوں میں اس تمیز کو جائز قرار دیا گیا ہی، اور کیا سبب ہی کہ سلطنت کے اکثر اعلا عہدے گوروں کے لئے مخصوص ہیں اور ہندوستانیوں کی وہاں دسترس ناممکن ہی ؟ کیا باعث ہی

کہ انگلستان کی طرح ہندوستان میں پارلیمنٹ قائم نہیں ہوئی؟ کیوں ہندوستانیوں اور یورپین اصحاب کے مابین فوجداری مقدمات کی سماعت ہندوستانی نہیں کرسکتے؟ کیوں ہندوستانیوں کو فوج کی افسریاں نہیں دی جاتیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ معاملہ فہم مدبر ہم کو یہ جواب دیتے ہیں کہ ہندوستانی ابھی ان چیزوں کے لائق نہیں ہیں۔ یہ اصحاب ہم کو اور اپنے آپ کو ایک ہی بادشاہ کی رعایا کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ ہم کو ملکی بھائیوں کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کے لئے ہم ان کے کمالِ مشکور ہیں۔ لیکن اگر نظرِ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوائے چند خاص نیک دل انگریزوں کے، سلطنت کی انتظامی پالیسی کے متعلق جملہ انگریز صاحبان کا اتفاق ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ جماعت اول الذکر اُس ناعاقبت اندیش، تندمزاج، ترش رو مالک کی طرح سلوک کرنا چاہتی ہے جو اس امر کی پرواہ نہیں کرتا کہ گھوڑا یا گدھا کتنے دن جئے گا۔ اس وقت فقط اپنے فائدے سے غرض ہے۔ جماعت ثانی اس دوراندیش مالک کی طرح برتاو کرنا چاہتی ہے جو اپنے گھوڑے یا گدھے کی درازئ عمر میں اپنا فائدہ تصور کرتا ہے۔ یہ جماعت ہم کو اپنے "فیلو سبجکٹ" اور "فیلو سٹی زن" یعنی ہم وطن اور ایک ہی بادشاہ کی رعایا کہتی ہے۔ مگر حقیقت میں ہم نہ ان کے فیلو سبجکٹ ہیں اور نہ فیلو سٹی زن۔ ان کا یہ کہنا بجا ہوتا اگر ہم کو اپنے ملک کے انتظام میں وہی حقوق حاصل ہوتے جو ان کو اپنے ملک کے انتظام میں حاصل ہیں۔ فیلو سٹی زن ہم اس حالت میں ہوسکتے اگر انتظام سلطنت میں ہم کو وہی اختیارات حاصل ہوتے جو سفید رنگ کے افراد کو حاصل ہیں۔ برعکس اس کے امرِ واقعہ یہ ہے کہ نہ ہم کو ملک کے انتظام میں وہ حقوق حاصل ہیں جو انگریزوں کو اپنے ملک کے متعلق ہیں اور نہ اِمپائر کے انتظام میں کسی قسم کا کوئی دخل۔ اس وقت ہندوستان پر معدودے چند انگریزوں کی مطلق العنان حکومت ہے جو انگریزی وزارت کے ماتحت کام کرتی ہے۔ اس انتظام میں اہلِ ہندوستان کو کسی طرح کا دخل و

اختیار نہیں ہی۔ ان کے لئے قانون بنانے والی جماعت میں انگریزوں کی
کثرتِ رائے، ان پر حکومت کرنے والی جماعت میں انگریزوں کی کثیرالتعدادی،
فوجوں میں حکومت، طاقت اور افسری کی باگ انگریزوں کے ہاتھ میں۔ پس
کیونکر کہا جاسکتا ہی کہ اپنے ملک کی حکومت میں کچھ بھی ہم کو دخل
نصیب ہی۔ انگریز صاحبان جس قدر چاہیں محصول لگائیں، جس طرح چاہیں
وصول کریں۔ ہمارا کچھ عذر نہیں۔ وہ جس طرح چاہیں محاصل ملکی کو خرچ
کریں۔ اس میں ہمارا کچھ اختیار نہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں۔ اپنے ملک کی تعلیم
کے متعلق بھی ہم بااختیار نہیں ہیں۔ ہم کو یہ اختیار نہیں کہ جس طرح اور جو
چاہیں اپنے مدارس میں تعلیم دیں۔ ہماری درسگاہیں اور دارالعلوم انھی کے
ماتحت ہیں۔ امتحانات کے لئے فیس ہمارے لڑکے، یونیورسٹیوں کو عطئے ہم اور
ہمارے اہلِ ملک بخشیں۔ مگر انتظام ان کا بھی۔ انگریز صاحبوں ہی کے ہاتھ میں
ہی۔ ہمیں وہاں بھی زیادہ اختیار نہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہم سے ہمارے منھ پر
یہ کہا جاتا ہی کہ ہم ایسے بیوقوف، جاہلِ مطلق، نادان، بدتمیز ہیں کہ اپنے
ملک اور اہلِ ملک، اپنی قوم اور اپنے بچوں کے نیک و بد کو نہیں سمجھ سکتے۔
اور ہم کو اس قدر شعور نہیں کہ ہم اپنی ضرورتوں کے مطابق اپنے لئے کوئی
سلسلۂ تعلیم قائم کرسکیں۔ سچ ہی زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ کیا آپ نے
کبھی غور نہیں کیا کہ جب کبھی کوئی بچہ روتا ہی تو بعض بےرحم ماں باپ اس
کو اور مارتے ہیں محض اس لئے کہ وہ روتا ہی۔ پس اس بارے میں ہماری بھی وہی
حالت ہی گو ہم گورنمنٹ کو نہ ماں باپ سمجھتے ہیں نہ خود کو بچہ۔ لیکن
یہ انگریز حاکم بالادست ہیں اور ہم زیردست، محکوم۔ اصلیت تو یہ ہی کہ ہم
صرف انگریز صاحبوں کے فیلو سبجکٹ ہی نہیں ہیں بلکہ ہمارا تعلق اپنے شہنشاہ
سے بھی وہ نہیں ہی جو مطلق العنان بادشاہ کے ساتھ اس کی رعایا کا ہوتا ہی۔
کاش کہ بادشاہ اِڈورڈ کو ہم پر وہی اختیارات حاصل ہوتے جو اکبر کو حاصل

تھے تو یقیناً ہماری پولیٹکل حالت اس سے بدرجہا بہتر ہوتی۔ صورتِ موجودہ میں گو ہم بادشاہ اِڈورڈ کی رعایا ہیں مگر ہمارے بادشاہ کو ہمارے ساتھ نیک سلوک کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ ان کو یہ منصب حاصل نہیں ہی کہ وہ اپنی فراخ‌دلی سے کسی ہندوستانی کو کسی صوبے کا گورنر یا کسی فوج کا کمانڈر بنادیں۔ ان کو یہ اختیار نہیں ہی کہ وہ ہندوستان کے فائدے کو مد نظر رکھ کر ولائتی کپڑے پر محصول لگائیں۔ وہ یہ نہیں کرسکتے کہ غیرممالک کی بنی ہوئی شکر پر محصول لگادیں تاکہ بےچارے ہندوستانی بھی تھوڑی بہت روٹی کھاسکیں۔ سچ تو یہ ہی کہ ہم محض برائے‌نام بادشاہ اِڈورڈ کی رعایا ہیں ورنہ اصل میں تو معمولی سے معمولی انگریز رائے دہندہ کو بھی ہم پر ہمارے شہنشاہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔ ہر ایک انگریز کو یہ اختیار حاصل ہی کہ خود یا اپنے قائم مقامان موجودہ پارلیمنٹ کے ذریعہ سے ہم پر ٹیکس لگادے یا کسی اور طرح سے ہماری قسمتوں کا فیصلہ کردے۔ ہمارے رحم‌دل بادشاہ کو گو یہ اختیار حاصل ہی کہ پارلیمنٹ کے فیصلوں کو نامنظور کردیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ بہ‌حالتِ موجودہ ہماری مصیبتوں کو اپنے سر پر منتقل کرنا ان کے لئے کس قدر دشوار ہی۔ کانسٹی‌ٹیوشنل بادشاہ کا فرض ہی کہ وہ اپنے وزرا کی رائے کے مطابق کام کرے اور وزرا کا فرض ہی کہ پارلیمنٹ کے احکام کے مطابق عمل کریں۔ پارلیمنٹ کا فرض ہی کہ ملک کی عام رائے کی پابند رہے۔ حقیقت تو یہ ہی کہ انگریز ہی اس امر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں یا یوں کہو کہ ہر ایک انگریز کی رعایا ہیں۔ ایسی صورت میں ہماری موجودہ پولیٹکل حالت بدرجہا اس سے بدتر ہی جو اکبر اور اورنگ‌زیب کے وقت میں ہندوؤں کی ہوگی۔ خوبیٔ قسمت سے تیس کروڑ ہندوستانی اس وقت چار کروڑ آبادی برطانیا کے زیرِ حکومت ہیں یا یوں کہو کہ ایک ایک انگریز کے حصے میں سات سات یا آٹھ آٹھ ہندوستانی ہیں۔

موجودہ حالت میں ہم انھی کے لئے جیتے ہیں، انھی کے لئے کماتے ہیں۔
ان کو اختیار ہی کہ جس طرح چاہیں ہم کو رکھیں، مہربانی سے پیش آئیں یا
سختی سے۔ ایسی صورت میں ہم کو یہ کہنا کہ ہم ایک ہی اِمپائر کے
فیلوسٹی‌زن ہیں گویا ہم کو چڑانا ہی۔ ہماری سمجھ میں جو صاحب ہم کو
اس طرح چڑاتے ہیں وہ ہمارے ساتھ نہایت بےرحمانہ سلوک کرتے ہیں۔
ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ وہ ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن اس میں کلام نہیں
کہ وہ ہمیں انھی معنوں میں فیلوسٹی‌زن کہتے ہیں جن معنوں میں بہت سے
انگریز صاحبان اپنے نوکروں کو "سردار" یا اپنے گھوڑوں کو "ہیرو" اور
اپنے کتوں کو "پرنس" کہہ کر پکارتے ہیں۔

ہماری یہ خواہش ہی کہ جن ہندوستانی اصحاب کے دل میں پولیٹکل
ترقی کی خواہش موجزن ہی اورجو پولیٹکل آزادی کی اُمنگوں سے بھرے ہوئے
پھرتے ہیں وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان کی موجودہ پولیٹکل حیثیت کیا ہی۔
اگر وہ ان چند خلیق انگریزوں کے خاق سے بھرے ہوئے کلام کے دم میں
آن کر اس زعم میں رہیں گے کہ ہم بھی ان کے فیلوسبجکٹ اور فیلوسٹی‌زن ہیں
تو میرا خیال ہی کہ ہم کو کبھی پولیٹکل ترقی نصیب نہیں ہوگی اور ہماری
تمام پولیٹکل خواہشیں صدیوں تک دل ہی میں رہیں گی۔ جب تک وہ اس
مسمریزم کے اثر سے نہ نکلیں گے وہ کبھی سیدھے راستے پر نہ پڑیں گے۔
ترقی کے لئے قدم اُٹھانے سے پہلے ہر ایک ترقی کی خواہش رکھنے والے
انسان کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی آرزو کیا ہی اور اس کے بعد وہ
اپنی آرزو حاصل کرنے یا اپنی غرض کو پورا ہونے کے لئے صحیح اور معقول
تدبیر کرسکتا ہی، ورنہ اندیشہ ہی کہ اس کی تمام تدابیر محض بےتکی ہوں گی۔
ہماری رائے ناقص میں اسی غلط فہمی کے باعث ہمارے بہت سے پولیٹکل

لیڈر محض بے تکی بانک لگاتے ہیں۔ نہ صرف خود ہی بے راہ جاتے ہیں بلکہ اوروں کو بھی بے راہ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری دل سے یہ دعا ہی کہ خداوند کریم ان کو سیدھے راستے پر ڈال دے تاکہ ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے منزلِ مقصود کا رخ کریں اور حکام گورنمنٹ کو ملک کی اصلی ضروریات کا احساس ہو اور وہ سچی فراخ حوصلگی اور فیاضی کو کام میں لاکر اہلِ ملک کے اصلی حقوق کی حوصلہ افزائی کریں۔

حسرت موہانی

مسٹر مارلے کی مجوزہ اصلاحوں کی حقیقت

ایک فرانسیسی دانش مند کا یہ قول بالکل صحیح ہی کہ جب کسی حکمراں کو اپنی محکوم رعایا کے لئے کوئی نیا طرز ستم ایجاد کرنا ہوتا ہی تو اس وقت کچھ تو اپنے ہم عصروں کی ملامت کے خوف سے اور کچھ رعایا کی زبانِ اعتراض بند کرنے کی غرض سے وہ اپنی تمام کارروائیاں اصلاح و انتظام کے نام سے جاری کرنا زیادہ مناسب خیال کرتا ہی، مثلاً لارڈ کرزن کو ہندوستان میں اعلا تعلیم کا تنزل منظورِ خاطر تھا جس سے غرض یہ تھی کہ اہلِ ہند تعلیم یافتہ ہوکر اپنے حقوق سے آگاہ نہ ہوں اور آزادی کا مطالبہ نہ کریں۔ لیکن چونکہ یہ تجویز اہلِ ہند کے مقاصد اور انگلستان کی ادعائے تہذیب کے بالکل مخالف تھی اس لئے اسے نامعلوم طور پر بروئے کار لانے کا یہ طریق اختیار کیا گیا کہ اصلاحِ تعلیم کی ایک ایسی کمیشن مقرر کی گئی جس میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو لارڈ کرزن کی

خواہش کے مطابق اصلاح کے بجائے تخریبِ تعلیم کے درپے تھے۔

بعینہ یہی حال مسٹر مارلے کی مجوزہ اصلاحوں کا بھی ہے۔ مدت سے انگریز مندرجہ ذیل چند باتوں کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ:
(۱) تعلیم یافتہ گروہ میں خیالات کی آزادی اور حکومت کی خواہش بڑھتی جاتی ہے اور وہ لوگ سختی کے ساتھ نکتہ چینی کرنے میں بھی بہت بے باک ہوتے جاتے ہیں (۲) والیانِ ملک، تعلقدار و روسا اپنی ریاستوں کو محفوظ رکھنے کے خیال سے یا بہ باعثِ کم علمی ہمیشہ اظہار وفاداری میں سب سے آگے نظر آتے ہیں (۳) مسلمان ہر موقع پر اپنے تئیں حکومت کا تابعدار غلام ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پس ان سب امور کے مطالعہ کے بعد ان کوتاہ بین حکام نے یہ رائے قائم کی کہ کسی نہ کسی طرح سے تعلیم یافتہ گروہ کی قوت کو شکست کرنا اور امرا و اہلِ اسلام کی طاقت کو اس طور پر مدد دینا چاہئے کہ اپنا مقصد بھی حاصل ہوجائے اور ان آخرالذکر گروہوں کو حقیقی قوت بھی نہ حاصل ہو۔ چنانچہ مسٹر مارلے کی مجوزہ اصلاحوں کا منشا مذکورہ بالا خیال کو عملی صورت میں لانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو کہ:
(۱) امرا و معززین کی کارنسل میں ۶۰ ممبر ہوں گے۔ ان سب کو گورنمنٹ نامزد کرے گی جن کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔ ان کا کام صرف یہ ہوگا کہ جس وقت گورنمنٹ کسی معاملہ میں ان سے مشورہ کرنا چاہے گی وہ اسے اپنی رائے سے فرداً فرداً خفیہ طور پر اطلاع دیں گے۔ اپنی طرف سے انہیں کسی مسئلہ کو پیش کرنے کا مطلق اختیار نہ ہوگا نہ ان کی رائے کا جمہور کی اطلاع کے لئے شائع ہونا لازمی ہوگا۔ البتہ گورنمنٹ ان کی مجموعی رائے کو جس غرض کے لئے چاہے استعمال کرے گی۔

اس کاونسل کے بیکارِ محض ہونے کی ایک یہی وجہ کافی ہو کہ اس کے کل ممبر صرف روسا اور امرا کے ناقابل گروہ سے منتخب ہوں گے جس میں سے شاذ و نادر ہی کوئی رئیس ایسا ہوگا جسے وائسرائے کے روبرو اپنی آزادانہ رائے (اگر کسی رئیس کو آزاد رائے ہونا ممکن بھی ہو) بلا تامل پیش کرسکے۔ ورنہ عام طور پر تو اس فرقے سے بجز حکام کی ہاں میں ہاں ملانے کے اس وقت تک کوئی اور کارنمایاں ظہور میں نہیں آیا ہو۔

خیال کرنے کی بات ہو کہ وہ لبرل گورنمنٹ جو انگلستان میں دارالامرا (ہاوس آف لارڈز) کو یک قلم مٹادینے کی کوشش میں مصروف ہو ہندوستان میں کس اصول پر امرا کو اپنی حکومت میں دخل دینے کے لئے بےتاب و بےقرار ہو؟ صاف ظاہر ہو کہ اس کا منشا سوا اس کے اور کچھ نہیں ہو کہ امرا کو قوی بنانے کے بہانے سے تعلیم یافتہ گروہ کو زک دی جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی لحاظ رہے کہ روسا و امرا کو حقیقی قوت ذرا بھی حاصل نہ ہو۔ اگر گورنمنٹ کو صرف امرا کی تقویت مدِ نظر تھی تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی مجوزہ کاونسل کو بالکل بےدست و پا رکھنے کا کیا مطلب ہو۔ ہمارے خیال میں یہ کاونسل، امرا جسے مسٹر تلک کے اخبار کیسری نے بالکل صحیح طور پر ''نالائقوں کی کاونسل'' کا خطاب عطا کیا ہو محض اس نیت سے قائم کی گئی ہو کہ جب کسی معاملہ میں گورنمنٹ اور تعلیم یافتہ گروہ کے درمیان اختلاف واقع ہو تو گورنمنٹ امرا کی رائے دریافت کرے (جس کا حکومت کے خیال کے مطابق ہونا ایک لازمی امر ہو) اور پھر اُن کی مجموعی رائے کو تعلیم یافتہ گروہ کی رائے کے مقابلہ میں پیش کرے۔ پریس، پبلک اور مہذب دنیا کو بےوقوف بنانے اور تعلیم یافتہ گروہ کو خاموش کرنے کا ایک قوی ذریعہ پیدا کرے اور ہندوستانی

روسا اور امرا کو اپنی کاربرآری کا ایک ذلیل آلا بنائے۔

ہندوستانی ریاستوں کے بعض سادہ دل رئیس ممکن ہی کہ اس تجویز کو اپنی عزت افزائی سمجھ کر پسند کریں۔ لیکن ان میں سے جن کو ذرا بھی سمجھ ہوگی وہ اس کاونسل کی شرکت کو اپنے لئے موجبِ ننگ و عار سمجھیں گے اور اپنے دل میں غور کریں گے کہ کیا کسی انگریزی صوبہ کا گورنر یا لفٹننٹ گورنر ان کی ریاست میں لیجسلیٹیو کاونسل کی ممبری کو اپنے لئے باعث عزت خیال کرسکتا ہی؟

(۲) وئسرائے کی کاونسل میں بجائے ۲۵ کے اب مع وئسرائے ۵٤ ممبر ہوں گے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہی کہ توسیعِ کاونسل ہائے ہند کا وعدہ ایک حد تک ضرور پورا کیا گیا ہی۔ لیکن غور کرنے سے نظر آجاتا ہی کہ ممبروں کی زیادتی تعداد ایک ابلہ فریب رعایت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جسے اسکول کا ایک معمولی طالب‌علم بھی بہ آسانی دریافت کرسکتا ہی۔ کیا معنی کہ جہاں پہلے ۲۵ ممبرانِ کاونسل میں سے ۹ ہندوستانی ہوتے تھے وہاں اب ۵٤ میں سے صرف ۱۹ ہوں گے؟ یا بالفاظ دیگر ہندوستانی ممبروں کی تعداد بحساب تناسب پہلے سے بھی کچھ کم ہوجائے گی۔ پس جب معاملات کی صورتِ حال اس طور پر واقع ہوئی ہی تو پھر ہمارے نزدیک مسٹر مارلے کی تجویزوں کو اصلاح کی بجائے تخریب کا نام دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ اس ۱۹ کی کم شدہ تعداد میں سے یہی ایک والئی ملک، سات تعلقدار و زمیندار اور دو نامزد شدہ مسلمانوں کو ہم صرف برائے نام ہندوستانی کہہ سکتے ہیں کیوں‌کہ دراصل وہ لوگ اپنے اہلِ ملک کی تائید کی بجائے اپنے انگریز محسنوں اور افسروں کی ہاں میں ہاں ملانا غالباً زیادہ پسند کریں گے جیسا کہ آج تک ہوتا رہا ہی۔

لالا لاجپت رائے

حبِ وطن کی منزل

گذشتہ دو سال سے جو سلوک سرکار ہند کی طرف سے باشندگانِ ملک کے ساتھ ہورہا ہی اس پر ہمارے اہلِ وطن بہت رنجیدہ اور ناراض ہیں۔ لیکن حقیقت میں غور کیا جائے تو سرکار انگریزی نے جو کارروائی کی ہی کوئی غیر معمولی نہیں ہی۔ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ظلم اور بدمعاملگی انسانی نیچر میں طبعی ہیں۔ تاہم معمولی انسانی تجربہ یہ بتلاتا ہی کہ جب کوئی شخصِ واحد یا جماعتِ انسانی ایک دفعہ کسی دوسرے کے مال و متاع اور حقوق پر قبضہ کرلیتی ہی اور ایک مدت تک اس سے مستفید ہوتی رہتی ہی تو اس کے لئے یہ ایک نہایت ہی مشکل امر ہوجاتا ہی کہ وہ شخص یا جماعت محکوم و ماتحت کے دعوے پر اس کے حقوق اس کو دے دے۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہی کہ ایک مدت کے ناجائز یا جابرانہ قبضہ کے بعد شخص یا جماعت قابض کی ذہنی اور اخلاقی حالت میں ایسی تبدیلی واقع ہوتی ہی کہ اس کو فریق محکوم و ماتحت کے دعوے خلاف قدرت اور بے ہودہ معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ اپنا جائز حق سمجھتا ہی کہ ہر قسم کے وسائل سے اپنے قبضے اور اختیارات کی حمایت و محافظت کرے۔ اور شخص غیر قابض کو نہ صرف اس کے دعووں کی بےہودگی کا یقین دلائے بلکہ جبر و تشدد سے بھی اس کی ان سب کوششوں کا مقابلہ کرے جو وہ اپنے حقوق کی واپسی کےلئے کرتا ہوا معلوم ہوتا ہی۔ اگر انسانوں کی معمولی تعلقات میں یہ بات روزمرہ دیکھنے میں آتی ہی تو پولیٹکل دنیا میں اس کا تجربہ اور مشاہدہ اور بھی وضاحت سے ہوتا ہی۔ ہم اس سے پہلے ایک تحریر میں یہ

ظاہر کرچکے ہیں کہ ہم اس بات کو باور نہیں کرتے کہ اس ملک میں انگریز
اہل ہند کے فائدہ کے لئے آئے اور ان کی موجودہ حکومت محض اہلِ ملک
کے فائدہ کی غرض سے ہی۔ انگریزی قوم کو ہندوستان پر قبضہ رکھنے میں
بڑا فائدہ ہی۔ شاہ برطانیا کے تاج میں ہندوستان سب سے بڑا نگینا ہی۔ شہرت،
طاقت اور ملکی رتبہ کے علاوہ انگریزی قوم کو ہندوستان سے بہت کچھ مالی
فائدہ بھی ہوتا ہی۔ ایسی صورت میں قدرۃً انگریزوں کی وہ جماعت جو
ہندوستان پر حکومت کرتی ہی اور جس کے ہاتھ میں کروڑہا ہندوستانیوں کی قسمت
ہی ہندوستانیوں کی ان کوششوں کو جو وہ ان کے اختیارات کی کمی اور اپنے
حقوق کی بحالی کے لئے کرتے ہیں، پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔
اول تو وہ ہندوستانیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہل ہند کی
بہبودی اسی میں ہی کہ ہندوستان کے طرز و طریقِ حکومت میں کوئی تبدیلی نہ
ہو، لیکن جن لوگوں پر یہ جادو نہیں چلتا ان کو جبراً روکنا بھی وہ اپنا فرض تصور
کرتے ہیں۔ اس وقت تک ہندوستانی غالباً اس خیال میں بیٹھے تھے کہ جس
وقت وہ انگریزوں سے اپنے حقوق طلب کریں گے اسی وقت انھیں وہ حقوق
مل جائیں گے۔ دو سالِ گذشتہ میں جو تجربہ ان کو ہوا ہی اس سے ان کی
ان اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ لیکن اصل یہ ہی کہ ہندوستانیوں کا یہ خیال کہ
انگریز محض طلبی پر بخوشیٔ خاطر ان کے پولیٹکل حقوق ادا کردیں گے محض
ایک خام خیالی ہی اور ہم خوش ہیں کہ اُن سب پر اب اس خیال کی غلطی
ظاہر ہوگئی۔

ہم کو پہلے سے یقین کامل تھا کہ جس وقت ہندوستانیوں نے اپنے
حقوق طلب کرنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو اپنے قومی رشتہ میں
مضبوط کرنے کا ارادا کیا تو فوراً حکامِ وقت کی طرف سے ان کی مخالفت

ہوگی اور اگر ضرورت ہوئی تو جبر و تشدد سے بھی کام لیاجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بذاتِ خود ہم کو اپنے حکام کی کارروائیوں پر نہ کوئی حیرت ہوئی اور نہ ہی۔ ہم اپنے ذہن میں اس جبر و تشدد کے لئے بالکل تیار تھے اور اسی لئے ہم کو ذاتی طور پر اس جبر سے بہت تکلیف نہیں ہوئی۔ ہم نہایت خلوصِ دل سے اپنے اہلِ وطن کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ قومی خدمت کا راستا آسان گذار نہیں ہی۔

عشق بازی کارِ بازی نیست ای دل! سر بباز
زانکه گوی عشق نتوان زد بچوگانِ ہوس

جو لوگ قومی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو اس جبر و ظلم کے لئے تیار رہنا چاہئے، ورنہ اس راستے میں قدم ہی نہ رکھنا چاہئے۔ گورنمنٹ ہند جو کچھ کررہی ہی وہ دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے دیگر گورنمنٹیں کرتی چلی آئی ہیں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہورہا ہی وہ ہم سے پہلے دیگر ممالک کے محبانِ وطن کے ساتھ ہوچکا ہی اور ہوتا رہا ہی۔ پس عقلمندی اور دانائی اس میں ہی کہ بغیر کسی غصہ و ناراضگی کے نہایت سنجیدگی اور متانت سے کام کیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس منزل میں جو تکلیفیں دنیا میں دوسرے انسانوں کو ہوئی ہیں وہ ہمیں بھی ہوں گی۔ ان کے بغیر راہ گذاری ناممکن ہی۔ خواہ مخواہ شکوہ شکایت میں وقت ضائع کرنے اور اپنی قوتوں کے بےجا استعمال اور تصرف سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس راستے میں نہ شکوہ شکایت کی گنجائش ہی اور نہ شخصی نفع و نقصان کے حساب کو دخل ہی۔

خواہی کہ روشنت شود احوالِ سرِ عشق　　از شمع پُرس، قصہ ز بادِ صبا مپرس
در دفتر طبیبِ خرد بابِ عشق نیست　　ای دل! بدرد خُوکن و نامِ دوا مپرس

حسرت موہانی

فرنگی جیل خانوں میں گورے اور کالے رنگ کی تمیز

دنیا کے معمولی کاروبار میں عموماً اور ریلوے سفر میں خصوصاً اہلِ ہند کو اکثر اس امر کا ناگوار تجربہ ہوا ہوگا کہ صرف رنگ کے فرق نے ان کے اور یوروپین یا یوریشین اصحاب کے درمیان ایک ایسا عجیب و غریب امتیاز قائم کردیا جس کی بنا تعصب یا غرور کے سوا اور کسی جذبہ پر ہو ہی نہیں سکتی۔

افسوس ہے کہ رنگ کے اس بےجا امتیاز کا دائرا اس قدر وسیع ہوگیا ہے کہ عدالت کے ایوان اور جیل کی کوٹھریاں بھی اس کے حدود کے اندر آگئی ہیں۔ عدالتوں میں فرنگیوں کے ادعاے انصاف کے خلاف گوروں کے ساتھ جو جو رعایتیں ملحوظ اور کالوں پر جو جو سختیاں جائز رکھی جاتی ہیں ان کی تفصیل ایک جداگانہ دفتر کی محتاج ہے۔ اس موقع پر ہم ان کے بیان سے قطع نظر کرکے صرف جیل کے حالات پر اس لئے اور بھی اکتفا کرتے ہیں کہ جیل کی کیفیت سے عام طور پر لوگ بالکل ناآشنا ہیں۔

خوراک :

کالوں کے لئے صبح کو آدھ پاو چنے بطور ناشتا دئے جانے کا حکم ہے۔ لیکن عموماً قیدیوں کو چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک سے زیادہ نہیں ملتے۔ ناشتے کے بعد کام پر جانا ہوتا ہے جہاں سے گیارہ بجے کھانا کھانے کے لئے کچھ دیر کی فرصت ملتی ہے۔ کھانے میں جوار، باجرا، ماش اور گیہوں کے مخلوط آٹے کی کچی روٹیاں ہوتی ہیں جس میں گیہوں کی مقدار سے

کچھ ہی کم مٹی یا چونا ملا ہوتا ہے۔ ان روٹیوں کو کچا رکھنے کی مصلحت یہ ہے کہ اول تو پکانے کے لئے پتھر کے کوئلے اس قدر کم ملتے ہیں کہ نئے دفعیوں (قیدی باورچی) کو کچی روٹی پکانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کچی روٹیوں کے بھاری ہونے کے سبب سے مقررہ وزن کی روٹیاں کم آٹے میں تیار ہوجاتی ہیں۔ بچاہوا آٹا دوسرے لوگوں کے کام میں آتا ہے۔ پکی ہوئی روٹی نو چھٹانک ملنے کا حکم ہے۔ لیکن عموماً آٹھ چھٹانک بلکہ کبھی کبھی سات چھٹانک سے بھی کم ملتی ہے اور کسی کو چون و چرا کی ہمت نہیں ہوتی .... روٹی کے ساتھ کھانے کے لئے دوپہر کو اُبلی ہوئی بےدلی ارہر اور شام کو چولائی کا ساگ جس کی ادنا صفت یہ ہے کہ پھینک دئے جانے پر کوے بھی اسے نہیں سونگھتے، ملتا ہے...... برخلاف اس کے گوروں کو ناشتے کے لئے ڈبل روٹی، چاے، شکر اور کھانے کے لئے گھی کا گوشت، ترکاری، چاول، دودھ، غرض کہ سب کچھ ملتا ہے اور کافی مقدار میں ملتا ہے۔

پوشاک:

کالے قیدیوں کو ایک لنگوٹ، ایک جانگیا، ایک کرتا، ایک ٹاٹ، ایک کمل، ایک ٹوپی کے سوا کچھ نہیں ملتا جن میں سے ٹاٹ، کمل سالہا سال کے لئے اور جانگیا، کرتا قاعدہ کی رو سے چھ مہینے کے لئے، لیکن ازروے عمل سال بھر بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ دنوں کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس درمیان میں یہ چیزیں پھٹ جائیں یا خراب ہوجائیں تو اس کا خمیازا بھگتنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیدی بغرضِ احتیاط صرف صبح و شام کو انھیں استعمال کرتے ہیں۔ باقی سارا دن کام صرف لنگوٹ باندھ کر کیا کرتے

ہیں۔ برخلاف اس کے گوروں کو بوٹ کے کئی جوڑے مع موزوں کے ملتے ہیں۔ پہننے کے لئے متعدد سوٹ جن کے دھونے کے لئے علاحدہ ہندوستانی قیدی دھوبی کا کام کرتے ہیں۔ لیٹنے کے لئے مسہری، اس پر گدا اور چادر غرض‌کہ آرام کی ساری چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔

جائے قیام اور دیگر ضروریات:

کالوں کے رہنے کے‌لئے بارکیں ہیں جن میں برابر برابر مٹی کے ڈھولے یا اوٹے (چبوترے) بنے ہوتے ہیں۔ جاڑا، گرمی، برسات غرض‌کہ ہر موسم میں انھیں پر سونا چاہئے۔ سخت گرمی کے دنوں میں کاغذ وغیرہ کا مصنوعی پنکھا رکھنا بھی ممنوع ہی۔ صبح کو جب بارک کا دروازا کھلتا ہو تو سب قیدی ایک ساتھ پاخانے جاتے ہیں۔ گھنٹی دو یا تین منٹ سے زیادہ پاخانے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی جس کے بعد بلاتوقف باہر نکل آنا چاہئے، عام اس سے کہ کل قیدی فارغ ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔ برخلاف اس کے گوروں کے لئے فی کس ایک کمرا علاحدہ ملتا ہی جس میں ایک آہنی پلنگ گدے دار، ایک میز، ایک اسٹول، ایک لمپ، اور ہر کمرے کے ساتھ ایک غسل خانہ اور ایک پاخانہ موجود ہونا ہی۔ غسل‌خانہ میں تولیا، صابن ہر شی موجود رہتی ہی۔ ان کے پڑھنے کو اخبار اور لکھنے کو دوات قلم ہر وقت موجود رہتا ہی، حالانکہ کالوں کے لئے کتاب دیکھنا تو درکنار، اگر ان کے پاس کاغذ کے ایک پرزے کا بھی شبہ ہو تو قیامت آجائے۔ چنانچہ خود راقم‌الحروف کی ایک بار اسی شبہ میں یورپین وارڈر کے حکم سے جامہ تلاشی لی گئی اگرچہ کچھ برآمد نہیں ہوا۔ سب سے بڑا تماشا یہ ہی کہ ہر یورپین قیدی کے کمرے پر دو ہندوستانی قیدی رات بھر پنکھا قلی کا کام دیتے ہیں۔

گوروں کے لئے ہر ہفتہ میں ایک بار یا دو بار پادری صاحب آتے ہیں اور وعظ فرماتے ہیں اور ایک جگہ نماز پڑھی جاتی ہی - لیکن کالوں کی مذہبی ضروریات کی جانب کبھی بھول کر بھی توجہ نہیں کی جاتی - عام قیدی کی پوشاک میں جانگیا کی لمبائی اس قدر کم ہوتی ہی کہ جسم اسفل ران تک بالکل کھلا رہتا ہی اور اس طرح پر نماز کےلئے کافی سترپوشی نہیں ہوسکتی - راقم‌الحروف مجبوراً اسی نیم برہنگی کی حالت میں نماز پڑھا کرتا تھا........مسلمانوں کے تہوار عید، بقرعید، شب‌برات، محرم میں شاذ و نادر ہی کسی تہوار پر تعطیل ہوتی ہو حالانکہ گوروں کے لئے بڑے دن کے ایام میں جیلر وغیرہ کی طرف سے دعوت کا سامان کیا جاتا ہی اور ان‌کو ہر قسم کے میوے اور کھانے دئے جاتے ہیں - اس کے علاوہ تمام برتاو میں گوروں کو کالوں پر ہر طرح سے فوقیت حاصل ہوتی ہی -

---

حسرت موہانی

پولیٹکل قیدی

انگریزی جیل‌خانوں میں گورے اور کالے رنگ کی تمیز کے متعلق شاید بعض لوگ یہ عذر پیش کریں کہ یورپین اور یوریشین لوگوں کا طرزِ معاشرت عوام اور اہلِ ہند سے بہت مختلف اور بلند ہوتا ہی- اس لئے جیل‌خانوں میں بھی ان کی ضروریات زندگی کا عوام کی ضروریات سے بالاتر ہونا ایک حد تک جائز ہی - ہم‌کو بھی اس عذر کے صحیح تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہ ہوتا اگر اس اصول کی پابندی بہرحال اور بہرصورت لازمی سمجھی جاتی - لیکن افسوس ہی

کہ معززترین ہندوستانیوں کے ساتھ عوام کے مقابلہ میں ذرہ برابر بھی رعایت نہیں کی جاتی، بلکہ بعض حالتوں میں تو انہیں عوام سے زیادہ ذلیل کرکے انگریزی انصاف کے اس اصول پر ناز کیا جاتا ہی کہ اس کی نظر میں امیروغریب، جاہل اور عالم سب یکساں ہیں......... صرف ان معزز اور تعلیم یافتہ پولیٹکل قیدیوں کو لیجئے جن کی نسبت کسی اخلاقی جرم کے ارتکاب کا شبہ تک نہیں ہوسکتا، تب بھی انگریزوں کا ادعائے انصاف ان میں اور عوام میں کسی قسم کے امتیاز کو جائز نہیں قرار دیتا، اور اگر کہیں فرق کیا بھی جاتا ہی تو ایسا جس کا نتیجہ پولیٹکل قیدیوں کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مضر ہو، مثلاً بعض کو بلاوجہ قید تنہائی میں رہنا پڑتا ہی اور نگرانی تو سب کی عوام سے بہت زیادہ کی جاتی ہی۔ عام قاعدہ ہی کہ چوتھائی میعاد گذرنے پر قیدی کو پہرے دار اور نصف یا قریب نصف میعاد گذرنے پر برقنداز بنادیا جاتا ہی جس کے معنی یہ ہیں کہ پھر خود قیدی کو کام نہیں کرنا پڑتا، بلکہ دوسرے قیدیوں کے کام کی نگرانی اس کے سپرد کی جاتی ہی۔ پہرے داروں اور برقندازوں کو پوشاک بہتر ملتی ہی۔ ان کے گلے کا طوق علاحدہ کردیا جاتا ہی اور جیل خانے کے احاطے میں انہیں نسبتہً زیادہ آزادی مل جاتی ہی۔ پولیٹکل قیدی ان تمام رعایتوں سے محروم رکھے جاتے ہیں، بلکہ بعض بعض جیلوں میں تو ان پر عام قیدیوں سے زیادہ سختی کی جاتی ہی، مثلاً الہ آباد سنٹرل جیل میں جتنے پولیٹکل قیدی بھیجے گئے ان میں سے دو ایک کم زور لوگوں کو چھوڑکر باقی سب سے چکی کے سوا اور کوئی کام نہیں لیاگیا۔ لالا شانتی نرائن صاحب اڈیٹر ،سوراج، کی نسبت دریافت ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں آبلے پڑ پڑ گئے لیکن چکی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ منشی رام سروپ صاحب، سپرنٹنڈنٹ آریا بورڈنگ، علی گڈھ مبتلائے بخار ہوکر اسپتال گئے۔ لیکن اسپتال سے کم زور نکلنے کے بعد بھی بہ دستور چکی پر لگادئیے گئے۔ اور راقمِ مضمون کو تو تقریباً تمام زمانۂ قید اسی منحوس مشقت

سے سابقہ رہا۔ نومبر ۱۹۰۸ء میں انگریزی حکومت کی پچاسویں سال گرہ کے موقع پر ملکِ معظم نے اپنے شاہی فرمان کے ذریعہ سے تمام پولیٹکل قیدیوں کو فی سال ایک ماہ کے حساب سے رہائی مرحمت فرمائی لیکن ہمارے صوبہ کے پولیٹکل قیدیوں کو درمیانی لوگوں نے بادشاہ کے اس فیض عام سے بھی مستفیض نہ ہونے دیا۔ الغرض پولیٹکل قیدیوں کی حالت زار پر یا تو مطلق توجہ ہی نہیں کی جاتی یا اگر کی جاتی ہی تو اس طرح کہ بقول مومنِ مرحوم

تغافل سے جو باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!

شبلی

مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ

[مندرجہ بالا عنوان سے شبلی نے ۱۹۱۲ء میں مختلف اوقات میں تین مضمون لکھے تھے جو مسلم گزٹ، لکھنو میں شائع ہوئے۔ یہاں مضمون نمبر ۲ کے بعض اقتباسات دئے جاتے ہیں۔]

مسلمان دو حیثیتیں رکھتے ہیں۔ (۱) گورنمنٹ برطانیا کی رعایا ہیں، (۲) مسلمان ہیں۔ اس بنا پر مسلمانوں کی پالیٹکس ان ہی دونوں اجزا کا مجموعہ ہی اور ترتیباً پہلا جزو دوسرے جزو پر مقدم ہی۔ رعایا پر حکومت کا جو قدیم شخصی طریقہ تھا اس کا یہ اصل الاصول تھا اور آج بھی شخصی سلطنتوں میں قایم ہی کہ بادشاہ کی زبان قانون ہی۔ وہ حو چاہتا ہی کرسکتا ہی۔ رعایا کو

کسی قسم کے دخل دینے کا حق نہیں۔،، اگر یہ تسلیم کرلیاجائے کہ انگریزی گورنمنٹ اسی قسم کی گورنمنٹ ہی تو تمام بحثوں کا خاتمہ ہوجاتا ہی۔ لیکن وہ اینگلو انڈین بھی جو ہندوستانیوں کو کسی قسم کے حقوق دینے پر راضی نہیں، ان کے نزدیک بھی گورنمنٹ انگریزی کی نسبت "شخصی حکومت،، کا لقب ایک قومی عار ہی جس کو کوئی انگلش‌مین کبھی گوارا نہیں کرسکتا۔ اب انگریزی گورنمنٹ شخصی نہیں تو پارلیمنٹری (دستوری) ہی، اگرچہ طرزِ حکومت بظاہر شخصی ہی، یعنی ایک خاص خاندانِ شاہی وراثۃً فرماں روا ہوتا ہی۔ لیکن حکومت کا نظم و نسق، پارلیمنٹ، ہاوس آف لارڈز اور ہاوس آف کامنز سے مرکب ہی۔ اس لئے یہ شخصیت دراصل اعلا درجہ کی جمہوریت ہی۔ اس اصول کے تسلیم کرنے کے ساتھ کہ انگریزی گورنمنٹ دراصل پارلیمنٹری (دستوری) ہی پالیٹکس کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہی، یعنی یہ کہ رعایا کو انتظامِ حکومت میں ہر قسم کی مداخلت کا اختیار ہی، اظہار رائے اور نکتہ‌چینی کا حق حاصل ہی، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہی کہ رعایا محکوم بھی ہی اور حاکم بھی۔ وہ خود اپنے لئے قانون بناتی ہی اور خود اس پر عمل کرتی ہی۔

انگلستان میں یہ مسئلہ بالکل صاف ہی۔ لبرل اور کنزرویٹو، دونوں میں سے کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن ہندوستان میں آکر اس مسئلہ کا رخ بدل جاتا ہی اور یہ وہی نقطہ ہی جہاں سے ہماری یعنی ہندوستانیوں کی پالیٹکس کا خط شروع ہوتا ہی۔ اب سوال یہ ہی کہ کیا ایک عمدہ اصولِ حکومت، ایک پُرفخر جمہوریت، ایک بےنظیر قانونِ انصاف، صرف اس زجہ سے قالب بدل کر دفعۃً اپنی تمام خصوصیتیں کھو دیتا ہی کہ ملک اور رنگت بدل گئی ہی؟ کیا ہندوستان کی خاک نے حاکمانہ دماغ نہیں پیدا کئے ہیں؟ کیا اس وسیع سرزمین میں بڑے بڑے مدبرینِ ملک نہیں گذرے؟ کیا یہاں کے مقننوں نے بانیان قانون کی صف میں ممتاز درجہ نہیں حاصل کیا؟ کیا اسی ملک

نے اکبراعظم، ٹوڈرمل، ابوالفضل، عضدالملک اور سر سالارجنگ نہیں پیدا کئے ہیں؟ جو خاک ان جواہرات کو پہلے پیدا کرسکتی تھی کیا انگریزی دور کے مبارک عہد میں اس شرف سے محروم ہوگئی ہی؟ قیاس اور استنباط کی ضرورت نہیں۔ واقعات اور تجربے کیا شہادت دے رہے ہیں؟ ہندوستان میں جن لوگوں کو حکومت کی بلند ذمہ‌داریاں دی گئیں، اُن میں کون امتحان مقابلہ میں ناکامیاب رہا؟ کیا اس سے انکار ہوسکتا ہی کہ سید محمود، بدرالدین طیب‌جی، مولوی امیر علی بہترین جج تھے؟ کیا اس میں کسی کو شبہ ہی کہ نوروزجی پارلیمنٹ کا کامیاب ممبر تھا؟ کیا گوکھلے کی صدائے شہرت لندن میں نہیں گونجی،؟ کیا سید علی امام اپنے ہمسروں کی صف میں علانیہ نمایاں نہیں ہی؟ لیکن ایک مدعی کا دعوا گو کیتنا ہی زبردست ہو آسانی سے تسلیم نہیں کیاجاسکتا اس لئے ہم کو یہ دیکھنا ہی کہ سب سے بڑی معدلت‌گاہ نے اس مسئلہ کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہی؟ غدر کے بعد جب عنانِ حکومت حضور ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھ، میں لی تو پچھلے تجربہ کے نتیجہ کے طور پر یہ اعلان دیا کہ ہندوستان میں جو حکومت کی‌جائے گی اس میں رنگ اور قومیت کا امتیاز نہ ہوگا۔ یہ اعلان حضورِ ممدوحہ کی ذاتی رائے نہ تھی، بلکہ وہ پارلیمنٹ کی، ملک کی، انگریزی قوم کی باضابطہ آواز تھی۔

ہم کو معلوم ہی کہ لارڈ کرزن اس اعلان کو دل خوش کن وعدہ سمجھتے تھے۔ لیکن لارڈکرزن کو کیا حق حاصل ہی کہ وہ ایسے جائز، ایسے قابلِ فخر، ایسے پُرانصاف اِرشاد شاہی کی غلط تعبیر کرکے اس کی عظمت اور وقعت کو پامال کریں ؟

لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر، دیکھنا یہ ہی کہ اس معرکہ میں فتح‌وشکست کا کیا فیصلہ ہوا۔ جس زمانہ میں اول اول ہندوستان کی طرف سے

حقوق طلبی کا مقدمہ انصاف کی عدالت میں پیش ہوا، اس وقت سے آج تک برابر اینگلو انڈین کی طرف سے پُرزور مقاومت ہی - لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ روز بہ روز حریف کو شکست ہوتی گئی - وہ بڑے بڑے عہدے جو ان کے لئے مخصوص اور ہمارے لئے گویا زمینِ ممنوعہ تھے، ان سے خصوصیت کا پردا اُٹھ گیا - کلکتا، الہ آباد، مدراس، پنجاب، کے ہائی کورٹوں میں ہندوستانی انگریزوں کے ساتھ دوش بہ درش بیٹھے - آج ایوانِ گورنری کے چھ ستونوں میں سے ایک ستون اعظم ہندوستانی ہی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رفام اسکیم نے گویا سلف گورنمنٹ (زیرِ حمایت برطانیا) کا سنگِ بنیاد رکھ دیا -

جو جدوجہد، جو سعی و عمل، جو پُرجوش کوششیں ملک میں جاری تھیں، ناممکن تھا کہ مسلمان ان سے بےاثر رہتے - بمبئی محض دوکان‌داروں کی منڈی ہی - مسلمانوں میں وہاں نام کو تعلیم نہیں - جس زمانہ کا یہ ذکر ہی اس وقت تک تمام بمبئی میں ایک گریجواٹ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، اور آج بھی دو چار سے زیادہ نہیں، تاہم اس خاک نے بدرالدین طیب‌جی پیدا کیا جو نیشنل کانگرس کی خطرناک پریسیڈنٹی قبول کرنے سے نہ جھجکا اور جو سرکاری ملازمت یعنی ہائی کورٹ کی ججی کے زمانے میں بھی اپنی آزاد خیالی کو دبا نہ سکتا تھا - اس تاجرانہ منڈی کا دوسرا ممبر رحمت‌اللہ سیانی تھا اور اس نے بھی یہ منصب‌اعظم دلیرانہ حاصل کیا تھا - مدراس میں سید محمد اور کلکتے میں مسٹر امیر علی پالیٹکس میں ہاتھ لگانے سے ڈرتے نہ تھے - لیکن یہ نہایت تعجب‌انگیز بات ہی کہ ممالک مغربی و شمالی اور آگرا و دہلی و پنجاب جو ایک زمانہ میں مرکز حکومت اور ہندوستان کے جسم کا دل و دماغ رہ چکا تھا، جہاں مسلمان نسبۃً ہندوستان کے تمام حصوں کی بہ نسبت زیادہ تعلیم حاصل کرچکے تھے، جہاں عرب و عجم کے بہترین خاندانوں کی یادگاریں موجود تھیں، وہ پالیٹکس سے اس قدر بےحس رہا کہ آج بھی پالیٹکس کا نام لیتا ہی تو زبان لڑکھڑاتی ہی -

اس عجیب اور حیرت انگیز اختلافِ حالت کا سمجھنا آسان نہیں۔ یہ حالت قدرتی اور اصلی نہ تھی، بلکہ پُرزور رکاوٹوں نے پیدا کی تھی۔ وہ پُرزور دست و قلم جس نے ''اسباب بغاوت ہند،، لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ‌مارشل کے ہیبت‌ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑادی تھیں، اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹکلوں میں لکھا کانگرس کا لڑیچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پُرزور لڑیچر نہیں پیدا کرسکتا، وہ جاں‌باز جو آگرے کے دربار سے اس‌لئے برہم ہوکر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں، وہ انصاف پرست جس‌نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا کہ ''میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہیں جن پر ہم واجبی طور سے فخر کرسکتے ہیں اور یہ صرف ان ہی کی بدولت ہے کہ علم اور آزادی اور حب وطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی۔ میں صحیح طور پر کہہ‌سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں۔،، (دیکھو تقریر پریسیڈنٹ، مسلم لیگ، بمقام ناگپور)

حالات اور گردوپیش کے واقعات نے اس کو مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا۔ یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلافِ حالت پیدا کردیا؟ ان سوالات کا جواب دینا آج غیرضروری بلکہ مضر ہے۔

....

علی‌گڈھ نے سیکڑوں، ہزاروں اعلا درجے کے دل و دماغ کی تربیت کی۔ ہزاروں گریجواٹ بنائے۔ کامریڈ کا اڈیٹر، سجاد حیدر جیسا انشاپرداز، اور ظفرعلی‌خاں جیسا دلیر پیدا کیا۔ جو ایسے قابل اشخاص پیدا کرسکتا تھا کیا وہ بدرالدین طیب جی اور علی‌امام نہیں پیدا کرسکتا تھا؟ لیکن جس عضو

سے کام نہیں لیا جاتا وہ بیکار ہوجاتا ہی۔ اس لئے پولیٹکل تعلیم سے محروم رہنے کا یہ لازمی نتیجہ تھا اور یہی ہونا چاہئے تھا۔ ....

سرسید نے مسلمانوں کو نیشنل کانگرس سے روکا تھا لیکن نیشنل کانگرس اور پالیٹکس مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ پالیٹکس کے متعدد اسکول ہیں۔ انگلستان میں لبرل ہیں، کنزرویٹیو ہیں، رڈیکل ہیں، اور یہ سب پولیٹکل فرقے ہیں۔ نیشنل کانگرس پالیٹکس کا ایک خاص اسکول ہی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ خاص اسکول ہمارے لئے مفید نہیں۔ سوال یہ ہی کہ ہم کو مطلقاً پالیٹکس میں پڑنا چاہئے یا نہیں؟ یعنی ہمارے کچھ حقوق گورنمنٹ پر ہیں یا نہیں؟ انتظام حکومت میں ہم کو بھی مداخلت کا حق ہی یا نہیں؟ اور اگر ہی تو ہم کو اس کا مطالبہ کرنا چاہئے یا نہیں؟ سرسید نے مختلف موقعوں پر ملکی اور تعلیمی معاملات میں جس لہجہ میں حقوق کا مطالبہ اور آزادانہ اظہارِ رائے کیا کون اس سے زیادہ کرسکتا ہی؟ لارڈ لٹن نے جب پنجاب میں مشرقی یونیورسٹی قائم کی تو سرسید کو خیال پیدا ہوا کہ اس سے انگریزی تعلیم کا گھٹانا مقصود ہی۔ اس وقت انھوں نے تہذیب الاخلاق (بار دوم) میں تین ایسے پُرجوش آرٹکل لکھے جن میں لارڈ لٹن کی اسکم کی دھجیاں اُڑادیں۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں:

"ہم نہایت سچائی اور گورنمنٹ کی خیرخواہی سے بتانا چاہتے ہیں کہ سمجھدار اور دوراندیش ہندوستانی ان تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ نہایت بد خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا ہی۔ چند سال گذرے کہ ان کو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تعلیم دینا منظور نہیں ہی ...... وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہی کہ اسباب لادکر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اس کو انتظام ملک اور انتظام دفتر

کے لئے چند ایسی پتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں۔

«کچھ عرصہ نہیں گذرا کہ ہندوستانیوں میں سے یہ خیال دور ہوا تھا .... مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبرینِ سلطنت کی پالیسی پھر بدلی ہی اور وہ ہندوستانیوں کو اب اعلا درجہ کی تعلیم دینا مناسب نہیں سمجھتے۔

«ہم پر احسان رکھ کر ہم کو دھوکے میں پھر ڈالا جاتا ہی کہ ہم تمہارے مشرقی علوم اور تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں اور کس مطلب سے؟ اس کا جواب کسی پیرایہ میں دیاجائے اور کیسے ہی میٹھے لفظوں میں دیاجائے، اس کا نتیجہ یہی ہی کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لئے۔

«ہمارے لئے سیدھا ہاتھ کھلا ہوا ہی.......جو فیضِ تعلیم و تربیت ہم نے ان مہذب ملکوں میں حاصل کیا ہی اس کو اپنے ہم‌وطنوں اور ہم‌قوموں میں پھیلائیں۔

«بے‌شک ایسا کرنے میں بہت مشکلات ہیں.....ادھر اپنی فتح‌مند قوم کے ان تنگ دل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت کرنا ہی جو ہماری سوشل اور پولیٹکل حالت کی ترقی کو اپنی طبعی تنگ‌دلی کے برخلاف سمجھتے ہیں... .... مگر ہم‌کو اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہئے اور جو تکالیف اور مشکلات ہم‌کو پیش آئیں نہایت تحمل اور پختہ‌مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں۔»

جب الٰہ‌آباد یونی‌ورسٹی قائم ہورہی تھی اور سرسید کو کھٹکا ہوا کہ اس میں بھی مشرقی تعلیم کو وسعت دی جائے گی تو انہوں نے ایک آرٹکل لکھا

جس کے یہ الفاظ تھے :

„ علومِ مشرقی کا دھوکا دے کر انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کولھو کے بیل کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی سرکل میں پھرائے جاتا ہی اسی طرح ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا بےشک ایک نامہذب گورنمنٹ کا کام ہی -

„ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہئے اور خود اپنے تئیں انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اگر ہم میں سلف رسپکٹ کا کچھ بھی اثر باقی ہی تو گورنمنٹ کو دکھانا چاہئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہی ، مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں۔ “

جو پست ہمت آج سرسید کی پیروی کا دم بھرتے ہیں اور پالیٹکس سے علاحدہ رہنے کے لئے سرسید کے مختص الحالات فقرات پیش کرتے ہیں انھوں نے سرسید کے پولیٹکل شاہنامہ میں سے صرف [1] „منیژہ منم“ یاد رکھا ہی۔

---

[1] شاہ نامہ کا ایک مشہور شعر ہی :

منیژہ منم دخت افراسیاب   برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

ہندوستان کی آزادی اور مسلمان

اس وقت ہی دعا و اجابت کا وقت میر ٭ اک نعرا تو بھی پیشکشِ صبح گاہ کر

جو ہونے والا ہی اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہوچکا ہوگا۔ غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاوں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گرچکی ہوں گی اور وہ سب ہوچکے گا جس کا ہونا ضرور ہی۔ فرض کرلیجئے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئ تو آپ کو معلوم ہی کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے متعلق کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھاجائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لئے ایک روک، ملک کی فلاح کے لئے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دستِ اجانب میں بازیچۂ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گھرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُمنگوں کو پامال کرنے کے لئے ایک پتھر بن کر رہی۔

اس میں لکھاجائے گا کہ ایک قابل رحم مگر مسحور انسانوں کا گلا جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنادیا تھا، جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی، جس میں کوئی انسانی ارادا، کوئی انسانی دماغ، کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا، جو اپنے دماغ سے نہ سوچ سکتی تھی

نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی، نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اُٹھاسکتی تھی۔ ایک معمول جو مسمرائز کے ارادہ پر زندہ ہو، ایک وجودِ شل جو زمین کے لئے بار ہو، ایک درخت جو حرکت کے لئے ہوا کا منتظر ہو، ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دئیے ہل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسانیت کی پیشانی پر ہو........

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی جو آہ! ثم آہ!! کہ "مسلم" تھی، جو اپنے ساتھ انسانی شرف وجلال کی ایک عظیم‌ترین تاریخ رکھتی تھی، جس کو دنیا کی وراثت اور خلافت دی گئی تھی، جو دنیا میں اس لئے بھیجی گئی تھی کہ انسانی استبداد و استعباد کی زنجیروں سے بندگانِ الٰہی کو آزاد کرائے، جو اس لئے بھیجی گئی تھی کہ بیڑیوں کو کاٹے نہ اس لئے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہنے، جو اس لئے آئی تھی کہ تمام ان زنجیرں کو جو خدا کی بندگی کے سوا انسان کی گردنوں میں ہیں ٹکڑے ٹکڑے کردے نہ اس لئے کہ سب سے بھاری زنجیر کو خود ہی اپنی گردن کا زیور بنائے، جو خدا کی نائب اور خلیفہ تھی تاکہ دنیا کو اپنا محکوم بنائے نہ یہ کہ خود محکومی پر ناز کرے، جس کے قدموں پر قوموں کو گرنا تھا تاکہ وہ اُٹھائے نہ کہ وہ خود خاکِ مذلت و غلامی پر لوٹے اور ٹھکرائی جائے۔

جو اس ملت حنیفی کی پیرو تھی جو دنیا میں صرف اس لئے ہی کہ حاکم ہو نہ اس لئے کہ غلام اور مملوک ہو۔ آہ! جو "مسلم" تھی، اور پھر کون سا انسانی شرف باقی رہ گیا ہو جو اس اللہ کے منہ سے نکلے ہوئے خطابِ محبوب و اقدس میں نہیں ہے، جو "مسلم" تھی اور اس لئے قدرتی طور پر اس کا فرض تھا کہ ہندوستان میں وہ سب کچھ کرتی جو اوروں نے کیا

اور جس کو چاہئے تھا کہ ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے پیچھے ہوتیں کیوں کہ اس کے پاس اسلام تھا اور اسلام آگے رہنے کے لئے ہی پیچھے رہنے کے لئے نہیں۔ وہ ایک قوت ہی تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی و جسمانی نجات پائیں، پر وہ کسی کے آگے جھکنے کا محتاج نہیں ہی.......

دماغ سوچنے کے لئے ہی نہ کہ غفلت کے لئے۔ پس تمہارے پاس دماغ ہی تو ای غفلت کو بیداری اور موت کو حیات سمجھنے والو! خدارا مجھ کو بتلاؤ ایسا نہیں ہی تو پھر تمہاری نسبت کیا لکھا جائے گا؟ یقین کرو اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے دل میں ایک سخت اضطراب ہی۔ میری روح بے چین ہی۔ میرے جگر میں ٹیس ہی۔ میرے دل کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہیں اور میرے ہیجانِ افکار کا ساتھ دینے سے قلم عاجز آگیا ہی۔ یہ کیا ہی کہ میں ایک شی کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ تم سب کے پاس بھی آنکھیں ہیں لیکن تم کو نظر نہیں آتا۔ یہ کیا ہی کہ ایک آواز میرے کانوں میں آرہی ہی۔ میں سن رہا ہوں پر تم نہیں سنتے۔ آہ ای لوگو! کہ میں نہیں سمجھتا تم کو کیا کہوں۔ مجھ کو خدارا بتلاؤ کہ کیا یہ سچ نہیں ہی کہ تم دینِ قویم کے پیرو، خطابِ اسلام سے متصف اور امانتِ الٰہی کے حامل ہو؟ یہ سچ ہی تو تم صرف اس لئے ہو تاکہ نڈر ہو، بے خوف ہو، جری ہو، آزاد ہو، خودمختار ہو۔ نہ صرف اتنا ہی کہ خود آزاد ہو بلکہ قوموں کو آزادی بخشنے والے اور ملکوں کو بندِ استبداد سے نجات دلانے والے ہو، اور میں آگے بڑھتا ہوں کہ تم اس لئے ہو تاکہ تم جاں فروش ہو، تاکہ راہِ حق میں سر بکف ہو۔ پھر یہ کیا ہی کہ یہ سب باتیں میں غیروں میں دیکھتا ہوں، لیکن ای بدبختو! تم ان

سے محروم ہو۔ یہ کیا بوالعجبی اور کیا تماشاے عقل‌سوز ہی!

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمۂ و ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ این‌چہ بوالعجبیت!

اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لئے بھی ایک شرف و عظمت کا باب ہوگا تو تم خاموش ہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ‌دوں۔ بےشک ایک باب ہوگا۔ مگر جانتے ہو اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا۔ ہندوؤں نے اس کے لئے سروں کو ہتھیلی پر رکھا، مگر مسلمان غاروں کے اندر چُھپ گئے۔ انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منھ اور زبان پر قفل چڑھادئے۔ ملک غیرمنصفانہ قوانین کا شاکی تھا۔ ہندوؤں نے اس کے لئے جہاد شروع کیا، پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ چپ رہی بلکہ مجنونانہ چیخ اٹھی کہ تمام جہاد کرنے والے باغی ہیں۔

ملک کہ ایک خاص زرعی ملک تھا، اس کے کاشت‌کار تباہ و برباد ہورہے تھے۔ ملک کی دولت انگلستان کے معدے میں بھری جارہی تھی اور اس طرح ہضم ہوجاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد پھر ھل من مزید کا نعرا سنائی دیتا تھا۔ ریلوے کی توسیع کےلئے انگلستان کو ٹھیکے دئے جارہے تھے تاکہ وہ دولت جذب کرے۔ مگر آب‌پاشی کےلئے روپیہ نہ تھا کہ ہندوستان کی زمین اپنی دولت اُگلے۔ زبان سے اقرار کیا جاتا تھا کہ تم وفادار ہو، مگر اسلحہ کو چھوگے کی اجازت نہ تھی کہ تم غدار ہو۔ ملک کی تمام دولت ستر ہزار سرخ‌رنگ سپاہیوں کو سونا اور چاندی کھلاکر لٹائی جارہی تھی، مگر ملک کیے فاقا مست کالے تعلیم اور حفظان صحت کے انتظام سے محروم

تھے۔ نمک بھی ملتا تھا تو محصول دے کر اور تعلیم بھی ملتی تھی تو گھربار بیچ کر۔ پھر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے محبت کے لہجہ میں وعدہ کیا گیا کہ تمیزِ رنگ و زبان اور امتیازِ حاکم و محکوم کا یہاں سوال نہیں اور جو راہ اپنے لئے باز ہے وہی سب کی آمد کی منتظر۔ لیکن جب پاؤں اُٹھے اور ہاتھوں نے حرکت کی تو تمام دروازے بند تھے اور امتیازِ حاکم و محکوم کے نشے سے ہر انگلستان کی مٹی کا پُتلا مخمور۔

یہ اور ایسے ہی حالات تھے جن میں ملک مبتلا تھا۔ ہندو اٹھے اور انہوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لئے وقف کردیا۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ سب کچھ کررہے تھے مسلمانوں نے نہ صرف اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑے بلکہ چاہا کہ جن کے ہاتھ پاؤں ہیں ان کو بھی اپنا سا لولا لنگڑا بنادیں۔ جب کہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش لئے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں ایک جادو کا منتر پھونک دیا گیا تھا "ابھی وقت نہیں آیا ہے"، اور یہ اسی میں مسحور تھے۔ ایک الف لیلا کا عفریت تھا جس نے جادو کے زور سے ان کو پتھر کی چٹان بنادیا تھا۔ پس یہ ملک کی ترقی کی راہ میں روک بن کر پڑے تھے۔

اس کے بعد وہ آنے والا مورخ جو ہندوستان کا وقائع نگار ہوگا لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا۔ برٹش گورنمنٹ ایک کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ تھی، چنگیزخاں کا تختِ قہر نہ تھا۔ پس ملک آزاد ہوا اور انگلستان نے اپنا فرض ادا کردیا۔ لیکن دنیا یاد رکھے گی کہ جو کچھ ہوا اس قوم کے سرفروشوں سے ہوا جو مسلم نہ تھی۔ پر جو مسلم تھے

انھوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی اور سربلندی کی جگہ سجدۂ ذلت کی کوشش کی۔ ہندوستان کی ملکی نجات یقیناً ایک عظمت و عزت کی یادگار ہی لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر ملک کے قوانین کی ترمیم ہوئی، نئے مفید قوانین بنائے گئے، بربادکن محصولوں اور ٹیکسوں سے انسانوں نے نجات پائی، تعلیم جبری اور عام ہوئی، فوجی مصارف میں تخفیف ہوئی اور سب سے آخر یہ کہ ملک کو حکومت خود اختیاری ملی تو صرف ہندوؤں، قابلِ عزت ہندوؤں، مسلمانوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہندوؤں کی وجہ سے، کیوں‌کہ انھوں نے پالیٹکس کو شروع کیا اور پھر پالیٹکس اسی کو سمجھا، مگر مسلمانوں نے اس‌کو معصیت سمجھ‌کر کنارہ‌کشی کی اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں یا اس کے آگے بھیک مانگنے کےلئے روئیں اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں، چاندی سونا نہیں، لعل و جواہر نہیں بلکہ تانبے کا زنگ‌آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے۔

....

غفلت و سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہوچکیں۔ اب خدا کے لئے بستر مدہوشی سے سر اٹھاکر دیکھئے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہر؟ آپ کے ہم‌سفر کہاں پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟ یہ نہ بھولئے کہ آپ اور کوئی نہیں بلکہ مسلم ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے آج بہت سے مطالبات رکھتی ہی۔ کب‌تک اس دین الٰہی کو اپنے اعمال سے شرمندۂ عالم کیجئے گا؟ کب تک دنیا کو اپنے اوپر ہنسائے گا اور خود نہ روئے گا؟ اور کب‌تک ہندوستان میں اسلام کی قوت کا خانا خالی رہےگا؟ اگر مصائب کا تازیانا غفلت کی ہشیاری کا ذریعہ ہی تو کون سے مصائب ہیں جن کا آپ پر نزول نہیں ہوچکا ہی؟

یاد رکھئے کہ ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا داخلِ حُب الوطنی ہے، مگر آپ کے لئے ایک فرضِ دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند استبداد وغلامی کے توڑنے کے لئے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی آزادی کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کررہے ہیں یقین کیجئے وہ بھی مجاہدین ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف جس کے لئے دراصل سب سے پہلے آپ کو اٹھنا تھا۔ پس اُٹھ کھڑے ہو کہ خدا اب تم کو اُٹھانا چاہتا ہے اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں بیدار ہوں اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں۔ ہندوستان میں تم نے کچھ نہیں کیا حالانکہ اب تمہارا خدا چاہتا ہے کہ یہاں بھی وہ سب کچھ کرو جو تم کو ہر جگہ کرنا ہے۔

سید سلیمان ندوی

مشہد اکبر[1]

ادرنا کا دردناک نظارا کان پور میں

[کان پور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد برسرِ راہ تھی۔ شہر کی میونسپلٹی وہاں سے ایک سڑک نکالنا چاہتی تھی۔ چون کہ مسجد کا وضوخانہ بیچ میں آرہا

---

[1] یہ مضمون الہلال میں شائع ہوا تھا اور اس کی اشاعت پر اخبار کی ضمانت ضبط ہوگئی تھی۔ ابوالکلام آزاد ان دنوں کان پور میں تھے اور انھوں نے سید سلیمان ندوی کو اس کامیاب مضمون پر مبارک باد کا تار دیا تھا۔

تھا اس لئے وہاں کے مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی۔
لیکن صوبے کے گورنر جیمز مسٹن نے میونسپلٹی کی
حمایت کی اور مسجد کا وہ حصہ ڈھا دیا گیا۔
مسلمانوں نے ایک بڑا احتجاجی جلسا کیا جس میں
یہ طی پایا کہ مسجد کی منہدم دیوار کو ابھی ابھی
پھر کھڑا کردیا جائے۔ جس وقت مسلمان دیوار پر
اینٹیں چن رہے تھے ڈپٹی کمشنر نے ان پر حملہ کا
حکم دیا اور ان پر گولیاں برسنے لگیں۔ یہ واقعہ
ٹھیک اس وقت کا ہی جب بلقان اور ترکی کی جنگ
جاری تھی اور ہندرستانی مسلمان برطانیا کی بیرونی
پالیسی سے سخت مشتعل تھے۔ بظاہر یہ ایک مسجد
کا واقعہ ہی لیکن حقیقت میں اس کی تہ میں حرّیت اور
انگریز دشمنی کا جذبہ کام کررہا تھا اور یہ
"مسلمانانِ ہند کی سیاسی جد و جہد اور آزادی پرستی
کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی" ہی۔ ذیل کا
مضمون اسی ہنگامۂ خونیں کی یادگار ہی۔]

زمین پیاسی ہی۔ اس کو خون چاہئے۔ لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا۔ طرابلس
کی زمین کس کے خون سے سیراب ہی؟ مسلمانوں کے۔ مغرب اقصا کس کے
خون سے رنگین ہی؟ مسلمانوں کے۔ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں
کی۔ سرزمینِ بلقان میں کس کا خون بہتا ہی؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین
بھی پیاسی ہی۔ خون چاہتی ہی۔ کس کا؟ مسلمانوں کا۔ آخرکار سرزمینِ کانپور پر
خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش و خروش میں ہی۔ اپنی قربان گاہ کے لئے نذر
مانگتی ہی۔ کون ہی ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے؟ صوبۂ متحدہ

کا بادشاہ (سرجیمزمسٹن) بالآخر آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمان) کا خون پیش کیا جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔

....

برٹش حکومت کہتی ہی کہ رعایا کے مذہب کا احترام ہوگا۔ لیکن کیا وہ احترام اس سے بھی کم ہوگا جتنا ایک سڑک کے سیدھے ہونے کا؟ حکومت کہتی ہی کہ رعایا کے خون کا احترام ہوگا۔ لیکن کیا اس سے بھی کم جتنا ایک راستے کی زینت و آرائش کا؟

اگست کی صبح انقلاب حکومتِ برطانیا کی تاریخ ہی۔ بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف و ناتواں و غیر مسلح مجمع پر گولی برسارہے تھے، انہیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانوی عدل و انصاف کو زخمی کررہی ہیں؟ انہیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانا اس ستون کو کمزور کررہا ہی جس پر حکومتِ برطانیا کی عمارت قائم ہی؟ وہ مسرور ہیں کہ ہم وفاداری کی خدمت ادا کرتے ہیں۔ نادانو! تم تو اس سے عداوت کررہے ہو جس کی محبت کا اظہار چاہتے ہو۔ وہ کیا عجیب منظر تھا جب کربلائے کان پور میں کئی ہزار بے دست وپا برطانوی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، باچشمِ نم و بادلِ پُرغم، ایک سیاہ عَلم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بے کسی کا نشان تھا کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقتِ تعمیرِ کعبہ ابراہیم و اسماعیل کی زبان پر جاری تھی۔

یہ پُراثر مقدس نظارا ختم نہیں ہوا تھا کہ مجسٹریٹ کان پور کی سپہ سالاری میں مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہوتی ہی اور دس

منٹ تک اپنی بندوقوں سے اُڑا اُڑا کر ایک گولیوں کی چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہی۔ پردا جب چاک ہوتا ہی میدان میں خاک وخون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں جن میں بعض معصوم جانیں بھی ہیں جو افسوس دم توڑچکیں۔

گورنمنٹ کا فرشتۂ غیب ہم کو اطلاع دیتا ہی کہ میدان میں چودہ لاشیں تھیں۔ پھر بتاتا ہی اٹھارہ لاشیں تھیں۔ عقیدت مند دل اس کو تسلیم کرتا ہی۔ لیکن عقلِ حجت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ ایک تنگ میدان میں دس پندرہ ہزار آدمیوں کا مجمع ہی۔ پُلیس بےمحابا دس منٹ تک بےپروائی سے ان پر گولیاں برساتی ہی۔ ہر گولی ایک دور کے فاصلے تک پھیلتی ہی اور صرف ۱۸ لاشیں ان کے صدمے سے گرپڑتی ہیں۔ مسلمان اپنی روئیں‌تنی کا دعوا کرتے ہیں۔ ان کو مسرور ہونا چاہئے کہ گورنمنٹ پرس بھی ان کے اس اعجاز کو تسلیم کرتا ہی۔

حکومت قانون کے ماتحت ہی لیکن افسوس! ہم زبان کے ماتحت ہیں۔ ہم پر گورنمنٹ کا قانون حکومت نہیں کرتا۔ ہم پر حکام کی زبان حکومت کرتی ہی۔ ایک ضعیف و کم‌زور مجمع جس کے ہاتھ میں کوئی آلۂ ضرر نہیں، جو کسی انسان کا محترم خون نہیں گراتا، جو کسی کی جائداد وعزت پر حملہ نہیں کرتا تھا لیکن اس کی تادیب کے لئے عدالت کے کمرے اور قیدخانوں کی کوٹھریاں تھیں، سنگین کی نوکیں اور بندقوں کی گولیاں تھیں۔ برٹش مورخ ہم کو بتاسکتا ہی کہ برسٹل اور مانچسٹر کے کتنے ہنگاموں میں ان آتش‌بار ہتھیاروں سے کام لیاگیا ہی؟ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم کو حوالہ دےگا کہ برسٹل اور کان‌پور میں کتنی مسافت ہی۔ لیکن ای معصوم مورخ! برائے خدا ہمیں بتانا کہ برسٹل اور کان‌پور کی ذی روح حقیقتوں میں کتنا فصل ہی؟

نصرانی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہی کہ عورتوں میں روح نہیں،

لیکن ای مقدس نصرانی! پیغمبرِ ناصرا کے لئے بتانا کہ تیرا یہ اعتقاد ہی کہ مسلمانوں میں روح نہیں؟ ہاں روح ہی لیکن تو نے ان کو بےجان کردیا۔ کیا تجھ کو شریعت کا یہ حکم یاد نہ رہا کہ "تو خون مت کر۔"

سر جیمز مسٹن کی سرکاری اطلاع کہتی ہی کہ معاملۂ انہدامِ مسجد کےلئے مسلمانان کان‌پور میں کوئی جوش نہیں۔ صرف بیرونی مسلمانوں کا جوش ہی........ واقعہ قتل عام سے پہلے بھی یہ غلط تھا کہ اگر یہ سچ تھا تو مسلح سپاہی وقتِ انہدام مسجد کو کیوں گھیرے تھے؟ سنگینوں اور بندوقوں کے ہیبت‌ناک نظاروں سے کن کو ڈرایا جارہا تھا؟ اور اب تو حکومتِ متحدہ کو خود نظر آرہا ہوگا کہ لوازمِ تدبّر و سیاست سے اس کا خزینۂ حکمت کس قدر تہی تھا۔

سر جیمز مسٹن کی سرکاری اطلاع کی شہادت ہی کہ مسلمانانِ کان‌پور کا جوش جرائدِ اسلامیہ کی برافروختگی اور طعن و تشنیع و ملامت کا نتیجہ ہی۔ لیکن وہ کون تھا جس نے مسلمانوں کو طعنہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے جوش‌وغیرت کی حقیقت صرف چند الفاظ ہیں؟ صوبے کا نیم‌سرکاری اخبار «پانیر»۔ اور پھر کون تھا جس نے مسلمانوں کو کہا تھا کہ ان کی غیرت و حمیت کی جولاں‌گاہ صرف قلم کا میدان ہی؟ شہنشاہیِ انگلستان کی نیم سرکاری زبان ٹائمز۔

سر جیمز مسٹن نے قصداً مسلمانوں کو چھیڑا اور ان کے اس جوش اور ولولۂ اسلامی کو جھوٹا کہا جو تیرہ سو برس سے جھوٹا نہ ہوا تھا۔ انھوں نے ان زیرِ خاک انگاروں کو راکھ کا ڈھیر سمجھا جو تیرہ سو برس سے اسی طرح روشن ہی۔ سر جیمز مسٹن کے یقین کےلئے دلیل چاہئے تھی۔ فرزندانِ اسلام بڑھے اور انھوں نے مقتلِ عام میں جاکر جسمانی پردا جو فرماں‌روائے صوبا کے سامنے حائل تھا، الٹ دیا اور دنیا کو نظر آگیا کہ درحقیقت اس

پردے کے پیچھے سرخ انگارے تھے جو خود دوسروں کو نہ پھونک سکے پر خود کو پھونک دیا۔

سر جیمز مسٹن اب کیا چاہتے ہیں؟ کیا دعوائے سابق کے یقین کے لئے کسی اور دلیل کے طالب ہیں؟ اگر حقیقت میں ان کی طلب صادق ہی اور ان کی کوشش کامل ہی تو ہم بتاتے ہیں کہ ان آہنی زنجیروں میں بھی آگ ہی جو اسیرانِ مدافعت ملّی کے ہاتھوں اور گردنوں میں ہیں۔ انھیں خبردار رہنا چاہئے کہ زنجیروں کی آہنی جسمانیت دوسری آہنی جسمانیت سے ٹکراکر شعلہ نہ پیدا کرے۔

صوبۂ متحدہ کا طرزِ حکرمت اسی وقت ایک خونیں منظر کا اشارا کررہا تھا جب اس کا فرماں‌روا ایک طرف اسٹریچی ہال (علی‌گڈھ) میں اور دوسری طرف مقامی دربار (گورکھپور) میں ایک اسپیکر کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ «بہ‌زور اس جوش کو فرو کروں‌گا۔» آخر ۳ اگست کو اس وقت جب وہ بریلی میں تھا اور ایک مسلمان ریاست (رام‌پور) اس‌کا خیرمقدم کررہی تھی اس نے بہ‌زور اس جوش کو فرو کردیا۔

ہمیں اس کا خوف نہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حریت کی کوشش میں مقتول و مجروح ہوئے کہ یہ ان کی خصوصیت ملّی ہی۔ ایک ہزار تین سو برس ہوئے کہ وہ مسجدِ خلیل کی بقائے حرمت کےلئے سربکف ہیں۔ لیکن اس‌کا خوف ہی کہ حکومتِ متحدہ جن غیرقانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کررہی تھی اس سے وہ خود تو مجروح نہیں ہوگئی؟

....

مقتولینِ کان‌پور! تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم مغفور تھے۔ ہم

گنہگار تمہاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے! لیکن سنا ہو کہ تم کو کفن نہ ملا۔ گولیوں اور بندوقوں کی قطع وبرید کے بعد تمہارے جسم اسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے۔ غزوۂ بنی الحیان میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اُٹھالی تھیں۔ ہم آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اگر اخفائے راز کے لئے پُلیس نے تمہاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں نہیں دفن کیں تو یقیناً تمہاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھالیا کہ رضوان الٰہی ان کا منتظر تھا۔

مجروحینِ کان پور! تم نے گولیاں کھائی ہیں۔ نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیاگیا ہو۔ تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں۔ تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیاگیا ہو۔ تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا جس کے بعد بنواُمیّہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا۔

معصوم بچو اور ریاض اسلام کے نودمیدہ غنچو! تمہیں کس نے مرجھا دیا؟ سر جیمز مسٹن کے الفاظِ طعن نے تمہارے بےگناہ و ناآشنائے جرم دلوں کو مضطرب کردیا۔ تم بڑھے کہ اپنے دہنِ زخم سے اس الزام کی تکذیب کرو۔ ای طائرانِ قدس! اُڑجاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمہاری منتظر ہیں۔

اخبار عام (لاہور)

اعلانِ بیداری[1]

ای ساکنان خطۂ ہندوستاں! بڑھو!!
آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں، بڑھو!

---

[1] یہ نظم اخبارعام میں ۱۰ مارچ ۱۸۸۳ء کو چھپی تھی۔

تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو
کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو!

بیٹھے ہو پاؤں توڑ کے کیوں کنجِ غم میں تم؟
دیکھو ذرا نشیب و فرازِ جہاں، بڑھو!

ہم لوگ تم میں ہیں کہ جرس کارواں میں ہی
چِلّا رہا ہی طوطیِ ہندوستاں، بڑھو!

[۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا۔ ترکوں اور عربوں نے متحد ہوکر اٹلی کا مقابلہ شروع کیا۔ ساری دنیاے اسلام میں یورپ کے خلاف نفرت و بیزاری کی لہر دوڑگئی۔ ہندوستان «اس زمانہ میں جوش و خروش کا طوفان خیز سمندر بن گیا تھا»۔ ابھی یہ مصیبت ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سنہ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی ریاستوں نے ٹرکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کردیا۔ چونکہ اس کے پیچھے انگریزوں کا ہاتھ تھا اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے بیزاری کا جذبہ پیدا ہوا اور آزادی اور حریت کی تحریک لہریں لینے لگی۔ ہندو عوام نے بھی یہ محسوس کیا کہ سامراجی حکومتوں کا مشرقی ممالک پر قبضہ ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو اور زیادہ مضبوط کردے گا۔ ہندوستان کے مسلمان مجموعی حیثیت سے اب تک سیاست سے بچتے رہے تھے، لیکن جنگ بلقان نے آخر انھیں متاثر کیا اور وہ برطانوی سامراج کے مقابلہ کے لئے میدان میں اُتر آئے۔ اکبر جیسا شاعر جس نے ہمیشہ «احتیاط» کو

ملحوظ رکھا اور طنز کے پردہ میں باتیں کیں کھلم کھلا پکار اٹھا

بحمدللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہی

اور بلقانیوں کی شکست پر اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کیا:

بہت کیں سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر
بالآخر چرخ ان کے سر کو زیرِ سنگ لایا ہی

ذیل کی نظمیں اسی پُرآشوب زمانہ کی یادگار ہیں اور مسلمانوں کے جذبات کی اچھی ترجمانی کرتی ہیں۔]

حسرت موہانی

بیداریٔ اسلام

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہی
اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبر میں ہی

جورِ یورپ ہی بنا بیداریٔ اسلام کی
خیر ہی دراصل یہ باآنکہ شکلِ شر میں ہی

خاطرِ افسردہ میں باقی ہی اب تک یادِ عشق
گرمیٔ آتش ہنوز اس مشتِ خاکستر میں ہی

قلتِ افواج ٹرکی پر نہ ہو اٹلی دلیر
ایک ہی سو کے لئے کافی جو اس لشکر میں ہی

اب خدا چاہے تو حسرت جلد ہوتا ہی بلند
رایتِ حریت و حق جو کفِ انور میں ہی

حضور رسالت مآب میں

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیود شام و سحر میں بسر تو کی لیکن نظام کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا

فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

کہا حضور نے ای عندلیبِ باغ حجاز! کلی کلی ہی تری گرمیٔ نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوشِ جام و لا ہی دل تیرا فتادگی ہی تری غیرت سجود و نیاز
اُڑا جو پستیٔ دنیا سے تو سرِ گردوں سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعت پرواز

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہی وہ زندگی نہیں ملتی
ہزار لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینا لایا ہوں جو چیز اس میں ہی جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہی تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہی لہو اس میں

شہر آشوبِ اسلام[1]

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی، دھجیاں کب تک

مراکش جاچکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہی
کہ جیتا ہی یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہی
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لَے جن کو بھاتی ہی
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ ای تہذیبِ انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تاکے، یہ حشر انگزیاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہی
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

---

[1] ,,یہ نظم مولانا (شبلی) نے لکھنو کے ایک عام جلسے میں جو ٹرکی کی فراہمیٔ چندا کے لئے ہوا تھا پڑھی۔ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہی۔،، (حیات شبلی ص۔ ۵۹۲)

نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خونچکاں کب تک

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہی
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوا ہی فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہی افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہی
عزیزو، فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اُٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اُڑکر یہ دامانِ حرم کو بھی نہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلیؔ اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

حسرت موہانی

تقاضائے غیرت

غضب ہی کہ پابندِ اغیار ہوکر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہوکر

سمجھتے ہیں سب اہلِ مغرب کی چالیں
مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بے کار ہوکر

اُٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہوکر

تقاضائے غیرت یہی ہی عزیزو،
کہ ہم بھی رہیں ان سے بے زار ہوکر

ابھی ہم کو سمجھے نہیں اہلِ مغرب
بتادو انہیں گرم پیکار ہوکر

فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی
نکل آؤ بے رحم و خوں خوار ہوکر

کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہوکر

وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرتؔ
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہوکر

چل، بلقان چل

تا بہ کے رُخ زرد، آنکھیں خوں چکاں، دل مضمحل
تا بہ کے سازِ جنوں مشتاقِ آہنگِ عمل
دعوئے ایمان رکھتا ہی تو ای مومن نکل
شمۂ غیرت کا ہی گر باقی تو چل، بلقان چل

جان سے لاکھوں گنی مہنگی ہی تیری آبرو
ہو فنا، گر ہی بقاے جاوداں کی آرزو
سوگواری ہاے ظاہر کی نہ کر تلقین تو
شمۂ غیرت کا ہی گر باقی تو چل، بلقان چل

چھوڑ دے بےروح لوگوں کے لئے یہ اعتدال
موت حاصل کر کہ جو اس زندگی کا ہی مآل
مشکلیں کس کی؟ کہاں کی روک اور کیسا مآل؟
لطف مرنے کا اگر چاہیے تو چل، بلقان چل

تا کجا یکساں روی اب سن پیامِ انقلاب
چھوڑ بےرنگی سکوں کی، ہو رہینِ اضطراب
وہ بھی کیا مرنا کہ خود فطرت تجھے دیدے جواب
لطف مرنے کا اگر چاہیے تو چل، بلقان چل

بس اب ہی آج سے آغاز میری کارفرمائی

بہت سمجھا کیا میں صبر و خاموشی کو دانائی
بہت کہتا رہا کچھ کر نہ سکنے کو شکیبائی

بہت دن ذلتوں کو مصلحت جانا کیا لیکن
بس اب ای ہم‌نشیں! میری طبیعت جوش پر آئی

بھڑک ہی نبض میں پیدا، تڑپ ہی قلب سے ظاہر
نفس میں سانپ کی پھنکار ہی، بھوبل کی گرمائی

لہو غیظ و غضب کا آنکھ کی رگ رگ سے بہہ نکلا
گرا جب خاک پر کٹ کر مرا عثمانوی بھائی

کلیجے پر لگا گھونسا، جگر پر چل گئے آرے
بجوشِ سیل موجِ خوں مرے سینے سے ٹکرائی

تبِ غیرت کی آتش میرے احشا میں بھڑک اُٹھی
سحابِ خوابِ ذلت پھٹ گیا یوں جس طرح کائی

مرے ہر سانس سے اِک انقلابِ حریت اُٹھا
مرے اِک ایک روئیں نے حمیت کی قسم کھائی

یک ہیجانِ خوں پارا ہوا ملبوسِ نامردی
مجھے خود اعتمادی نے پہنایا تاجِ دارائی

بس اب میں اپنے ملکِ نفس کا سلطانِ مطلق ہوں
بس اب ہی آج سے آغاز میری کارفرمائی

کہ ہم نے انقلابِ چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

[محمد علی مرحوم کی کوشش سے بلقان کی لڑائی میں ہندوستان سے ایک طبی وفد بھیجا گیا تھا جس کے رہبر ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم تھے۔ اس وفد کے سارے اخراجات ہندوستان کے مسلمانوں نے برداشت کیے۔ جنگ ختم ہونے پر جب یہ وفد ہندوستان واپس آیا تو شبلی نے اپنے جذباتِ محبت کا اظہار ایک نظم میں کیا۔ ذیل کے اشعار اسی نظم سے لئے گئے ہیں۔]

تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سُنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے
زنانِ بےنوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلادینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں

مسلمانوں کے قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے اُمید گلیڈ سٹوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں نے غازیوں کے جسم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامۂ پُر خوں بھی دیکھے ہیں

تمہاری چشم عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہی
کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں

لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسار شہیداں پر
زمیں پر پارہ‌ہائے سینۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی
شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں سے کچھ پتا ملتا ہی شیدایان ملت کا
کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلی اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

سہارا ہی اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رمِوز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہی یہ بیڑا غرق ہوکر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلابِ چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

دعاے کہنہ سالاں ہی اگر مقبول یزدانی
تو اب دستِ دعا ہی اور یہ شبلیؔ نعمانی

ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں[1]

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہی کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہی، منتظرِ نفخِ صور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بے خبرِ نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں

اُٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہی بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہی مگر ہم ضرور ہیں

سینے پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
از بسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں

ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوق دلِ ناصبور ہیں

کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

علمائے زندانی

پہنائی جارہی ہیں علمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہی

یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوے قاتل سے شکایت ہی

[1] یہ نظم اور اس کے بعد کی چار اور نظمیں کان پور کے اسی ہنگامۂ خونیں کی یادگار ہیں جس کا ذکر حصۂ نثر میں مشھد اکبر کے سلسلہ میں کیا گیا۔

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہی

عجب کیا ہی جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سوجانے کی عادت ہی

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہی

شبلی

آپ ظالم نہیں زنہار یہ ہم ہیں مظلوم

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہی انکار
کہ ہر اک شہر میں ہی آپ کے انصاف کی دھوم

یہ بھی تسلیم ہی ہم کو کہ یہ جو کچھ کہ ہوا
اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم

آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
فیر کا حکم دیا آپ نے جب بھرِ ہجوم

یہ حقیقت بھی مگر قابلِ انکار نہیں
کہ بہ یک چشم زدن موت کو تھا اذنِ عموم

گولیاں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ حسیں
سب یہ کہتے تھے "قیامت ہی کہ جھڑتے ہیں نجوم"

گولیوں کے تھے نشاں منبر و محراب پہ بھی
بسکہ درکار ہی مسجد کے لئے نقش و رسوم

جا بہ جا خون سے مسجد ہی نگاریں اب تک
یہ وہ صنعت ہی کہ تاحشر نہ ہوگی معدوم

پا بہ زنجیر تھے مجرم بھی تماشائی بھی
اور پُلیس کو یہ تھا عذر کہ "ہم ہیں محکوم"

واقعہ یہ ہی غرض، کوئی نہ مانے نہ سہی
"آپ ظالم نہیں زنہار، پہ ہم ہیں مظلوم"

شبلی

خون کے چند قطرے

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہی اب باقی　　اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہی
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں　　کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہی

شبلی

گنج ہاے گراں مایہ

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم　　کیوں گھٹ رہی ہی آج عدد میں ظہور میں
سن لو وہ گنج ہاے گراں مایہ دفن ہیں　　کچھ بیلقاں کی خاک میں، کچھ کانپور میں

بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہو نہ دلّی نہ بخارا

جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہو، وہ صحرا بھی ہمارا

غیرت ہو بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہو درویش کو تاجِ سرِ دارا

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدا ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

افراد کے ہاتھوں میں ہو اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہو ملت کے مقدر کا ستارا

محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا

اقبال

سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الملُوک
سلطنت اقوام غالب کی ہو اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہو ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہو اس کو حکمراں کی ساحری

جادوے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہو حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

خون اسرائیل آجاتا ہو آخر جوش میں
توڑ دیتا ہو کوئی موسا طلسم سامری

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بےہمتا کو ہو
حکمراں ہو اک وہی، باقی بتانِ آذری

از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجہای از برہمن کافرتری

ہو وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نواے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پاے کوب
تو سمجھتا ہو یہ آزادی کی ہو نیلم پری

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طب مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار، اعضائے مجالس الاماں! یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہی جنگ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہی تو
آہ! ای ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہی تو

اقبال

شعاعِ اُمید

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام دنیا ہی عجب چیز، کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارا ہو پہنائے فضا میں بڑھتی ہی چلی جاتی ہی بے مہریٔ ایام
نی ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہی راحت نی مثل صبا طوف گل و لالہ میں آرام

پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

آفاق کے ہر گوشہ سے اُٹھتی ہیں شعاعیں بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہی مغرب میں اُجالا نہیں ممکن افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہی سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذت نظارا سے محروم لیکن صفت عالم لاہوت ہی خاموش

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
ای مہر جہاں تاب، نہ کر ہم کو فراموش

اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اِک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو جبتک نہ اُٹھیں خواب سے مردان گراں خواب

خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہی مرکز　　اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہو سیراب

چشم مہ و پرویں ہو اسی خاک سے روشن　　یہ خاک کہ ہی جس کا خزف ریزہ دُرناب

اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غواص معانی　　جن کے لئے ہر بحر پُرآشوب ہی پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں　　محفل کا وہی ساز ہی بیگانۂ مضراب

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہی برہمن　　تقدیر کو روتا ہی مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بےزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہی کہ ہر شب کو سحر کر

تیسرا حصہ

۱۔ پہلی جنگ عظیم اور اس کے نتائج
۲۔ تحریک خلافت وترک موالات
۳۔ بیداریٔ عوام

١۔ پہلی جنگ عظیم اور اس دے نتائج

[۱۹۱۴ع میں انگلستان اور جرمنی میں جنگ چھڑ گئی۔ ہندوستانی انگریزوں کے تمام جبر و تشدد کو بھلا کر ان کی اعانت پر آمادا ہوگئے۔ لیکن ان کے مطالبات اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے، یہاں تک کہ ۱۹۱۵ع کے اجلاسِ کانگرس میں حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا گیا۔ جب ترکی اور برطانیا کے درمیان اعلان جنگ ہوا تو مسلمانوں میں بڑی بےچینی پھیل گئی اور پرس ایکٹ کے تحت کامریڈ، الہلال، ہمدرد وغیرہ کی ضمانتیں ضبط کرلی گئیں۔ تحفظِ ہند کا قانون نافذ کیا گیا اور بہت سے مسلمان لیڈروں کو قید اور نظربند کردیاگیا۔ لیکن ان تمام باتوں کا ردِعمل یہ تھا کہ ہندوستانیوں کا احساسِ قومیت تیزتر ہوتاگیا۔ ۱۹۱۶ع میں مسز اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ کی بنیاد ڈالی اور تمام سیاسی جماعتوں کو متحد کردیا۔ اُسی سال مسلم لیگ کے اجلاسِ لکھنؤ میں سوراج کامل کی تجویز پاس ہوئی۔ ۱۹۱۷ع میں وزیر ہند مانٹیگو نے ایک اہم اعلان شائع کیا جس کے ذریعہ ہندوستانیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ حکومت خوداختیاری دی جائے گی۔ مانٹیگو بذات خود ہندوستان آئے اور ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کی مدد سے ایک رپورٹ مرتب کی۔ ۱۹۱۹ع میں مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم نے قانون کی شکل اختیار کی۔ لیکن چون‌کہ اس قانون کی رو سے ہندوستان کو برائے نام حقوق مل رہے تھے اس لئے کانگرس نے ان اصلاحات کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔

۱۹۱۸ع میں جنگ ختم ہوگئی۔ ہندوستانیوں کو ان کی 'وفاداری' کے صلہ میں 'رولٹ بل' ملا، یعنی ان کی غلامی کی زنجیروں کو سخت‌تر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس ''سیاہ قانون'' کی سخت مخالفت ہوئی لیکن حکومت نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ اس سلسلہ کا سب سے الم ناک سانحہ جلیان‌والا باغ کا حادثہ ہے۔]

جنگِ عظیم

انسان کی سوئی ہوئی درندگی اور بہیمیت پھر جاگ اٹھی ہے۔ وہ اشرف المخلوقات کہ صورت سے آدمی مگر خواہشوں میں بھیڑیا، محل سراؤں میں متمدن انسان مگر میدانوں میں جنگلی درندہ، اب اپنی خوں ریزی کی انتہائی شکل اور اپنی مردم خواری کے سب سے زیادہ بُرے وقت میں آگیا ہے۔ وہ کل تک اپنے کتابوں کے گھروں اور علم و تہذیب کے دارالعلوموں میں انسان تھا۔ پر آج چیتے کی کھال اس کے چمڑے کی نرمی سے زیادہ حسین اور بھیڑئیے کے پنجے اس کے دندان تبسم سے زیادہ نیک ہیں۔ درندوں کے بھٹ اور سانپوں کے جنگلوں میں امن و راحت ملے گی۔ مگر اب انسانوں کی بستیاں، اولادِ آدم کی آبادیاں راحت کی سانس اور امن کے تنفس سے خالی ہوگئی ہیں۔

شیر خوں خوار ہے مگر غیروں کے لئے۔ سانپ زہریلا ہے مگر دوسروں کے لئے۔ چیتا درندہ ہے مگر اپنے سے کم تر جانوروں کے لئے۔ لیکن انسان، دنیا کی اعلاترین مخلوق، خود اپنے ہی ہم جنسوں کا خون بہاتا ہے اور اپنے ہی ابنائے نوع کے لئے درندہ و خوں خوار ہے۔

یہ دنیا کی مغرور فتح مند طاقتوں کی ٹکر ہے اور اتنی بڑی انسانی درندوں کی لڑائی کہ اتنے بڑے خوں خوار اسباع وبہائم آج تک کرۂ ارضی پر پیدا نہیں ہوئے۔ دنیا نے ٹیٹس کے قصے سنے ہوں گے جس نے یروشلم کو تباہ کردیا۔ دنیا نے بخت نصر کو دیکھا ہے جو بنی اسرائیل کو گرفتار کرکے بابل لے گیا۔ دنیا میں ایرانیوں کے قہر و استیلا کے افسانے سنے گئے ہیں جنھوں نے بابل کو مسمار کردیا تھا۔ اور رومیوں کے عہد تسلط و عروج کے ایسے

بہت سے فاتح خوں‌ریزوں کی روایتیں محفوظ رکھی گئی ہیں جنھوں نے خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق کو بہت ستایا اور اس کی زمین پر بہت فساد کیا۔ لیکن خون بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں، آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے اور موت و ہلاکت پھیلانے کی ایسی شدید ابلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ زمین کی پشت پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدروں نے پھنکاریں ماریں۔ مگر نہ تو ایسی درندگی آج تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہی اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا جیسے کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے، نگلنے اور چیرنے پھاڑنے کے لئے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں۔ پھر اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہی۔ اس ہاتھی کو دیکھو جس کی مستک غرورِ طاقت سے جھوم رہی ہی اور جس کے دانت ہلاکت کے دو نیزوں کی طرح نکلے ہوئے ہیں۔ اس بھیڑئے کو دیکھو جو مشرق یورپ کے بھٹ سے چیختا ہوا اٹھا ہی اور اس خوف ناک چیتے کو دیکھو جو لامارک اور روسو کی سرزمین میں خون اور گوشت کے لئے پلا ہی۔ یہ کیسے مہیب ہیں! یہ کیسے خوف ناک آلات سے مسلح ہیں!! ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارضی کا کیسا ہول ناک بھونچال ہوگا!!! ایسا بھونچال جو کبھی نہیں آیا۔ ایسا طوفان جو کبھی نہیں اٹھا۔ ایسی آتش‌فشانی جو کبھی بھی نہ ہوئی اور خداوند کا ایسا غصہ جو اب تک کبھی زمین پر نہ ہوا۔

رولٹ بِل

یہی وہ خونی داستان ہی جسے لکھتے وقت ہر حساس انسان کا دل کانپ جاتا ہی اور یہی وہ جابرانہ قانون ہی جس کے متعلق وزیر ہند کو سات سمندر پار بیٹھے ہوئے کہنا پڑا کہ ”ہندوستان میں ہر چہار طرف اس کی مخالفت ہوئی۔ قانونی نقطۂ نظر سے اس مردم کش اور ظالمانہ نتائج سے مملو قانون کی خرابیاں ہند کے مسلّم مدبرین و مقننین نے ایسے واضح طریقہ سے ظاہر کردیں اور اس درجہ مدلل ومستند طرز سے اس کی لغویت کا بیان دے دیا کہ کسی ذی عقل کو اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ مگر جو عمال یہ جُل کھیلتے ہوں کہ مسلمانوں سے کہیں یہ قانون تو ہندوؤں کیے لئے اور ستیا گرہ و مقاومت مجہول کے ہدم بنیان کے واسطے بنایا جارہا ہی اور ہندوؤں کو یوں پرچائیں کہ تم کیوں مخالفت کرتے ہو؟ یہ تو مسلمانوں کے لئے ہی اور تقسیم مستقرو ممالک خلافت (خدا نخواستہ) کے وقت ان کو شکنجہ میں جکڑنے کے لئے بنایا گیا ہی۔ ایسے متلون المزاج، ذلیل الحرکات، دنی الطبع ارکان حکومت سے کیا اُمیدیں ہوسکتی ہیں کہ وہ نفس مسئلہ کی بطالت و مضرت پر توجہ کرتے اور اس کے متعدی و بربادی افزا نتائج پر بذل فکر سے کام لیتے جو پہلے ممبران کونسل سر سنکران نائر، مسٹر محمد علی جناح، پنڈت مالوی جی، مسٹر بی۔اِن شرما، مسٹر مظہرالحق کے مستعفی ہونے، پھر ملکی لیڈر گاندھی جی کے گرفتار اور ملک میں عام ہڑتال ہونے پھر دہلی، امرت سر، لاہور، قصور، احمدآباد، ویرم گانوں میں عظیم سیلاب غارت گری امنڈنے کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

ان فسادات کے نتائج و واقعات کی ایک نہایت ضمنی توضیح کی ضرورت ہی تاکہ سلسلۂ بیان ایک تذکرۂ ہائلہ کےلئے اتمام‌پذیر ہوجائے اور

یہ تاریخی مواد یکجا رہے جس سے آنے والی نسلیں ہند کے مظلوم و بے کس افراد کی یاد تازہ رکھیں اور مہذب حکمراں قوم کی یہ بربریت و بہیمیت تاریخی مظالم کا عنوان بن کر عبرت و غیرت کا درس دیا کرے۔

مقامات مذکورہ پر جو مجالس رولٹ بل کی مخالفت میں آئینی جوش و خروش کے ساتھ اجتماعی صورت میں ہوئیں ان پر مندرجہ ذیل وحشیانہ مظالم ہوئے:

(۱) نہتے مجمع پر فیر
(۲) دہلی کے معزز اشخاص کو اسپشل کانسٹیبل بناکر ان کی توہین کرنا
(۳) امن پسند رعایا کو حربی موٹروں سے مقابلے کی دھمکی
(٤) ڈاکٹر ستیا پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی گرفتاری
(۵) گولیاں چلانا
(٦) بے باکی سے میلے کے دن امرت سر کے جلیان والا باغ میں جنرل ڈائر کا گولیاں چلاکر خود ان کے بیان کے مطابق پانچ سو کا ہلاک اور پندرہ سو کا زخمی کرنا باوجودیکہ یہ مجمع نہتا تھا
(۷) زخمی و مقتول ظلم رسیدوں کو طبی مدد نہ دینا
(۸) پیٹ کے بل چلنے کا حکم دینا
(۹) سرِ بازار تازیانے لگانا
(۱۰) گولیاں چلانا
(۱۱) مارشل لا کے اعلان سے پہلے اس پر عمل درآمد
(۱۲) حکام کو سلام نہ کرنے کے جرم میں سزا دینا
(۱۳) لاہور میں پھر ۱۱ و ١٦ اپریل کو گولیاں تیسری بار چلانا
(١٤) چودھری رام بھجدت، لالا ہرکشن لال وغیرہ کا گرفتار کیا جانا

(۱۵) دو سو ستائیس اشخاص پر مقدمہ چلانا جن میں سے ۲٦ کو ضرب بید لگانا اور بقیہ کو سزا دینا
(۱٦) سناتن دھرم کالج کے پانچ سو طلبا کو گرفتار کرکے تین میل تک دھوپ میں دوڑانا
(۱۷) کثیر التعداد طلبا کو سزا دینا
(۱۸) غربا کے امداد پانے کے لنگر خانوں کو بند کردینا
(۱۹) لاہور کی شاہی مسجد میں گوروں کا سخت توہین آمیز افعال کرنا، پھر مسجد کا بند کردینا
(۲۰) شہر میں ہوائی جہازوں کا گھمانا
(۲۱) پنجرے میں آدمیوں کا بند کرنا
(۲۲) زمین پر سر ٹیک کر چلنے کا حکم دینا
(۲۳) بازاری عورتوں کے سامنے شرفا کو مارنا
(۲٤) تمام آبادی کے سرداروں کا ننگا کرنا
(۲۵) پبلک پھانسی کھڑی کرنا
(۲٦) پُلیس کی مرتبہ فہرست پر بلا تحقیق گرفتاریاں
(۲۷) ضمانت پر رہائی نہ دینا
(۲۸) گرفتارشدہ اشخاص کو ہتھکڑیاں، بیڑیاں پہنے دو میل تک بازاروں میں پھرانا
(۲۹) ان سب کا خلاصہ و عطر فتنہ مارشل لا کا پنجاب کے مقامات مذکورہ پر جاری ہونا اور حسبِ بیان ڈاکٹر ستیا پال:

ہاتھ پاؤں باندھ کر انگارے ہتھیلیوں پر رکھنا

تکلیف ضرب بید سے بےہوش ہوجانے والے بچوں کو ہوش میں لاکر پھر تکلیف دینا

کنوئیں میں گرے سوؤں کو نکال کر مارنا

یہ مختصر اشارات ان واقعات و فسادات کے ہیں جن کو رولٹ بل کی منحوس تجویز نے برپا کیا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک ایسےخونی اور وحشیانہ مظالم کا باب قائم کیا جس کو آنےوالی نسلیں سن کر سہم جایاکریں گی اور ان کو یہ فیصلہ دینا مشکل ہوگا کہ یہ انسانوں اور وہ بھی مدعیانِ تہذیب و تعلیم یافتہ انسانوں کا کام تھا یا خوں خوار اور مردم کش درندوں کا۔ ایسے عمال و حکام جن کے یہ کارنامے اور انسان کشی کے واقعات ہیں نہ صرف رعایا بلکہ سلطنت کے بھی دشمن ہیں اور ان کی جڑ کو کھوکھلا کرنے والے ہوتے ہیں جن کی ایسی ذلیل حرکتیں اور خلاف انسانیت فطرتیں عہدِ حکومت کو بدنام و رسوا کردیتی ہیں۔ ایسے وقت میں ان سے بالا حکام و شاہ کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنے ضمیر سے پوچھے کہ یہ افعال کیسے ہیں اور انسانیت کے حقیر سے حقیر مرتبہ سے کتنی دور؟ اور پھر وہ بالاذمہ واران مملکت مثلاً وائسرائے بہادر تدبر کریں اور انصافاً بتائیں کہ اس پر انہوں نے کیا کیا اور کہاں تک سیاست ملکی کے منصفانہ اصول کو بلا لحاظ رنگ و قومیت برتا۔ افسوس!

محمد علی

جلیان والا باغ

[ذیل میں مرحوم محمدعلی کی وہ مشہور تقریر ہی جو انہوں نے جلیان والا باغ کے خونی سانحہ سے متعلق ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرت سر کانگرس کے اجلاس میں کی تھی۔]

آج میں اپنی آنکھوں سے وہ نظارا دیکھ رہا ہوں جو اپنی عمر

میں آج تک نہیں دیکھا۔ میں کانگرس کے اس اجلاس کو ایک زبردست اسمبلی نہیں کہوں گا بلکہ یہ تو ایک ماس میٹنگ (عوامی اجتماع) معلوم ہوتی ہی۔

مگر ہم اس کے لئے کس شخص کے احسان مند ہیں؟ کس کی بدولت اتنا عظیم الشان مجمع ہمارے سامنے ہی؟ کیا یہ اس زبردست جنگ جو کے طفیل میں نہیں ہی جس نے جلیان والا باغ میں نہ کسی جذبۂ رحم سے متاثر ہوکر بلکہ صرف اس لئے گولیاں چلانی بند کر دیں کہ اس کی گولی باروت ختم ہوگئی تھی اور اس کی جیب میں باروت کا ایک دانا اور لوہے کا ایک ٹکڑا بھی باقی نہ رہا تھا جب کہ وہ رام باغ سے آرہا تھا اور راستے ہی میں اس نے ارادا کر لیا تھا کہ وہ گولی چلائے گا اور خوب چلائے گا اس نے ان لوگوں پر جو جلیان والا باغ میں جمع تھے گولیاں نہیں چلائیں بلکہ ہمارے دلوں پر گولیاں چلائی ہیں. اس نے ایک نئ آگ بھڑکادی ہی جس میں ہندو مسلمانوں کی ایک نئی قوم پیدا ہو رہی ہی۔ اس نے ایک ایسی نئی قوم پیدا کی ہی جو انشاءاللہ تعالی روئے زمین پر کسی انسان سے خوف نہ کھائے گی۔ میں غصہ میں نہیں بول رہا ہوں کیوں کہ وہ زمانہ گذرگیا جب ہم غصہ ہو سکتے تھے۔ اس وقت جب کہ ہم ایک نئ قوم کی قسمت بنارہے ہیں ہمارے لئے غصہ ہونا ممکن نہیں ہی۔ اس وقت ضروری ہی کہ ہم اطمینان سے سوچیں اور مضبوطی سے کام کریں۔

آپ اس وقت اس جگہ رزولیوشن (تجاویز) پاس کررہے ہیں۔ لیکن اگر الفاظ نے اپنے معنی چھوڑ نہیں دئے ہیں تو ان کو رزولیوشن نہیں کہہ سکتے حب تک کہ آپ کام کو سرانجام دینے کا مصمم ارادا نہ کرلیں۔

اگر آپ کاغذ پر کچھ لکھ دیں تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کیوں کہ ہم کوئی حکومت نہیں ہیں کہ جس قیمت کے چاہیں نوٹ جاری کردیں۔ اگر آپ حقیقتہً کوئی رزولیوشن پاس کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ میں سے ہر ایک عورت، مرد اور بچہ جو اس تجویز کا حامی ہو اپنے دل میں ٹھان لے کہ ہم قطعاً آرام سے نہ بیٹھیں گے اور جو باتیں یہاں سنی ہیں ان کو بھول نہ جائیں گے۔

جو تجویز کہ اس وقت آپ کے سامنے ہو اگر اس کو محدود کرکے دیکھا جائے تو اس کے معنی یہ نکلیں گے کہ آپ صرف دو آدمیوں کو خطاکار ٹھہراتے ہیں۔ لیکن دنیا میں جتنے ظالم گذرے ہیں ان میں سے صرف دو ظالموں کو ملامت کرنا خواہ اتنا عظیم الشان مجمع ہی کیوں نہ ملامت کرے کوئی معنی نہیں رکھتا تاوقتیکہ آپ اپنے دل میں یہ بات ٹھان نہ لیں کہ آج کے بعد سے آپ ظلم برداشت نہ کریں گے۔ میں کوئی بہادر نہیں ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں ایک معمولی آدمی ہوں اور مجھ میں بہت سی ایسی کمزوریاں ہیں جو آپ بہت سے لوگوں میں نہ ہوں گی۔ مگر آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے نظربندی کی سختیوں کو محسوس کیا ہو اور اس سے بڑھ کر، جیل خانہ کی زندگی کی سختیاں بھی برداشت کی ہیں۔ اب جب کہ میں ،میرے بھائی اور اتنے ہندو اور مسلمان رہا کردئے گئے ہیں میں آپ سے یہ اپیل کروں گا کہ وہ کروبار (آہنی سلاخ جس سے کسی وزنی چیز کو پلٹ دیں، مراد ڈائر کے مظالم) جس کے ذریعہ سے آپ نے ہندوستان کے اس قدر جیل خانوں کی زمین کو ہموار کر دیا ہو اور ہم جو کہ قیدی تھے اور ان جیل خانوں میں پڑے سڑ رہے تھے آپ سے یہ درخواست نہیں کریں گے کہ آپ اس کروبار سے اپنے واسطے زنجیریں بنائیں۔ اس لئے خواہ یہ ایک رحم کا فعل ہو اور خواہ دیر سے ہونے والا انصاف، کچھ

بھی ہو، اب جب کہ آپ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں قطعی طور سے اسکو اپنے دل سے نکال ڈالئے۔

محترم بزرگ مسٹر گوکھلے، خدا اُن کی روح کو آرام دے، مجھے خود ان کے دوستوں نے بتایا ہی کہ وہ اپنی تمام عمر اپنے ایک فعل پر افسوس کرتے رہے۔ ان کا وہ فعل بےرحمانہ تھا جب کہ انہوں نے پرس ایکٹ کا پاس ہونا اس وجہ سے منظور کرلیا کہ ہندوستانی محب وطن جیل خانوں سے آزادی پاجائیں۔

میں ایک جرنلسٹ رہ چکا ہوں۔ میرے سامنے پرس ایکٹ کی سختیاں بھی رہ چکی ہیں اور ان آٹھ محب وطن ہندوستانیوں کی رہائی بھی میرے دل کی آنکھ کے سامنے تھی۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ پرس ایکٹ کا پاس ہونا بہتر ہی اس سے کہ یہ آدمی جیل میں سڑ رہیں۔ لیکن اب جب کہ میں خود جیل جا چکا ہوں مجھ کو یہ کہنے کا حق ہی کہ مجھے اور میرے بھائی کو واپس جیل خانہ جانے دو۔ اگر ضرورت ہو ہم سب لوگوں کو پھانسی دے دی جائے کیوں کہ بالآخر ہم سب کو ایک دن مرنا ہی۔ ہم کو مرجانے دیجئے اور ہمارے خاندان اور اہل و عیال کی کچھ پرواہ نہ کیجئے۔ اس بات کو نہ بھولئے کہ جس وقت آپ اپنے آئندہ نظام عمل پر غور کررہے ہیں، آپ کے ہاتھوں میں نہ صرف کروڑہا موجودہ مخلوق کے بلکہ آئندہ آنےوالی نسل کے کروڑوں سپوتوں کے حقوق ہیں۔

اگر ضرورت ہو ہم کو جیل جانے دیجئے بجائے اس کے کہ آپ ہندوستان کے گلے میں طوق غلامی ڈالیں اور ہندوستان کو غلامی میں رہنے دیں اور ادنا سے ادنا ہندوستانی کی آزادی کو کوئی ڈائر یا اڈوائر یا کوئی مانٹیگو یا چمسفورڈ خواہ وہ کوئی بھی ہو اور اس کی پوزیشن کتنی ہی اعلا ہو چھین سکے۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں حکام کی تذلیل کے خیال سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو ان معاملات میں فطرتہً قدامت پسند ہوں۔ میں تھیوکریسی (مذہبی حکومت) پر یقین رکھتا ہوں۔ میرا بادشاہ کون ہی؟ میں کہتا ہوں کہ میرا سب سے اعلا بادشاہ خدا ہی اور خدا نے مجھ کو ویسا ہی آزاد پیدا کیا ہی جیسا کہ جارج پنجم کو۔

میں کہتا ہوں کہ آپ اس بات کی اجازت نہ دیں کہ ہندوستان کے حقوق کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھا جائے، کچھ پرواہ نہیں ہمارا، ہمارے اہل و عیال کا حشر جو بھی ہو، ہمارے ملک پر جو بھی گذرے اور ہمارے دوستوں پر جو بھی بیتے۔

ہم یہاں اس لئے جمع نہیں ہوئے ہیں کہ دو زانو جھک کر یہ درخواست کریں کہ ہم کو جیل خانوں سے آزاد کردو۔ ہم کو پھانسیوں سے آزاد کردو۔ میں اس کے لئے اپیل نہیں کر رہا ہوں، نہ ہی چند آدمیوں کی آزادی کے لئے اپیل کر رہا ہوں۔ میں اُس ملک کے نام پر بول رہا ہوں جس کی آزادی ہم کو بہت زیادہ عزیز ہی بہ نسبت کسی شخص واحد کی آزادی کے مقابلہ میں خواہ اس کی پوزیشن کتنی ہی اعلا ہو۔

مجھ کو جیل جانے دو۔ مسٹر تلک، اگر ضرورت ہو، تیسری بار جیل خانے بھیج دئے جائیں۔ مسز بیسنٹ دوبارہ نظر بند کردی جائیں بلکہ اس بڑھاپے میں اگر ضرورت ہو تو اپنے ہی بالوں سے پکڑ کر انھیں پھانسی دے دی جائے۔ لیکن ہندوستان کو آزاد ہونے دیجئے تاکہ آئندہ کوئی شخص کسی ہندوستانی مرد و عورت کو نہ کہہ سکے کہ تو پیدائشی غلام ہی۔

امپیریلیزم کی روح

ڈائر کے جسم میں امپیریلزم (سامراج) کی روح تھی۔ اس کو یہ تو گوارا تھا کہ ہزاروں بے گناہ ہندوستانی اس کے فوجی دستوں کی گولیوں کا شکار ہوجائیں لیکن یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ ایک ہندوستانی بھی اس پر ہنس سکے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کر کے اس کے رعب و داب کا مذاق اُڑا سکے۔ یہ رعب و داب کا دیوتا ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں کو کھاجانے تک پر راضی ہو لیکن اس پر راضی نہیں ہی کہ ایک ہندوستانی اس کا مضحکہ اُڑا سکے۔ اسی لئے میں اس پر، اس کی حکومت پر، اس کی ساری قوم پر ہنسنے کو ہندوستان کی سب سے بڑی خدمت سمجھتا ہوں اور ۱۹۱۹ء سے آج تک ان سب کا مضحکہ اُڑانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

رعب و داب کا کالا مردم خوار دیو اسی طرح مرے گا کہ ہم اس پر روز ٹھٹھے لگائیں اور اس کا مذاق اڑائیں۔ امپیریلیزم کا دنیا میں ایک اور صرف ایک مقصد اور منتہائے خیال ہی اور وہ یہ کہ ساری دنیا، تمام اولاد آدم و حوا گھینسیوں اور زمین کے کیڑوں کی طرح جب کبھی حاکم قوم کا کوئی فرد حکم دے زمین پر رینگا کرے۔ ڈائر سب سے سچا امپیریلسٹ تھا۔ اس لئے اس نے اپنے ان ،،امپیریل،، خیالات کو مطلق نہیں چھپایا اور مرتے دم تک انہیں پر قائم رہا۔ مگر وہ بھول گیا کہ کوئی انگریزی حکومت اتنی سچی نہیں کہ اس کے صاف اعلان کو جائز قرار دے۔ ہنٹر کمیشن نے بہت چاہا کہ ڈائر کوئی عذر گناہ پیش کردے تاکہ وہ اس کی بریت کا اعلان کردے۔ لیکن ڈائر کو

ان انگریزوں پر تعجب ہوتا تھا جو اس سے پوچھتے تھے کہ بلا کسی انتباہ
کے اس نے گولی کیوں چلادی اور پیٹ کے بل چلنے کا کیوں حکم دیا۔ وہ
خود ان سے پوچھ سکتا تھا، کیا تم بھی امپیریلسٹ نہیں ہو اور کیا یہی امپیریلیزم
نہیں ہی؟ یقیناً اس کو اپنی سزا پر اسی طرح تعجب ہوا ہوگا جس طرح شمر
ذی الجوش اور ابن سعد اور ابن زیاد کو یزید کے اس کہنے پر تعجب ہوا ہوگا
کہ وہ حسین کے قتل کے بغیر بھی ان سے راضی ہوجاتا۔ کیا بدعت ملکیت
قتل حسین کے سوا کسی اور چیز سے راضی ہوسکتی تھی اور کیا امپیریلیزم
جلیان والا باغ کے قتلِ عام اور لوگوں کے پیٹ کے بل رینگنے کے سوا کسی
اور شی سے مطمئن ہوسکتی ہی؟

ھمدرد (دہلی)

ایک یادگار قومی ہفتہ

تجدید عہد کے آٹھ دن

قومی ہفتہ ہندوستان کی قومی بیداری کا ایک یادگار ہفتہ ہی۔ ٦ اپریل
١٩١٩ع کو بدنام زمانہ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کی غرض سے جسے
عرف عام میں ''سیاہ قانون'' یا ''بدنصیب قانون'' کہا جاتا ہی، سارے ملک میں
جو مظاہرا کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں پنجاب کے اکثر مقامات پر حکومت
کی طرف سے جو زیادتیاں ہوئی تھیں انہیں ہم کسی طرح بھول نہیں سکتے.....

گذشتہ جنگ عمومی کے ختم ہوتے ہی ۱۹۱۹ع میں اہل ہند کو ان کی تمام وفادارانہ قربانیوں کا، جس کا انھوں نے یورپ کے میدان جنگ میں جاکر عملی ثبوت دیا تھا، جو صلا ملا اس نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ رولٹ ایکٹ پر اظہارِ ناراضگی کی جس قدر بھی صورتیں ہوسکتی تھیں، کیا مجالس قانون ساز کے ایوان کے اندر اور کیا باہر، ملک نے ان سب پر عمل کیا اور صاف صاف اعلان کردیا کہ وہ اس قانون کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ان تمام احتجاجوں کے خلاف اسے منظور کیا گیا اور رائے عامہ کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی۔ ۱۶ اپریل کا دن وہی یادگار دن ہے جب کہ سنہ ۱۹۱۹ع میں مہاتما گاندھی نے اس قانون کی منظوری کے خلاف ستیاگرہ کرنے کا ارادا ظاہر فرمایا اور اس کی تائید حاصل کرنے، نیز عامۃالناس میں اس غرض کے لئے فداکاری کا اعلا جذبہ اور ملک میں موافق فضا پیدا کرنے کے خیال سے ایک عام ہڑتال کا اعلان کیا تھا۔ اہل ملک نے جس پُرامن طریقہ سے یہ ہڑتال منائی تھی ہندوستان کی تاریخ میں اس سے پہلے اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس ہڑتال کے دن حقیقتہً ان میں آزادی کی ایک ایسی لگن پیدا ہوگئی جس نے انہیں اس طوق غلامی کو اُتار پھینکنے کے لئے تیار کردیا جسے وہ اس سے پہلے خوشی خوشی اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے تھے۔ اُس دن کی یاد یقیناً ہمارے لئے ایک مبارک دن کی یاد ہے۔ اس ہفتہ میں پھر اپنے اسی عہد کی تجدید کرنی چاہئیے جو ہم نے جلیان والا باغ میں جنرل ڈائر اور پنجاب کے دیگر مقامات پر جنرل ڈائر ہی کے دیگر ہم‌قوموں کی سفاکی اور ظلم اور ان کے ہاتھوں سے اپنی بے حرمتی اور بے غیرتی کے بعد اس غیر ملکی غلامی سے نکل جانے کا کیا تھا۔۔۔۔۔

دنیا کی آزاد قومیں اپنی آزادی کی یادگار منایا کرتی ہیں۔ امریکا والے اپنی آزادی کی جنگ کی یادگار مناتے ہیں۔ فرانسیسی انقلاب فرانس کی یادگار مناتے ہیں۔ ترکی میں ترک اس دن جشن منعقد کرتے ہیں جس دن کہ انھوں نے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور جمہوریۂ ترکیہ کی بنیاد ڈالی۔ روس بھی اس انقلاب کی یادگار مناتا ہے جس کے بعد زار کے بدترین اور مطلق العنان عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اسی طرح جاپان میں بھی وہ دن خوشی و مسرت کے اظہار کا دن ہوتا ہے جس دن کہ انھوں نے قدیم طرز کی شخصی حکومت کی جگہ ایک نمائندہ اور جمہوری طرز کی حکومت قائم کی۔ ہندوستان کو بھی وہ دن نہ بھولنا چاہئیے جس دن کہ اسے جنرل ڈائر نے آزادی حاصل کرنے کا پہلا سبق دیا۔ جب تک ہم موجودہ ذلت آمیز اور رسواکن حالت سے نکل نہ جائیں ہمیں اس سبق کو باربار دہرانا چاہئیے تا آن کہ غلامی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوجائے اور ہم آزادی حاصل کئے بغیر چین نہ لیں۔

اپریل ۱۹۱۹ع کے اوائل میں حکومت کی طرف سے آزادی طلب کرنے والوں پر جو مظالم توڑے گئے تھے اور جہاں جہاں پُرامن اور نہتے مجمعوں پر گولیاں چلائی گئیں اس میں کسی فرقہ اور قوم کی تخصیص نہ تھی۔ ان سینوں کو جن میں حب وطن اور آزادیٔ ملک کی آگ بھڑک رہی تھی سنگینوں سے چھیدتے وقت ہندو یا مسلمان کی تمیز نہیں کی گئی تھی۔ جلیان والا باغ میں دونوں قوموں کا خون مل کر بہا تھا۔ امرت سر کی گلیوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں سب کو کیڑوں کی طرح رِنگایا گیا تھا۔ لاہور میں بلا تفریقِ مذہب، فوجی افسروں کو سلام کرنے کا اور ان کے آگے سر جھکانے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس طرح ایک موذن کی داڑھی نوچی گئی تھی اسی طرح ایک برہمن پروہت کی بھی تضحیک کی گئی تھی اس کے سپاہیوں کی بندوقوں

اور سنگینوں نے یکساں طور پر وفادارمسلم اور باغی ہندو کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ اس کی مشین گنوں اور اس کے ہوائی جہازوں کے بموں کے سامنے جو آیا اس نے اسی لمحہ زندگی سے ہاتھ دھویا۔ نوجوان لڑکیوں کی بےحرمتی کرنے اور ضعیف عورتوں کی چھاتیوں کے کاٹنے میں بھی ہندو و مسلمان یا سکھ کی کوئی تفریق نہ تھی۔ مگر یہ کیسے تعجب کی بات ہی کہ آج اس ذلت و رسوائی، ظلم و تشدد سے نجات حاصل کرنے میں ہم ہندو، مسلمان اور سکھ کی تفریق کر رہےہیں، گویا موجودہ غلامی کی حالت میں آج صرف کسی ایک فرقہ کے لئے لعنت و مصیبت ہی اور دوسرے کے لئے اس میں برکت و عزت ہی ۔ اگر ہم آپس میں اسی طرح متحد اور متفق نہ ہوئے جس طرح ہم پر یکساں طور پر مظالم کئے گئے تھے تو یہ یقین کرلو کہ نہ صرف ہم اس ذلت و بےغیرتی سے بچ نہیں سکتے بلکہ اب تو گذشتہ سے بھی زیادہ ہم ان کے مورد ہوں گے۔

اپریل ۱۹۱۹ع میں جو کچھ ہوا دلی کا اس میں سب سے زیادہ حصہ ہی۔ دلّی ہی وہ جگہ ہی جہاں ۱۶ اپریل سے پہلے ۳۱ مارچ ہی کو ہڑتال ہوگئی تھی اور سارے ہندوستان میں سب سے پہلے یہیں گولیاں چلی تھیں۔ ہم اہل دلّی کو وہ وقت یاد دلانا چاہتے ہیں جب کہ اِن کے ایک نہتے مجمع پر صرف اس بنا پر اسٹیشن کے احاطہ میں گولی چلادی گئ تھی کہ وہ اپنے ان چند آدمیوں کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے جنھیں اسٹیشن پر قید کرلیا گیا تھا۔ وہ سماں بھی یاد کریں جب کہ اسی شام کو ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ، ان پر گولیاں چلی تھیں۔ اس وقت حکومت نے ہندو اور مسلمان کی تفریق نہ کی تھی۔ سب کی جانوں کی قیمت اس کے سامنے برابر تھی۔ اسے اپنے اقتدار کے سامنے کسی کی کوئی وقعت نہ تھی۔ حکومت کے رویّہ میں اس اثنا میں وہ کونسی ایسی تبدیلی ہوگئی جس کی بنا پر یہ دونوں قومیں آپس ہی میں لڑنے لگیں

اور گذشتہ چار پانچ سال کا قیمتی وقت اسی خانہ جنگی میں گنوادیا گیا۔ اللہ کا شکر ہی کہ اس حالت میں اب تبدیلی ہوگئی ہو۔ لوگ شریر افراد کی شرارتوں کو پہچاننے لگے ہیں اور انہیں اس کا احساس ہو چلا ہی کہ اس فرقہ وارانہ جنگ سے سوائے دونوں کی تباہی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ خدا کرے ان کا یہ سنبھالا عارضی نہ ہو بلکہ انہیں اور آگے لے چلے اور ایک دفعہ پھر وہ آپس کے اتحاد و یکجہتی کا ایسا سماں ملک کے سامنے پیش کردیں جس کی ہر جگہ تقلید ہونے لگے۔ نیز وہ اس قومی ہفتے کے اندر جو سارے ملک میں منایا جا رہا ہی، اپنی قومی بیداری اور سچی حُب الوطنی کا ایسا ثبوت دے دیں کہ گذشتہ چار پانچ سال کے اندر آپس کے افتراق اور فرقہ بندی کا جو سیاہ دھبا ان کے دامن پر لگا ہی وہ دُھل کر بالکل صاف ہو جائے۔

شبلی

جنگ یورپ اور ہندوستانی[1]

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور — آساں نہیں ہی فتح تو دشوار بھی نہیں

برطانیا کی فوج ہی دس لاکھ سے بھی کم — اور اس پہ لطف یہ ہی کہ تیار بھی نہیں

باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل — آئینِ شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں

میں نے کہا غلط ہی ترا دعوے غرور — دیوانہ تو نہیں ہی تو ہشیار بھی نہیں

ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گنے — تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں

---

[1] اس نظم پر شبلی کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا تھا لیکن اس پر عمل ہونے سے پہلے ہی انھوں نے وفات پائی۔

سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں

"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے ای خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

برج نرائن چکبست

آوازۂ قوم

یہ خاکِ ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار ہمالیا سے اٹھے جیسے ابرِ دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہی برق کی رفتار ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہی
شباب قوم کا ہی، زور ہوم رول کا ہی

نگاہِ شوق ہی اس رنگ کی تماشائی ہی جس سے شیخ و برہمن پہ بے خودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی چلے ہیں بہر زیارت وفا کے سودائی

وطن کے عیش کا بت بے نقاب نکلا ہی
نئے اُفق پہ نیا آفتاب نکلا ہی

یہ آرزو ہی کہ مہر و وفا سے کام رہے وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے نہ کوئی مرغ خوش الحاں اسیرِ دام رہے

سر پر شاہ کا اقبال ہو بہارِ چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاج دارِ چمن

ہی آج کل کی ہوا میں وفا کی بربادی سنے جو کوئی تو سارا چمن ہی فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی اُڑی ہر ایک باغ سے بو ہو کے رنگِ آزادی

ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

جو آج کل ہی محبت وطن کی عالمگیر — یہی گناہ، یہی جرم ہی، یہی تقصیر
زباں ہی بند، قلم کو پنہائی ہی زنجیر — بیانِ درد کو باقی نہیں کوئی تدبیر

ہی دل میں درد، مگر طاقت کلام نہیں
لگے ہیں زخم، تڑپنے کا انتظام نہیں

رہا ہی رات کی صحبت میں کیا مزا باقی — نگاہِ شوق کو ہی دورِ نو کی مشتاقی
نئی شراب، نیا دور اور نیا ساقی — مٹی سرور میں دیر و حرم کی ناچاقی

یہی کسی کا حرم ہو کسی کا دیر رہے
یہ مےکدا رہے آباد، خم کی خیر رہے

جو دل سے قوم کے نکلی ہی وہ دعا ہی یہی — تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہی یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہی وہ ہوا ہی یہی — غریب ہند کے آزار کی دوا ہی یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لَو لگائے ہوئے

برج نرائن چکبست

وطن کا راگ

زمین ہند کی رتبے میں عرش اعلا ہی — یہ ہوم رول کی امید کا اُجالا ہی
مسز بسینٹ نے اس آرزو کو پالا ہی — فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہی

طلب فضول ہی کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے — ہم اپنی آنکھ کا سُرما اسے بنائیں گے
غریب ماں کے لئے درد دکھ اٹھائیں گے — یہی پیام وفا قوم کو سنائیں گے

طلب فضول ہی کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پنھانے والے اگر بیڑیاں پنھائیں گے — خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے — یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہی کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

زباں کو بند کیا ہی یہ غافلوں کو ہی ناز — ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لے انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز — چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز

طلب فضول ہی کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہی پیام ہی کوئل کا باغ کے اندر — اسی ہوا میں ہی گنگا کا زور اٹھ پھر
ہلال عید نے دی ہی یہی دلوں کو خبر — پکارتا ہی ہمالا سے ابر اُٹھ اُٹھ کر

طلب فضول ہی کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

حسرت موہانی

مانٹیگو رفام

کس درجہ فریب سے ہی مملو تجویزِ رفارمِ مانٹیگو
مشہورِ زمانہ ہیں، مسلم دستور کے حسب ذیل پہلو
قانون بہ اختیار کامل عمال بہ زور، زر پہ قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک کی بھی گلہاے رفام میں کہیں بو
کاغذ کے سمجھئے پھول ان کو جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو
مدراس کے ڈاکٹر کا یہ قول کس درجہ ہی دل پذیر ونیکو
مقصود ہی صرف یہ کہ تا جنگ ہم سب رہیں صرف این "تگاپو"
ای ہندیٔ سادہ دل، خبردار! ہرگز نہ چلے یہ تجھ پہ جادو

ظفر علی خاں

مظالم پنجاب

میں نے امرت سر میں اک دن اپنے خواجہ سے کہا
پیٹ کے بل رینگ لیجے بندہ پرور آپ بھی

ایک تہ آماس کی تا فربہی پر جائے چڑھ
کھائیے ہر روز صبح و شام ہنٹر آپ بھی

ناک سے کچھ دن زمیں پر کھینچتے رہئے لکیر
پھیرئے کونچی سفیدی کی بدن پر آپ بھی

بعد مغرب جائیے مسجد کو اور اس جرم میں
پیٹھ پر کھنچوائیے چابک سے مسطر آپ بھی

چلئے سولہ میل دن میں ہانپتے اور کانپتے
پاؤں میں کچھ روز ڈالے رہئے چکر آپ بھی

بسئے جاکر جیل میں اور کھائیے ارہر کی دال
میہماں رہئے ذرا سرکار کے گھر آپ بھی

پھر یہ کہئے مارشل لا حشر تک قائم رہے
ورنہ ہوں گے منکر جنرل اڈوائر آپ بھی

ظفر علی خاں

شعلۂ فانوس ہند

زندہ باد ای انقلاب، ای شعلۂ فانوس ہند
گرمیاں جس کی فروغِ مشعلِ جاں ہوگئیں

بستیوں پر چھارہی تھیں موت کی تاریکیاں
تونے صور اپنا جو پھونکا محشر ستاں ہوگئیں

جن بلاؤں سے گھرے رہتے تھے صبح و شام ہم
تیرے آتے ہی وہ انگریزوں کی درباں ہوگئیں

جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی
قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہوگئیں

مرحبا! ای نو گرفتارانِ بیدادِ فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہوگئیں

زندگی ان کی ہی، دین ان کا ہی، دنیا ان کی ہی
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہوگئیں

اقبال

جلیان والا باغ

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہی خاک باغ
غافل نہ رہ جہاں میں تو گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہی خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

جوہر (محمد علی)

فغانِ دہلی

کلمۂ حق ہی اگر وردِ زبانِ دہلی
مٹ سکے گا نہ کبھی نام و نشان دہلی
لب پہ آئے نہ کبھی شکوۂ جورِ اغیار
ہو زمانہ سے الگ طرز فغان دہلی
سرفروشی کے لئے پیر و جواں ہیں تیار
آج رونق پہ ہی کس درجہ مکانِ دہلی
سنگریزوں سے زیادہ نہیں گولی چھرے
لاکھ روکا نہ رکا سیلِ روان دہلی
حق کے آتے ہی ہوا کعبہ سے باطل رخصت
چند دن اور ہیں دہلی میں بتان دہلی

۲۔ تحریک خلافت و ترک موالات

[جنگِ عظیم ۱۹۱۸ع میں ختم ہو گئی لیکن ہندوستان شورش و بےچینی کا مرکز بن گیا۔ گرانی، کال اور بے روزگاری نے لوگوں کو سخت ابتلا و آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات نے بھی ہندوستان کو مایوس کیا۔ رولٹ بل انتہائی مخالفتوں کے باوجود پاس ہو گیا۔ اس کے خلاف جگہ جگہ احتجاجی جلسے ہوئے۔ جلیان والا باغ میں نہایت درندگی سے مجمع پر گولی چلائی گئی اور لوگوں کو پیٹ کے بل چلایا گیا۔ یہ حادثہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیڈروں کے بیانات، مقرروں کی شعلہ‌بیانیوں اور شعرا کی آتش‌نوائیوں نے وہ کام نہیں کیا جو اس حادثہ نے کیا۔ سارا ہندوستان متحد ہو گیا۔ مسلمانوں میں ایک اور وجہ سے بھی بےچینی تھی۔ جنگ کے بعد برطانیا ترکی کے خلاف جو چالیں چل رہا تھا وہ ایک نہایت خطرناک مستقبل کی پیش‌گوئی کر رہی تھیں۔ اس لئے مظالم پنجاب کی تلافی، مسئلہ خلافت کو حل کرنے اور آزادیٔ وطن کی خاطر تحریک خلافت و ترک موالات شروع ہوئی۔ گاندھی جی اور علی برادران نے سارے ہندوستان کا دورا کیا اور اُن کی تقریروں نے ملک کے گوشہ گوشہ کو حریت و آزادی کے جذبہ سے بھر دیا۔ قید و بند کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن نہ جذبۂ حریت کم ہوا، نہ حق کی صدا بند ہوئی اور نہ تحریک ختم ہوئی۔ آخر انگریزوں نے اپنا پرانا حربہ 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'، استعمال کیا اور اس میں اُنھیں کامیابی ہوئی اور آزادی کی جو منزل سامنے دکھائی دے رہی تھی وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔]

صور بیداری

میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دے؟ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں جس کی سینہ کوبی کے شور سے سرکشتگانِ خوابِ موت اور ہشیار ہوجائیں؟ آہ! کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خوں باری کا دعوا ہے؟ کہاں ہیں وہ دل جن کو زوالِ ملت کے زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر جو آتشِ غیرت و حمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہیں؟ اور پھر آہ! کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن کے ماتم گسار، اس برباد شدہ قافلہ کے نالہ ساز، اس صفِ ماتم کے فغاں سنج اور اس کشتیٔ طوفانی کے مایوس مسافر جن کی موت و حیات کے آخری لمحے جلد جلد گذر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا خاموش روتے ہیں یا مایوسی سے چپ راست نگراں، مگر نہ اُن کے ہاتھوں میں اضطراب ہے اور نہ پاؤں میں حرکت، نہ ہمتوں میں اقدام ہے اور نہ ارادوں میں عمل کا ولولہ؟ دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں اور اہل شہر رونے میں مصروف ہیں۔ ڈاکوؤں نے قفل توڑ دئیے ہیں اور گھر والے سوتے بھی نہیں، مگر اب تک آنکھ ملنے سے مہلت نہیں ملی ہے۔ جب کسی کے گھر میں آگ لگتی ہے تو محلہ کے دوست دشمن سب ہی پانی کے لئے دوڑتے ہیں، لیکن رونے کو ہمت اور مایوسی کو زندگی سمجھنے والو، یہ کیا ہے کہ تمہارے گھر میں آگ لگ چکی ہے، ہوا تیز ہے او شعلوں کی بھڑک سخت مگر تم میں سے کوئی نہیں جس کے ہاتھ میں پانی ہو؟ پھر اگر اسی وقت کے منتظر تھے تو کیا نہیں سنتے کہ وہ وقت آگیا ہے؟ اگر تم کشتی ڈوبنے کا انتظار کر رہے تھے تو کیا نہیں دیکھتے کہ اب اس میں دیر نہیں؟

محمد علی

صلوٰۃِ عشق کا وضو

صلوٰۃِ عشق کا وضو خون سے ہوتا ہے۔ آپ سوراج کے سچے عاشق ہیں تو اس نماز کا وضو کرنے کے لئے اپنی آرام طلبی و تن آسانی کا خون کریں۔ آپ کے بدن پر جو تزیب اور ڈوریا ہے اس کو اُتار کر پھینک دیں۔ یہی چیز ہے جس کی قیمت سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے جس نے امرت سر میں آپ کے بھائیوں کو پیٹ کے بل چلوایا۔ آپ کہتے ہیں کہ کھدر میں گرمی لگتی ہے۔ قرآن کریم میں دوزخ کا ذکر یاد کرو اور دوزخ کی آگ سے ڈرو جو اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔ میں بمبئی میں خواتین سے کہ آیا ہوں کہ تم گاڑھے کی ساڑی پہننے سے گھبراتی ہو۔ شاید ایک وقت آئے گا کہ تم کو اپنی کھال اُتار کر ملک کے لئے دینی پڑے گی۔ یہ تمہاری غلامی کا لباس ہے۔ اس کو بدن سے اُتار کر پھینک دو۔

اجمل خاں (حکیم)

ہندوستان کا مستقبل

اس حیثیت سے کہ ہم اس خاک سے پیدا ہوئے اور دوسری قوموں کے ساتھ اسی ملک کے فخر کرنے والے وارث بنے، ہم ان فرائض کو جو ہماری زاد وبوم ہم پر عاید کرتی ہو، نہ صرف اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ دلی جوش کے ساتھ ان کے ادا کرنے کے لئے اپنے ہندو، عیسائی، پارسی اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ آمادہ ہیں.....

ہندوستان کے لئے ایک نادیدہ مستقبل میں وہ عظمت اور شان پنہاں ہو کہ اس کے ماضی کا زیادہ سے زیادہ مہتم بالشان زمانہ اس کے مقابلہ میں کم اور حقیر نظر آتا ہو۔ آئیے، اب ہم اس متحدہ طاقت کے ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائیں اور اس مستقبل کے چہرے سے جو ہمارے ذہنی مگر اعلا تخیل کے ساتھ وابستہ ہی نقاب اٹھانے کی خلوص دل سے کوشش کریں۔

ہندوستان کے عالموں کا شرعی فتوا

۱۔ سرکاری کونسلوں میں ممبر ہونا ناجائز ہی۔

۲۔ انگریزی عدالتوں میں وکالت کرنا ناجائز ہی۔

۳۔ سرکاری یا نیم سرکاری مدرسوں میں پڑھنا ناجائز ہی۔

٤۔ آنریری مجسٹریٹی اور اعزازی عہدے اور گورنمنٹ کے دئے ہوئے خطابات رکھنا ناجائز ہی۔

۵۔ گورنمنٹ کی تمام نوکریاں جن سے سرکار کی مدد ہوتی ہی حرام ہی، خاص کر پُلیس اور فوج کی نوکری کرنا بہت سخت گناہ ہی کیوں کہ اُن کو اپنے بھائیوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں۔ اللہ‌تعالی فرماتا ہی مَن قَتَلَ مُومِناً مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُہٗ جہَنّمَ خَالِدینَ فِیہا ترجمہ: جو شخص کہ مسلمانوں کا عمداً قتل کرے گا اُسے جہنم میں ہمیشہ عذاب دیاجائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہی من حَمل السلاح عَلیناَ فلیس مِنا۔ ترجمہ: جس نے مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اُٹھائے وہ مسلمانوں سے خارج ہوگیا۔

لالا لاجپت رائے

شرطِ مصالحت

میری یہ رائے ہے کہ جو لوگ اس وقت انگریزوں کی دوستی کا دم بھر رہے ہیں وہ حقیقت میں دوستی کا فرض ادا نہیں کرتے۔ وہ ان کو ملک کے عوام الناس کے خیالات کو پس انداز کرنے میں مدد دے رہے ہیں۔ میری رائے میں انگریزوں کی بہتری بھی اسی میں ہے کہ وہ ہندوستانی قوم پرستوں کے مطالبۂ سوراج کو جائز اور راست مان کر ان کے ساتھ اُنہی اُصولوں پر سمجھوتا کرلیں جن اُصولوں پر انہوں نے اپنی آبادیہائے نو میں کیا ہے۔ یہ کہا جائے گا کہ انگریز سوراج کو جائز مانتے ہیں۔ لیکن اب ہندوستانی کرۂ دماغی میں اس قدر تبدیلی پیدا ہوگئی ہے کہ ہندوستانیوں کو لفظی وعدوں سے تسلی نہیں ہوتی۔ ہندوستانی ان وعدوں کا ثبوت عمل میں چاہتے ہیں۔ انگریز یہ کہیں گے کہ رفام اسکیم ان وعدوں کا عملی ثبوت ہے۔ یہ امر ایسا ہے جس پر ہم انگریزوں کے ساتھ تنقیح نکالتے ہیں۔ ہم رفام اسکیم کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے کہ اس کو سوراجیہ کا زینا سمجھ لیں۔ ہماری رائے میں رفام اسکیم نوکرشاہی کی حکومت کو طول دینے اور کسی قدر ہردلعزیز کرنے کا ایک زبردست زریعہ ہے۔ ہم نوکر شاہی کی ہردلعزیزی نہیں چاہتے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا چاہتے ہوئے ہم انگریزی قوم کے یا انگریزوں کے دشمن ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قومی حیثیت سے ہمارے اور انگریزوں کے درمیان مستقل دوستی اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب یہ دوستی مساوات پر مبنی ہو اور ہم کو اپنے ملک میں وہی پولٹیکل حیثیت حاصل ہو جو انگریزوں کو اپنے ملک میں حاصل ہے۔ جب تک ہم انگریزوں کے ماتحت ہیں، جب تک ہم رعایا ہیں اور وہ ہمارے حاکم ہیں

اس وقت تک قومی حیثیت سے ہمارے اور اُن کے درمیان دوستی نہیں ہوسکتی اور اس وقت تک ہماری رائے میں ہماری قوم میں آزادی کے لئے وہ حاکم زیادہ خطرناک ہیں جو لبرل ہونے کا دم بھرتے ہیں اور چاپلوسی اور میٹھی میٹھی باتوں سے ہندوستانیوں کو مایاجال میں پھنسانے میں کامیاب ہوتے ہیں اور ہندوستان کے ایک فریق کو دوسرے فریق سے لڑادیتے ہیں۔

ہندوستانیوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ انگریزوں سے دشمنی نہ کرتے ہوئے اور اپنی اصلی حالت کو محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سچ بولنے میں خوف نہ کھائیں۔ وہ نہ کسی کی چاپلوسی میں آئیں اور نہ کسی کی دھمکی میں آئیں۔ اگر حقیقت میں ہم اس‌قدر بودے اور حقیر اور لاچار ہوگئے ہیں کہ بغیر انگریزوں کی حفاظت کے ہم اس ملک میں نہیں رہ سکتے تو میری رائے میں یہ زندگی کسی طرح سے قابل‌قدر نہیں ہے اور میں کم از کم اِس زندگی پر موت کو ترجیح دوں گا۔

محمد علی

راہِ عمل

[مرحوم محمدعلی کی رہبری میں مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان گیا تھا تاکہ مسئلۂ خلافت سے متعلق ہندو اور مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو انگریز مدبرین پر واضح کرے اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوئی تدبیر نکالے۔ واپسی پر محمدعلی نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ءکو لاہور میں ایک

تقریر کی تھی جس کے اقتباسات یہاں دئے جاتے ہیں۔]

جو وفد خلافت آپ نے امرت سرسے مرتب کرکے انگلستان بھیجا تھا اس کے حالات مختصراً عرض کروں گا۔ جو پیغام آپ نے انگلستان کی قوم اور حکومت کو اور ان کی شریک حکومتوں کو بھیجا تھا وہ ہم نے بلا کم وکاست پہنچا دیا۔ ہمارا فرض یہ تھا کہ ہم اُن لوگوں کو بتادیں کہ مسلمان کی مذہبی پابندیاں کیا ہیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات مسئلۂ خلافت کے متعلق کیا ہیں اور ہندوستان کا مطالبہ خلافت اور جزیرۃالعرب کی نسبت کیا ہے۔ میرا یہ فرض تھا کہ میں انگلستان والوں کو بتادوں کہ اگر ہمارے مذہبی فرائض کا خیال نہ کیا گیا تو اس کے نتائج کتنے برے ہوں گے۔ ہم پہلے ہی سے جانتے تھے کہ اس میں کامیابی نہ ہوگی۔ مہاتما گاندھی ابھی آپ کو بتائیں گے کہ یہ گورنمنٹ کس قدر دغاباز، مکّار اور فریبی ہے۔ یہ ہمیں سب کچھ معلوم تھا لیکن اتمام حجت باقی تھا تاکہ کوئی کل کو یہ نہ کہے کہ تم نے حکومت سے سختی کے ساتھ مطالبات کئے۔ نرمی سے نہیں مانگا۔ ہم نے منت سماجت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ہماری نرمی کے وزیر ہند اور وزیراعظم تک قائل ہیں۔ ان سے میری جو خط و کتابت ہوئی یا پرائیوٹ ملاقاتیں ہوئیں اُن کے حالات جب میں شائع کروں گا تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ہم نے کس قدر نرمی اور سچائی کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے اپنے مطالبات پیش کئے۔

....

وزیراعظم نے ہم سے کہا کہ اگر ہم تھریس اور سمرنا تمہیں دے دیں اور جزیرۃالعرب پر اپنی حکم برداری قائم رکھیں تو تم رضامند

ہوجاؤ گے؟ لیکن ہمارے وفد کے ایک رکن نے صاف کہہ دیا کہ اگر ساری دنیا کی بادشاہت ہمیں دے دو اور ہماری ارض مقدس کے ایک انچ پر تم حکومت کرنا چاہو تو ہم ہجرت کریں گے یا جہاد۔

جب میں انگلستان گیا تو لندن میں جو پہلی تقریر کی اس میں امرت سر، لاہور اور گوجران والا کے واقعات بیان کئے۔ مظالم، تکالیف اور تحقیر و تذلیل کے قصے سنائے۔ جس بندے کو خدائے تعالیٰ نے چلنے کے لئے دو ٹانگیں دی تھیں اسے ڈائر نے پیٹ کے بل چلایا۔ لوگوں کو قمچیاں لگائی گئیں۔ جب قمچیاں کھاتے کھاتے بے ہوش ہوجاتے تو ہوش میں لایاجاتا اور پھر قمچیاں لگائی جاتیں۔ ہماری عورتوں کو بے نقاب کیاجاتا۔ جب میں نے یہ سب واقعات سنائے تو بعض انگریز بھی اس جلسے میں تھے جو افسوس کرتے تھے۔ ایک مصری مسلمان بھی شریک جلسا تھا۔ وہ اٹھا اور کہنے لگا کہ آج میں دو رکعت دوگانۂ شکر ادا کروں گا کہ ہندوستان پر یہ مصیبت پڑی۔ میں نے حیران ہوکر پوچھا حضرت، یہ کیوں؟ آپ اپنے بھائیوں کی مصیبت پر خدا کا شکر اداکریں گے؟ مصری مسلمان نے جواب دیا کہ ہم ساٹھ ستر برس سے دیکھتے ہیں کہ ہم ڈیڑھ کروڑ آدمی تو خیر انگریزوں کی حکومت کو جلد متزلزل نہیں کرسکتے۔ لیکن حیرانی اس بات پر ہی کہ ہندوستان میں تینتیس کروڑ اللہ کے بندے مٹھی بھر انگریزوں کی غلامی کرتے ہیں۔ پھر جب ہندوستانی فوجیں ہماری آزادی کو پامال کرنے کے لئے آئیں تو ہم بہت حیران ہوئے کہ جس طرح کھیدے کا ہاتھی دوسرے ہاتھیوں کو گھیر گھیر کر احاطہ میں لاکر قید کراتا ہی اسی طرح ہندوستانی جو خود غلام ہیں یہاں آکر ہمیں غلام بناتے ہیں۔ آج جو مظالم کا حال سنا اس سے معلوم ہوگیا کہ اب ہندوستان آزاد ہوگا۔

مسلمان بھائیو، اگر تم کو اپنے خلیفہ کی عزت برقرار رکھنا ہی اور تم اس کی آزادی چاہتے ہو تو تھوڑے ایثار سے کام لو۔ آج میں نے اخبار میں دیکھا ہی کہ ترک احرار اور مصطفےٰ کمال پاشا پر ترکی معاہدہ کا نفاذ نہیں ہو سکتا اس کی وجہ یہ ہی کہ ترک ہمیشہ لڑتے رہے ہیں۔ وہ آرام طلب نہیں چاہتے۔ وہ آزادی کے خواہاں ہیں، خواہ کسی طرح ملے۔ ایک تو وہ ہیں جنھوں نے حکومت کو چھوڑا۔ قسطنطنیہ کو چھوڑا۔ محض خدا کے بھروسے پر اپنے اہل و عیال سے علاحدگی اختیار کی۔ ایک تم ہو کہ ابھی پوچھ ہی رہے ہو کہ ہم کالجوں سے بچوں کو اٹھالیں؟ کاونسلوں میں جائیں؟ تم آج بھی ہچر مچر کرتے ہو اور ان عدالتوں میں جاتے ہو جہاں سے نہ اسلام کو انصاف ملا نہ پنجاب کو۔

جرمنی میں پانچ برس یونیورسٹیاں بند رہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی بند رہی۔ وہاں کیا قیامت آگئی؟ تم کہاں کے اتنے بڑے تعلیم کے حامی آگئے؟ کبھی وقت تھا کہ تم تعلیم کی طرف آتے بھی نہ تھے اور آج ایسے محب تعلیم بن رہے ہو کہ خدا اور رسول کو بھی اس کی خاطر قربان کرنے کو تیار ہو۔ اگر تم اسلام کو آزاد کرالو، سوراج حاصل کرلو تو تم جہاں چاہوگے اپنی فوجیں بھیج سکوگے۔ جہاں تمھاری مرضی نہ ہوگی وہاں تمھیں کوئی نہ بھیج سکے گا۔ ترکوں اور عربوں کو انگریزوں نے شکست نہیں دی۔ ان کو شکست دینے والے ہندوستانی ہیں۔ ایک طرف تو یہ سورما روتے بسورتے یہاں سے جاتے تھے اور دوسری طرف وہاں جاکر «بہادری» دکھاتے تھے۔

میں ہندو اور سکھ بھائیوں سے بھی یہ کہتا ہوں کہ خلافت اور اسلام کو جانے دو اگر تمھیں مسلمان عزیز نہیں۔ وہ ملچھ ہیں، ناپاک ہیں۔ لیکن تمھیں آریاورت اور بھارت ماتا سے محبت ہی تو آس پاس کے ملکوں اور اُن پڑوسیوں کی سلطنتوں کی آزادی کو بچانے کی کوشش کرو جنھوں نے کسی نہ کسی

طرح اب تک اپنی آزادی برقرار رکھی ہی، ورنہ یاد رکھو تمھارے پاؤں کی بیڑی اور بھی بوجھل ہوجائے گی۔

....

امرتسر کے سکھ بھائیوں کا جوش دیکھ کر مجھے کہنا پڑا کہ اپنا جوش اس قدر دریادلی سے نہ خرچ کرو۔ ہمیں اتنا بڑا شعلہ نہیں چاہئے جو ایک ہی دفعہ بھڑک کر بجھ جائے۔ ہمیں تو وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ چاہئے جو ساری اندھیری رات میں روشنی دے تاوقتیکہ سوراج کا آفتاب طلوع نہ ہوجائے۔ قاتلوں، سفاکوں، بےدینوں کی طرف سے تلوار اٹھے۔ تم ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ جس وقت تلوار چلانے کا وقت آئے گا تو میری تلوار سب سے پہلے کافر کی گردن پر پڑے گی۔ ہجرت کےلئے لوگوں نے بہت جلدی کی۔ ابھی اس کا موقع نہ تھا۔ ابھی ترکِ موالات کرو۔ پنجاب کے تنومند اور مضبوط لوگوں کو دیکھ کر مجھے حیرانی ہی کہ اتنی سی بات نہیں کرسکتے۔ اگر ہمارے دلوں میں نفرت و حقارت کے خیالات ہوں تو ڈائر اور اڈوائر کیا ہیں۔ بڑے بڑے نمرود و فرعون بھی ہمیں دبا نہیں سکتے۔ اگر بچے ناراض ہوجائیں انھیں مٹھائی دی جائے تو نہیں لیتے۔ عورتیں روٹھ جاتی ہیں تو عمر بھر نہیں منتیں۔ جو کام عورتیں اور بچے کررہے ہیں کیا وہ پنجاب کے توانا مرد نہیں کرسکتے؟

ظفر علی خاں

خطبۂ صدارت

[فبروری ۱۹۲۱ع میں خلافت کانفرنس، برہان پور کی صدارت مرحوم ظفر علی خاں نے کی تھی۔ انھوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس کا ایک حصہ یہاں دیا جاتا ہی۔]

ہماری حکومت کے ارباب حل و عقد کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ اپنی مسلسل وعدہ شکنی سے اس وقار کو زائل کردیا ہی جو کبھی اہل ھند کے دلوں میں ان کی طرف سے گوشہ گیر تھا اور جو آخری سلوک وہ خلافت اسلامیہ کے ساتھ کررہے ہیں اُس نے اس رہی سہی ارادت کا بھی جنازا نکال دیا ہی جو اُن حضرات کے ساتھ تھی۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت جو انگلستان کی جدید صلیب پرستانہ حکمت عملی کا خوش گوار نتیجہ ہی انگریزی وزرا اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والوں کے اُس طبقہ کو بہت برا سمجھنے لگی ہی جس نے انگلستان کی روایات کو ملیامیٹ کردیا ہی۔ سی۔آئی۔ڈی۔ کی وساطت سے یہ امر واقعہ ان کے گوش گذار ہوچکا ہوگا کہ بجز چندست بچینوں کے وقت پر وہ بھی دغا دے جائیں گے۔ ایک بھی ہندو یا مسلمان اس وقت ہندوستان میں ایسا نہیں جو انگلستان کی موجودہ ایشیائی حکمت عملی پر نفرین نہ کرتا ہو۔ پھر کیا وہ ہندوستان جس کے دل سے آہیں اور بد دعائیں نکل رہی ہوں انگلستان کے لئے حقیقی اطمینان قلب کا موجب ہوسکتا ہی؟

ہندوستان اب وہ ہندوستان نہیں رہا جو خدا کے بجاے انسان کی پرستش کا خوگر تھا اور دنیا کی غلامی کو سرمایۂ نجات اخروی سمجھتا تھا۔ تیس کروڑ انسانوں نے جو بنی آدم کا پانچواں حصہ ہیں سوتے سے کروٹ لی ہی۔ وہ آنکھیں مل رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں کیا ہورہا ہی۔ حریت و مساوات کا وہ سبق جو ایشیا کی تہذیب نے انہیں کبھی دیا تھا لیکن جسے وہ فراموش کرچکے تھے اب وہ نئے سرے سے سیکھ رہے ہیں۔ وہ فرانس کے سبزہ زاروں اور فلسطین و عراق کے ریگستانوں سے ہو آئے ہیں اور اس نکتہ سے اچھی طرح واقف ہوچکے ہیں کہ ہرقوم کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنا چاہیے۔ یہ اصول ہمہ گیر ہی اور یورپ ہی کی میراث نہیں ہی۔ پرانے ہندوستان کا جنازا سر مائیکل اوڈوائر کے کندھوں پر نکل چکا۔ اس کی لاش جلیانوالا باغ میں دفن ہوچکی۔ اب

ایک نئے ہندوستان نے جنم لیا ہی اور وہ اس زبردست قوت کے ساتھ جس کا
مقابلہ دنیا جہان کی قومیں بھی نہیں کرسکتیں اپنے حقوق طلب کرنے پر اُٹھ کھڑا
ہوا ہی اور اس بات پر مصر ہی کہ اُن باتوں کا تصفیہ جن کے ساتھ اُس کی
عزیزترین دنیوی و دینی اغراض وابستہ ہیں اُس کی راے کے مطابق ہو ورنہ منھ
سے یہ کہہ دینا کہ ہندوستان مجلس اقوام عالم کا رکن اور اس حیثیت سے بین اقوامی
مہمات الامور پر راے زنی کرنے کا پورا مستحق ہی ایک دل فریب فقرہ ہی اور بس۔
ہندوستان کی بیداری کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر برنارڈ ہاؤٹن نے جو ہندوستان کے
ایک وظیفہ یاب سیویلین ہیں انگلستان کے موقر صحیفہ «پازیٹیوسٹ ریویو» میں کیا
خوب کہا ہی :

''جو لوگ بنی نوع انسان کی ترقی کے صدق دل سے
خواہش مند ہیں اُن کے لئے یہ نظارا موجب صدہزار
شادمانی و انبساط ہی کہ نسل آدم کا پانچواں حصہ
جو اب تک اس بات کا عادی تھا کہ اُس کے ساتھ
غلاموں یا مکتب کے بچوں کا سا سلوک کیا جائے
اب اپنی جھکی ہوئی پیشانیوں سے گرد تذلل و عبودیت
جھاڑ کر اپنی آزاد گردن اُٹھائے ہوئے اُس روشن
آسمان کا نظارا کر رہا ہی جو پہلے اُس کی آنکھوں
سے اوجھل تھا۔ عاقل و بالغ انسانوں پر اس انداز
سے حکومت نہیں کی جاسکتی کہ گویا وہ طفل دبستان
ہیں۔ اگر کوئی حکومت ایسا کرے گی تو یا وہ انہیں
مٹادے گی یا خود مٹ جائے گی، یعنی یا تو وہ ایک
گناہ عظیم کی مرتکب ہوگی اور یا اپنی تباہی کا سامان

اپنے ہاتھوں کرے گی"

یہ نیا آزاد ہندوستان جس کی تصویر مسٹر برنارڈ باوٹن نے اپنے بلیغ الفاظ میں کھینچی ہی ایرو پلینوں اور کل دار توپوں، قید خانہ کی زنجیروں اور سولی کی رسیوں سے نڈر ہوکر اُس انسانیت، اُس انصاف اور اُس آزادی کا واسطہ دیتا ہوا جسکا اعلان آئے دن یورپ کی طرف سے ہوا کرتا ہی پکار کر کہتا ہی کہ اُس کے پیمانۂ صبر کو لبریز نہ ہونے دیا جائے اور اُس کے .... مطالبات تسلیم کرلئے جائیں۔

....

ہندوستان کے اُن مطالبات کو جو حق و انصاف کی آواز ہونے کے ساتھ انگریزی حکومت کے اُن متعدد وعدوں سے بھی تقویت حاصل کرچکے ہیں جن کا حوالہ میں نے اوپر دیا ہی، اگر تسلیم نہ کیا گیا۔ تو اس کے نتائج ایسے ہولناک ہوں گے کہ قلم اُن کی تفصیل سے لرزتا ہی۔ اور سو بات کی ایک بات یہ ہی کہ ایشیا میں برطانیا کا ستون اقتدار متزلزل ہو جائے گا۔ انگلستان اور اس کے حلقوں کی طرف سے مایوس ہوکر ترک بدرجۂ مجبوری بالشویکوں کے ساتھ مل جائیں گے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی کافی ہوا کرتا ہی۔ ایران کی آبادی کا بےچین عنصر اُن کے ساتھ شریک ہو جائے گا۔ افغانستان بھی اُن کا ساتھ دینے پر مجبور ہوجائے گا۔ اور اب سیلاب عظیم کی رو جب ہندوستان کی طرف بڑھے گی تو ہندو مسلم وفاداری کا بند کہ ایک وہی اس طوفان کی روک تھام کر سکتا ہی ٹوٹ چکا ہوگا۔

پس قبل اس کے کہ وہ اندیشہ ناک حالت پیدا ہوجائے برطانیا کے مدبرین کا فرض ہی کہ ہمارے مطالبات پر ہمدردانہ غور کریں اور اُس مہلک روش سے باز آجائیں جو اُنھوں نے آج کل اختیار کررکھی ہی۔ وفاداری کا یہ آخری فرض تھا جو ہم نے ادا کردیا۔

عبدالماجد بدایونی

سوراج اور خلافت

دوستو، آج ہم ہندوستان میں ترکی بھائیوں کےلئے غمگین ہیں۔ خلافتِ مقدسہ کے زوال اقتدار کےلئے نالاں ہیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ ہمارا خالی نالہ وشیون ان‌کو یا ہم کو کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہی؟ اور کیا ہم فقط کانفرنس کرکے اُس فرض کو انجام دے سکتے ہیں جو ہم پر خلافت کی تباہی اور جزیرۃالعرب کی خدانخواستہ بربادی کے وقت میں عائد ہورہا ہی؟

سوال یہ ہی کہ آخر ہم کیا کریں؟ بھائیو، اس کے جواب میں کوئی جوش‌افزا تقریر نہیں کرنا چاہتا اور نہ یہ وقت جذبات اُبھارنے اور ہیجان پھیلانے کا ہی، بلکہ جذب جذبات کے ساتھ خموش مطمئن طریقہ سے کام کرنے کا وقت ہی اور ایک نصاب عمل مقرر و مشخص کرلینے کا زمانہ ہی۔ پہلے آپ کو ترک موالات کی تمام دفعات کو کامیاب بنانا چاہیئے اور حکومت سے ترک تعلقات کرکے آخرکار اِعلان آزادی کردینا چاہیئے اور آپ میں سے ہر شخص کا فرض ہونا چاہیئے کہ خلافت کی ہر خدمت انجام دینے کےلئے عہد و بعیت دے (مجمع نے پکارا: ہم عہد دیتے ہیں۔) ٹھہرو، ٹھہرو، جلدی نہ کرو۔ میں جو کہتا ہوں اس کو سن لو اور سمجھ لو کہ جب تم اللہ کےلئے اُٹھوگے تو تمہاری راہ میں ہزاروں ٹھوکریں آئیں‌گی اور سیکڑوں لغزشیں تم کو جھکولے دیں‌گی۔ سنو، تم قید بھی کئے جاؤگے اور تم میں سے بہت کو پھانسی بھی، ممکن ہی، دی جائےگی اور تمہاری جائدادیں بھی ضبط ہوں‌گی اور تم کو سخت سے سخت تعزیریں بھی دی جائیں‌گی۔ اگر ان تمام مصائب کو سوچ کر عہد دیتے ہو تو اب خدا کو

حاضر و ناظر جان کر اقرار دو اور بعیت لاؤ (مجمع نے پھر پکارا: ہم تیار ہیں اللہ ہماری مدد کرے) ہاں بھائیو، میں بھی دعا کرتا ہوں کہ خداوند عالم بجوے، تمہیں ثبات و صبر و استقلال بخشے ۔ آمین!

میں کہہ رہا تھا کہ حفاظت خلافت کی خدمت ہم پر لازم ہے جس کے لئے ہم کو حصول آزادی کی کوشش کرنی چاہئے ۔ اس مقام پر شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ حصول آزادی کی کوشش کو خدمت خلافت سے کیا واسطہ؟

اس کو مختصر طور پر سمجھ لیجئے اور ہندو دوستوں سے بھی التماس ہے کہ وہ بھی غور سے سنیں ۔ میں کہتا ہوں سوراج ہمارا مسئلہ ہے اور خلافت سے ہندوؤں کا قدیم تعلق ہے ۔ اوّل تو آزادی حاصل کرنا ہی ہر زندہ قوم کا نصب العین ہے ۔ دوسرے مسلمانوں کو تو مذہباً ایسا کرنا فرض ہے کہ وہ جس قدر جلد ہوسکے [1] کافر کی غلامی سے آزاد ہوجائیں اور خصوصیت کے ساتھ آج کل تو خدمت خلافت کا انحصار حصول آزادی پر ہے کہ جب تک ہم خود آزاد نہ ہوجائیں گے اس وقت تک دوسرے بھائیوں کو آزادی نہیں دلواسکتے ۔ باقی رہا میرا یہ دعوا کہ ہندوؤں کا تعلق خلافت سے بہت قدیم ہے اس کے لئے صرف ایک روایت "تحفۃ المجاہدین" کی پیش کرتا ہوں ۔ سنو، ملیبار کے راجہ نے خلافت سیدنا ابوبکر صدیق کے زمانے میں ایک وفد بھیجا تھا اور یہ پہلا دن تھا کہ ہندوستان و خلافت کا علاقہ قائم ہوا ۔ یہ میں نے اس واسطے عرض کیا کہ جو لوگ سوراج کو صرف ہندوؤں کا مسئلہ سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور جو لوگ خلافت کی جدّوجہد صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھتے ہیں وہ بھی صحیح دماغ نہیں رکھتے ۔ بے شک، مذہبی طور پر مسلمانوں کو خلافت کے ساتھ ایک ممتاز و ناگزیر وابستگی ہے ۔ مگر اس وقت سیاسی نہج سے ہر ہندو بھی مجبور ہے کہ وہ خلافت کے لئے جدّوجہد کرے اور ایسا کرنے میں وہ مسلمانوں

---

[1] یہاں کافر سے مراد نصارا ہیں

پر کوئی احسان نہیں کرتا اور نہ مسلمان ہندوؤں کی مدد کے محتاج ہیں بلکہ ہندوؤں کی سلامتی بھی اسی میں ہی کہ خلافت عثمانیا برقرار رہے۔ حالات بتاچکے اور مشاہدا درس دے گیا کہ ہندوستان میں امن و امان سے کوئی ہندو اور مسلمان بسر نہیں کر سکتا۔ جس وقت مسلمان ہندوستان میں ذلیل ہوے تو کیا ہندو بچ جائیں گے؟ اور اس وقت سے بہتر کہ خلافت کے سبب سب ہندو مسلمان متفق ہیں کیا کوئی دوسرا وقت ہندو بھی ایسا پالیں گے کہ ملکی حقوق اور پنجاب کے خون کا اِنصاف اور سوراج وہوم رول حاصل کرلیں گے؟ پس سیاسی نظر سے ہر ہند و کو مجبوراً مسئلۂ خلافت کی جدوجہد میں اتنا ہی حصہ لینا ہی جتنا مسلمان لے رہے ہیں اور ہر مسلمان کو حصول سوراج کے لئے اسی قدر سعی کرنا ہی جتنی ہندو کر رہے ہیں۔

دوستو، میں تمہارے علاقۂ کرنائک (جنوبی ہند) کے ہندوؤں میں خاص جوش اور مسئلۂ خلافت کے ساتھ اچھی دلچسپی اور عملی دلچسپی دیکھ کر بہت خوش ہوں اور یہاں کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی خوشگواری معلوم کر کے نہایت محظوظ ہو رہا ہوں اور اس کو ملک کی آزادی کے لئے نیک فال سمجھتا ہوں۔ خدا ہماری تمہاری مدد کرے۔ آمین!

ظفر علی خاں

متحدہ نظام عمل

[مرحوم ظفرعلی خاں کی ایک تقریر کے جو اُنھوں نے ۱۰ ستمبر ۱۹۲۱ع کو کلکتے میں کی تھی، بعض اقتباسات]

یورپ انسانیت، انصاف، مساوات، اخوت اور آزادی کے الفاظ کی شعبدہ‌بازی کے ہنر میں تو بہت طاق اور مشاق ہی۔ لیکن ان خالی خولی الفاظ و اقوال کے اندر جو مکر و ریا مضمر ہی اُس کا راز اب فاش ہوچکا ہی اور کوئی شخص یورپ کے ادعاے باطل کے ایک لفظ پر یقین نہیں رکھ سکتا۔ تمام ایشیا اس امر سے آگاہ ہو چکا ہی کہ یورپ کی شہنشاہیت سیاہ‌رنگ قوموں کو سیاسی اعتبار سے بالکل نابود کردینے پر تُلی ہوئی ہی۔ خلافت مقدسہ اسلامیہ آج تک مغرب کی اشتداد آمیز فوجیت اور مشرق کی حریت کے درمیان ایک سد سکندری بن‌کر کھڑی رہی ہی۔ یہ دیوار اتحادیوں کی طاقت سے منہدم ہوگئی ہی اور خلافت اسلامیہ کا تجزیہ سب سے بڑی مصیبت ہی جس کا سامنا نوع انسانی کو کرنا پڑا ہی۔

ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جن کو خداے تعالٰی نے کسی پُر اسرار معجزہ سے اس طرح متحد کردیا ہی کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھے لازم ہی کہ اس ہیبتناک حقیقت کو سمجھیں اور متحد ہوکر اِن ناپاک، منحوس طاقتوں‌کا مقابلہ کریں جواِن دونوں کی تہذیب و تمدن اور اِن کے شاندار زمانۂ ماضی کے آثار کو تباہی و بربادی میں ڈھکیل دینا چاہتی ہیں۔

چونکہ آج ہندوستان پر اور اس‌لئے ایشیا پر نہایت نازک وقت آگیا ہی اس لئے انڈین نیشنل کانگرس نے کلکتے کی تاریخی سرزمین پر ایک اجلاس خاص منعقد کیا اور اس مشترک پلیٹ فارم پر سے جس کی تعمیر خود خداے قادر وقیوم کے مقدس ہاتھوں کی رہین منت ہی اس آواز کی ایک قرنا پھونکی گئی ہی کہ اس وقت برطانیا کے اقتدار کے حواس درست کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ عدم تعاون ہی۔ یہ صرف جلیان والا باغ کا اعجاز ہی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون اکھٹا ہوکر ایک ندی میں بہا اور یہ خلافت کے

تجزیہ ہی کا معجزہ ہے کہ اس قسم کا اتحاد نمودار ہوا۔ مسلمانان کلکتا کو وہ حادثۂ فاجعہ یاد ہوگا جسے کچھ زیادہ مدت نہیں گذری۔ وہ حادثہ اسی مسجد میں رونما ہوا تھا۔ اس دن مسجد کا فرش محض اس لئے مسلمانوں کے خون سے لالہ رنگ ہوگیا تھا کہ انہوں نے اپنے مقدس رسولِ خدا کی شان میں سخت توہین کے خلاف اظہار غم و غصہ کیا تھا۔ اس وقت کوئی بنگالی ہندو لیڈر نظر نہ آتا تھا جو اس آفت میں ہمدردی و اخوت کے تقاضے سے مسمانوں کا ساتھ دیتا۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب تو دونوں قوموں کے دلوں کا ارتعاش بھی ہم آہنگ ہے۔ وذلک فضل اللہ۔

....

اب یہ تحریک (عدم تعاون) کوئی یک طرفہ نظامِ عمل نہیں رہی جو مسلمانوں نے ملک کے روبرو پیش کی ہو۔ اب یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا متحدہ نظام عمل ہے۔ اس لئے اسے متحد ہوکر غیرمتزلزل اور اٹل ارادے کا اعلان سمجھنا چاہئیے۔ نکتہ چین اور معترضین آپ حضرات سے کہیں گے کہ اس تحریک عدم تعاون کا نظام عمل ناممکن العمل ہے۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں اور متحدہ ہندوستان کو ان پر ثابت کردینا چاہئیے کہ یہ تحریک نہ تو طفلانہ ہے جیسا کہ اینگلوانڈین اخبارات کہتے ہیں اور نہ یہ وہمی و خیالی ہے جیسا کہ مہاتما گاندھی کے مایوس و ناکام مخالف ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں .....

...... مسلمانوں پر اس نازک وقت میں اسلام کی طرف سے عدم تعاون فرض اساسی عائد ہوتا ہے۔ لہذا انہیں اس میں کسی انحصار اور تامل کی گنجائش نہیں۔ اس معاملہ میں ایک مسلمان کا رویہ یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس تحریک کو فرض و واجب سمجھے۔ اس وقت مسلمان کا مذہبی فرض یہ ہے کہ یا تو ترک موالات کرکے شریعت کے احکام و ارشادات کی تعمیل کرے یا پھر ان بدبختوں کے ساتھ مل جائے گا جنھیں نجات و مغفرت کے فائدہ یزدانی سے ایک ریزۂ بھی نصیب نہیں۔

دو راہیں

« وقت آگیا ہی کہ لوگ دو راہوں میں سے ایک راہ
اختیار کرلیں۔ یا وہ قانون کی حمایت میں آجائیں اور
امن کی نگہداشت کریں و یاشورش و انقلاب کو
اپنا مقصد قرار دیں »

بنگال کاؤنسل کے افتتاحی اجلاس میں (لارڈ رانلڈشے) گورنر بنگال نے
یک معرکۃالآرا تقریر بیان فرمائی جس میں یوں کہنا چاہئے کہ آپ نے علی الاعلان حامیان
ترک موالات کو آزادی یا موت کا چیلنج دے دیا ہی۔ تقریر کی روانی سے کچھ
تعجب نہیں کہ کاؤنسل کے درو دیوار تک حرکت میں آگئے ہوں اور حاکمانہ تہدید
و جبارانہ تخویف سے بعید نہیں کہ میز کے گرد بیٹھنے والوں کے دل دہل
گئے ہوں لیکن حقیقت یہ ہی کہ امن پسندی کے اس آئینہ میں انتقام کے کتنے
جذبات جھلک رہے ہیں اور الفاظ کے شان و شکوہ میں ناکامیوں اور بے بسیوں
کے کتنے اعتراف پوشیدہ ہیں............

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ راہیں دو ہیں اور دونوں کی منزلیں جدا
جدا ہیں۔ ایک کا انجام سراسر خسراں و ناکامی، یکسر حسرت و محرومی
اور دوسرے کا حال مقصود کی کامیابی اور شادمانی ہی۔ پہلی راہ باطل کی ہی اور
دوسرے کا مآلِ کار مقصود کی کامیابی اور شادمانی ہی - پہلی راہ باطل کی ہی اور
دوسری حق کی۔ پہلی منزل محکومی و غلامی کی ہی اور دوسری منزل
آزادی اور حریت کی۔ حق کی راہ ابتدا سے انتہا تک تکلیفوں اور مصیبتوں
سے بھری ہی اور باطل کا راستا فانی لزتوں اور نعمتوں سے آراستہ ہی۔

مسافران راہ حق کے لئے صرف پھانسی کے تختے اور جیل کی چار دیواری میں امتحان کی چند ساعتیں ہیں اور رہ نوردان باطل کے لئے چند جھوٹی اور ناپائدار مسرتیں ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن حق کا انجام فتح و نصرت ہے، آزادی اور سوراج ہے اور باطل پرستی کے انعامات ذلت و رسوائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ملک کے لئے نازک سے نازک ساعتیں آرہی ہیں، جلد طے کر لینا چاہیے کہ آیا ہمیں وطن کی آزادی، مذہب کا اقتدار، خلافت عظمٰی کی بحالی زیادہ محبوب ہے یا غلامی کی لعنت اور محکومی کی رسوائی۔

پس اگر تم نے ملک اور وطن کی آزادی کو ترجیح دی تو اب یہ صاف ہو گیا کہ حکومت اپنے تمام ہتھیاروں، اپنی تمام طاقتوں، اپنی تمام تدبیروں اور ہوشیاریوں کے ساتھ تمہارے مقابلے میں آجائے گی۔ لیکن ایسی حالت میں تمہیں مقابلہ کس طرح کرنا چاہئے۔ تمہارے ہاتھ آگے تو بڑھیں لیکن کسی کی جان لینے کے لئے نہیں بلکہ ہتھکڑیوں میں پڑنے کے لئے۔ پاؤں آگے بڑھیں لیکن بیڑیاں پہننے کے لئے۔ سینے صرف گولیوں کے لئے ہوں اور لاشیں صرف تڑپنے کے لئے ہوں۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو یاد رکھو دھمکیوں کے جو بادل آج گرج رہے ہیں کل پھٹ جائیں گے اور غیظ و غضب کی جو بجلیاں آج کوند رہی ہیں کل تاریکی میں نہاں ہو جائیں گی۔

موت اپنی ساعت سے پہلے نہیں آسکتی اور تکلیفیں خدا کی مرضی کے بغیر تم پر پڑ نہیں سکتیں۔ پھر کیا تم فوجی نمائشوں سے مرعوب ہوجاؤ گے اور حکومت کی دھمکیاں تمہاری آزادی کی خواہشوں کو دل سے نکال دیں گی؟ اگر ایسا ہی تو ہم اپنے ایمان میں کچے ہیں اور ہمارے خدا پرستی کے دعوے غلط اور جھوٹ ہیں۔ جو خدا پرستی مشین گنوں سے سہم جائے اور توپوں سے خوف زدہ ہو جائے وہ نہ تو ایمان کی تعلیم ہے اور نہ شریعت کی تلقین۔

دنیا کا کوئی انقلاب قربانیوں سے خالی نہیں گیا اور حق کی کوئی فتح مظلومیت اور بے کسی سے پہلے نہیں آئی۔ اگر مصیبتوں کے بغیر خدا کسی شخص و قوم کو منزل تک پہنچادیتا تو اس کے سب سے پہلے مستحق محمد رسول اللہ صلعم ہوتے لیکن مکہ کی تیرہ برس کی زندگی اپنے سامنے رکھو اور غور کرو کہ کس طرح خاتم النبیین روحی فدہ نے پتھر کی چوٹیں کھائیں، آوازے سُنے جسم و جان کو مصیبتوں میں ڈالا۔ پھر ہماری گناہوں سے بھری ہوئی ہستیاں کیونکر مصائب کا سامنا کئے بغیر منزل تک پہنچ سکتی ہیں؟ ہم نے اس وقت جس طرح خدا کی نافرمانی کی اور جس طرح اس کی بخشی ہوئی نعمت آزادی کو اپنے ہاتھوں گنوایا اس کا کفارہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ہم خاموشی کے ساتھ گولیوں کا شکار نہ بنیں اور سنگینوں کی نوکیں ایک کلمۂ اُف کے بغیر ہمارے جسم کو نہ چھیدیں۔

• محکومی کی ذلت دنیا کی تمام ذلتوں سے بدتر ہے۔ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ پس فیصلہ کرلو کہ یا تو تمہارے ضعیف اور کمزور ہاتھوں سے ہندوستان کو آزادی کا دن نصیب ہو اور یا راس کماری سے ہمالیا تک کی چوٹیوں تک کی ساری آبادی جیل خانوں کے اندر بند ہو۔ ہندوستان کے بتیس کروڑ انسان اگر ایک ساتھ اس حیات کا رشتہ منقطع کردیں تو وہ غلامی اور رسوائی کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ مہلت ہاتھ سے جارہی ہے۔ سوچو اور جلد یا تو آزادی کی خدمت کو اپنا مستقر بناؤ اور یا صدیوں کے لئے اپنے آپ کو غلامی کے جنہم میں ڈال دو۔

آخری منزل اور ہمارا فرض

ہم نے گورنمنٹ کے تشدد کا ہمیشہ استقبال کیا۔ ہم نے صرف استقبال ہی نہیں کیا بلکہ آرزوئیں کیں۔ گورنمنٹ نے کراچی رزولیوشن کو جرم قراردیا تو ہم میں سے ہزاروں دلوں نے منتیں کیں کہ انہیں بھی گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن گورنمنٹ برابر قدم اٹھاکر پیچھے ہی ہٹتی رہی۔ اب پھر اُس نے قدم بڑھایا ہی۔ ہم اُس کا، اُس کے تمام ساز و سامان کا، اُس کے ہر طرح کے جبر و تشدد کا، اُس کے زیادہ سے زیادہ غیظ و غضب کا، اُس کے اِس آخری اعلانِ جنگ کا پوری آمادگی و قبولیت کے ساتھ استقبال کرتے ہیں اور ہمارا اعلان ہی کہ ہم آخرتک میدان کو پیٹھ نہ دکھلائیں گے۔

اب جبر و تشدد اور برداشت میں آخری مقابلہ شروع ہوگیا ہی۔ فتح کی ہوگی جو زیادہ طاقت‌ور ہوگا اور زیادہ دیر تک میدان میں ٹک سکے گا۔ اگر گورنمنٹ کی طاقت ملک کی برداشت سے زیادہ ہی تو جیت اُس کی ہی۔ اگر ملک کی برداشت گورنمنٹ کی طاقت سے زیادہ ہی تو ملک کی فتح‌مندی کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

اگر گورنمنٹ کا یہ آخری وار ہی تو ہم کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ سفر کی آخری منزل آگئی اور اس لئے ہم‌کو بھی آخری آزمائش کے لئے تیار ہوجانا چاہئے۔ ہم نے دو سال سے جس‌قدر اعلان کئے ہیں، اب وقت آگیا ہی کہ اُن میں ہر اعلان اپنی حقیقت کے لئے مطالبہ کرے۔ ہم نے دوسال سے جس قدر دعوے کئے ہیں، وقت آگیا ہی کہ اُن میں سے ہر دعوا اپنی سچائی کا دنیا کو یقین دلادے۔ ہم دو سال سے جو کچھ کہ رہے ہیں

وقت آگیا ہی کہ دنیا کو کر کے دکھلادیں۔ ہم نے ایمان کا اعلان کیا ہی۔ ہم نے خداپرستی کا دعوا کیا ہی۔ ہم نے سرفروشی اور جاں ستانی کا نعرا لگایا ہی۔ ہم نے قربانی و جاں بازی کا ہزاروں لاکھوں مرتبہ نام لیا ہی۔ ہم نے حق پرستی کے عہد کئے ہیں اور اسلام اور ملک سے عشق و محبت کا پیمانِ وفاباندھا ہی۔ ہم نے نامردی اور بزدلی کی ہمیشہ حقارت کی۔ ہم نے حق سے منہ موڑنے اور خدا کو منہ دکھلانے پر لعنتیں بھیجیں۔ ہم اُن پر ہنسے جو تکلیفوں اور مشکلوں سے گھبرا گئے۔ ہم نے اُن کی بد بختی و محرومی سے پناہ مانگی جو وقت پر اپنے دعوؤں میں پورے نہ اُترے۔ ہم نے خدا کا نام لیا اور اُس کی شریعت کے حکموں کی اطاعت کی راہ میں قدم اُٹھایا ....

یہ سب کچھ ہم نے اپنی مرضی اور اپنی طلب سے کیا۔ خدا اور اُس کے فرشتے ہماری زبانوں اور ہمارے دلوں پر گواہ ہیں۔ پھر اگر آج آزمائش کی گھڑی آگئی ہی اور منزل سامنے ہی جس کے ہم اس قدر دعوے کرچکے ہیں تو کیا ہم عین وقت پر اپنے تمام وعدے بھلا دیں گے؟ کیا اپنے تمام اعلان واپس لے لیں گے؟ کیا ہمارا دعوا دھوکا ثابت ہوگا؟ اور ہمارا اعلان محض فریب کا تماشا ہوگا؟ کیا ہم نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا؟ اور ہم نے اپنے ایمان اور حق کے لئے جو کچھ سمجھا دھوکا تھا؟ کیا ہم خدا اور اُس کی سچائی سے منہ موڑلیں گے؟ کیا ہم ایمان کی اس سب سے چھوٹی آزمائش میں بھی پورے نہ اُتریں گے؟ کیا مشکلیں ہم کو ہرا دیں گی؟ تکلیفیں ہمیں ڈرا دیں گی؟ اور گرفتاریوں کا ہراس ہمارے ایمان پر غالب آجائے گا؟

دنیا ہماری طرف تک رہی ہی۔ تاریخ کے صفحات ہمارے انتظار میں ہیں۔ ہزاروں لاکھوں شہیدانِ ظلم کی نگاہیں ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ سمرنا اور ایشیائے کوچک کی خوں آلودہ سرزمین سے ہمارے لئے صدائیں اُٹھ رہی ہیں۔

اور ہندوستان کی پامال سر زمین کا ایک ایک ذرّہ ہماری کھوج میں ہی۔ کیا ہمارا وجود ان سب کے لئے مایوسی ہوگا؟ کیا ہماری نامرادی و بدبختی کی سرگزشتیں لکھی جائیں گی؟ کیا تاریخ کو ہم صرف اپنی منحوس ناکامی ہی کی کہانی دے سکتے ہیں؟ کیا آنے والی نسلوں کی زبان پر ہمارے لئے صرف نفرتیں اور لعنتیں ہی ہوسکتی ہیں؟ کیا ہم دنیا کو اس بات کے لئے چھوڑ دیں گے کہ ہماری ایماں سے محرومی اور ہمت سے تہی دستی پر گواہی دے؟

آہ! یہی گھڑی ہی جو اس کا فیصلہ کرے گی۔ یہی وقت ہی جو ہمیشہ کے لئے ہماری فتح و شکست کا فیصلہ لکھ دے گا۔ آؤ، اپنی قسمت کی تعمیر کریں۔ اپنی عزت و اقبال کو ڈوبنے سے بچالیں۔ اپنی فتح کو شکست کے لئے نہ چھوڑیں۔ اسلام کے دامن کے لئے دھبّا نہ بنیں جو کبھی محو نہ ہو۔ ہندوستان کی آزادی اور نجات کی اُمید تاراج نہ کریں جو صدیوں تک واپس نہ مل سکے!

ہمارے کام کا راستہ بالکل صاف ہی۔ ہماری کامیابی کے لئے کوئی روک نہیں۔ یقیناً خدا کی رحمتوں نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم پر ایسی راہِ عمل کھول دی کہ جب تک ہم خود اپنے کو شکست نہ دینا چاہیں، کوئی ہمیں شکست نہیں دے سکتا۔

ہم نے اوّل دن ہی سے قربانی اور اِستقامت کا اعلان کیا ہی۔ قربانی سے مقصود یہ ہی کہ مقصد کی راہیں ہر طرح کی تکلیف و مصیبت جھیلتے رہنا۔ استقامت سے مقصود یہ ہی کہ راہ میں جمے رہنا اور کبھی اس سے منہ نہ موڑنا۔ پھر بتلاؤ۔ گورنمنٹ یا گورنمنٹ سے بھی کوئی بڑی طاقت اس کے مقابلے میں کیا کرسکتی ہی؟ کیوں کر وہ ہمیں روک سکتی ہی اور کس طرح ہم پر غالب

آسکتی ہی؟ فوج ہو تو اسے شکست دی جائے۔ قلعے ہوں تو انہیں ڈھادیا جائے۔ دیواریں ہوں تو اُنہیں گرادیاجائے۔ ہتھیار ہوں تو اُنہیں چھین لیا جائے۔ لیکن جو قوم قربان ہونے اور مٹنے کے لئے تیار ہوگئی ہو اور صرف قربان ہونا اور جان پر کھیل جانا ہی اس کی فوج اور ہتھیار ہو، اُس کا مقابلہ کس چیز سے کیاجائے گا؟ جسموں کو مارا اور ہتھیاروں کو چھینا جا سکتا ہی، لیکن دلوں کے عشق اور روحوں کے ایمان کے لئے نہ کوئی کاٹ ہی نہ کوئی آگ۔

اچھا، اب ایک ایک چیز کو گنو اور سوچو کہ ہمارے مقابلے میں کون کون سی طاقت لائی جاسکتی ہی؟

گورنمنٹ ڈرانے کے لئے پوری طرح ہیبت ناک ہی۔ لیکن بےخوفی کے مقابلے میں کیا کرے گی؟

گورنمنٹ احکام نافذ کر کے ہمیں روک دے سکتی ہی۔ لیکن جن لوگوں نے ٹھان لیا ہو کہ کبھی نہ رکیں گے اور نہ رک کر سب کچھ جھیلیں گے اُن کے مقابلے میں وہ کیا کرے گی؟

گورنمنٹ گرفتار کر کے قیدخانے بھردے گی۔ لیکن جو لوگ خود ہی قید ہونے کے لئے تیار ہیں اُن کے لئے قیدخانہ کی نمائش کیا کام دے سکتی ہی؟ سب سے آخری طاقت ہلاکت اور خوں ریزی کی طاقت ہی۔ بلا شبہ فوجیں جمع ہوسکتی ہیں، ہتھیار چمک سکتے ہیں، توپیں گرج سکتی ہیں، لیکن جو لوگ موت کے لئے خود ہی تیار ہوچکے ہوں اُن کے سامنے موت آکر کیا کرے گی؟

اظہر دہلوی

بیداری

باب پہلا، سین پانچواں .... (مردانہ مکان)

(بخشی کا اخبار ہاتھ میں لئے آنا)

بخشی۔ دبا جاتا ہی! دبا جاتا ہی!! پیارا وطن فوجی خرچ سے دبا جاتاہی!!! جب ملک مطالبہ کرتا ہی کہ ہندوستانی ملازموں کی تنخواہ بڑھاؤ اور ہندوستانی صنعت و تجارت کو ترقی دو تو کہا جاتا ہی کہ سرکاری خزانہ میں روپیہ نہیں۔ لیکن تیر و تفنگ اور گولی بارود پر نصف سے زیادہ ملکی آمدنی خرچ کردی جاتی ہی۔ آہ! یہ فوجی خرچ نہیں بلکہ خدا کا قہر ہی۔ اتنا فوجی خرچ کسی ملک میں نہیں۔ اتنا فوجی خرچ کوئی ملک برداشت ہی نہیں کرسکتا۔ پھر غضب یہ ہی کہ اس میں روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہی۔

(امرت کا آنا)

امرت۔ اور ہوم چارجز کے نام سے ہندوستان کا جو چالیس پچاس کروڑ روپیہ ہر سال انگلستان جاتا ہی وہ علاحدہ رہا۔ یہ روپیہ انگریزی افسروں کی پنشنوں، سرکاری ضروریات کی خرید، ریل اور نہروں کے قرضے جات اور کاؤنسل ہند پر خرچ کیا جاتا ہی۔

بخشی۔ کہیں خرچ ہو، ہندوستان سے تو ہر سال پچاس کروڑ روپیہ نکل ہی جاتاہی۔

امرت۔ اس کے علاوہ لاکھوں روپیہ ہر سال خفیہ پلیس پر فضول خرچ کیا جاتا ہی۔

بخشی- جب یہ حال ہو تو ہندوستانی روز بروز کیوں نہ مفلس ہوتے جائیں۔
ہندوستان میں ہیضہ اور طاعون کیوں نہ قیامت برپا کریں۔ اموات کی تعداد
کیوں نہ بڑھے اور ہندوستانی کیوں نہ موت کا لقمہ بنیں .... آہ!
غریب ہندوستانی مدتوں سے چلا رہے ہیں مگر اُن کی کوئی سنتا
ہی نہیں۔کانگرس نے کتنے رزولیوشن پاس کئے۔ مسلم لیگ نے کس
قدر قرار دادیں منظور کیں۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں ہوا۔

امرت۔ کیوں نہیں ہوا۔ جلیان والا باغ کی زمین لالہ زار بنادی گئی۔ بے گناہ اور
نہتے ہندوستانیوں کو مشین گنوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ مسلمان بھائیوں کی
خلافت پارہ پارہ کردی گئی اور ان کی فریاد مطلق نہیں سنی گئی۔

بخشی۔ بے شک، عدم تعاون ہی ہمارے درد کا علاج ہے۔ عدم تعاون کا سلسلہ
اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ قاتلان جلیان والا باغ کو
عبرت انگیز سزا نہیں دی جائے گی اور جب تک خلافت کا فیصلہ مسلمانوں
کے خیال کے مطابق نہیں کیا جائے گا اور ہندوستان کی آواز کو نہیں
سنا جائے گا۔

امرت۔ مگر یہ باتیں سوراج کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں۔

بخشی۔ بے شک، نہیں ہوسکتیں۔ اسی لئے کانگرس اور مسلم لیگ نے سوراج کو
اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔

بخشی۔ انگریز اب بھی ہماری ہی مدد سے ہندوستان پر حکومت کررہے ہیں۔

....

موہن۔ کیا؟ ہماری مدد سے!

بخشی۔ بے شک، ہماری مدد سے۔

امرت۔ اگر ہم ان کو مدد نہ دیں؟

بخشی۔ تو انگریز خود بخود یہاں سے چلے جائیں بغیر اس کے کہ زمین پر
خون کا ایک قطرا بھی گرے۔

موہن ۔ مگر ہم انگریزوں کو کس طرح مدد دے رہے ہیں؟

بخشی۔ حکومت، فوج، پُلیس، عدالت اور مختلف سرکاری محکموں کے مجموعہ
کا نام ہی اور ان تمام صیغوں کو ہم ہندوستانی چلارہے ہیں۔

موہن ۔ ہندوستانی؟

بخشی۔ بے شک، ہندوستانی۔ کیوں کہ اگر ہمارے ہندوستانی بھائی فوج، پُلیس،
عدالت اور تمام سرکاری محکموں کا کام چھوڑدیں تو حکومت کی
چلتی مشین بالکل رُک جائے، کیوں کہ اس قدر انگریز ولایت سے
ہندوستان نہیں لائے جاسکتے اور اگر آئیں بھی تو کام چلا نہیں سکتے
اس لئے کہ یہاں کی زبان نہیں جانتے۔

امرت۔ یہ تو سچ ہی۔

بخشی۔ یہی حال عدالتوں کا ہی۔ تحصیلدار، ڈپٹی، مجسٹریٹ اور جج سب
ہندوستانی ہیں اور وہی عدالتوں کا کام چلارہے ہیں۔

موہن ۔ مگر انگریز بھی تو ہیں۔

بخشی۔ ہیں، مگر وہ بالکل بے کار ہیں۔

امرت۔ کس طرح؟

بخشی۔ اس طرح کہ انگریز مجسٹریٹ ہندوستانی پیش کار کے بغیر کٹھ پتلی ہی۔ نہ فریق
مقدمہ کی بات خود سمجھ سکتا ہی نہ ان کو کوئی بات سمجھا سکتا ہی۔

موہن ۔ اچھا تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

بخشی۔ عدم تعاون اور اس کی اشاعت جیسا کہ کانگرس اور مہاتما گاندھی جی نے

حکم دیا ہی -

موہن - بے شک، ہمارے مرض کی بس یہی ایک دوا ہی -

بخشی- بس، تمہارا کام یہ ہی کہ ہندوستان میں دورا کرو- ہندو مسلمانوں کو اتحاد کا سبق پڑھاؤ- عدالتوں میں جانے سے روکو- جھگڑوں کے فیصلے پنچایتوں میں کراؤ- خان بہادروں اور رائے بہادروں سے خطاب واپس کراؤ - غیرملکی چیزوں کو لوگوں سے چھڑاؤ- اپنی چیزیں استعمال کرانا سکھاؤ- چرخے کو رواج دو- لیکن نرمی، محبت اور امن و امان سے - سختی کا بالکل دخل نہیں ہونا چاہئے-

موہن - بہت خوب-

امرت - بہت خوب-

باب دوسرا، سین پہلا

(مولانا حمید کا مکان)

بخشی- بےشک، وقت آگیا- ہندو مسلم اتحاد کا وقت آگیا- آہ! یہ دونوں بھائی بہت عرصہ تک ایک دوسرے سے بچھڑے رہے- ایک دوسرے سے بھاگتے رہے- لیکن اب مظلومیت نے دونوں کو ایک ہی زنجیر میں جکڑ دیا-

مولانا- جی ہاں، پلیس نے ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیاپال کے ہاتھوں میں ایک ہی ہتھکڑی لگا کر اس اتحاد پر مہر لگادی ہی-

بخشی- اور جلیان والا باغ میں ہندو مسلم خون مل گیا ہی- آج خلافت کی وجہ سے صرف مسلمان ہی مظلوم نہیں بلکہ تمام ہندوستان مظلوم ہی اور

مظلوموں میں اتحاد و اتفاق ہوجانا قدرتی بات ہی۔

موہن۔ گزشتہ جنگ جرمن میں ہندوستان نے انگلستان کو کیسی عظیم الشان امداد دی۔ سیکڑوں رپے اور ہزاروں آدمی قربان کردئیے۔

بخشی۔ بےشک، ہندوستان نے اپنے اکسٹھ ہزار تین سو اٹھانوے بچے نثار کردئیے۔

موہن۔ اس کے علاوہ ستر ہزار آٹھ سو انسٹھ زخمی ہوئے۔

لطیف۔ کروڑوں روپیہ عام ہندوستانیوں اور دیسی ریاستوں نے دیا۔

موہن۔ اس کے علاوہ فوجی امداد دی۔

بخشی۔ ہمارے لیڈر جنگی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ انھوں نے قراردادوں کی پُرزور تائید کی۔ خود مہاتما گاندھی جی نے ایک رزولیوشن کی تائید کی۔ اس کے بعد وہ بھرتی کراتے رہے۔

موہن۔ مگر جب وہ خونی دور ختم ہوگیا تو برطانیا نے طوطے کی طرح آنکھ بدل لی۔

بخشی۔ ہندوستانیوں کو امید تھی کہ ان جنگی خدمات کے صلہ میں ہندوستان کو ذمہ دار حکومت ملے گی۔ لیکن ملا کیا، رولٹ ایکٹ یعنی سیاہ قانون۔

موہن۔ اور جب اس لعنتی قانون کے خلاف ہندوستان نے آواز اُٹھائی تو جلیان والا باغ میں خون کی ندیاں بہادی گئیں۔ اُدھر خلافت کے پرخچے اُڑادئیے گئے۔

مولانا۔ خدا کی پناہ! مگر اس کا علاج کیا ہی؟

بخشی۔ بہت آسان ہی۔

مولانا۔ آخر کیا ہی؟

بخشی۔ اتفاق اور اتحاد۔

مولانا۔ اتفاق اور اتحاد؟

بخشی۔ جی ہاں، ہمارا باہمی اتفاق و اتحاد ہی وہ طاقت ہی جو ہندوستان کو
مظلومیت کے غار سے نکال کر عظمت کی چوٹی پر پہنچا سکتا ہی۔
یہی وہ ہتھیار ہو جس کی مدد سے ہم قاتلان جلیان والا باغ کو سزا
دے سکتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہی جس کے ذریعہ سے ہم خلافت کا
اسلامی نقطۂ خیال سے فیصلہ کراسکتے ہیں۔

مولانا۔ آپ درست فرمارہے ہیں۔ نااتفاقی اور لڑائی جھگڑے میں نقصان کےسوا
اور رکھا ہی کیا ہی۔

بخشی۔ آپ جانتے ہیں، ہم اب تک جو غلام چلے آتے ہیں یہ محض نااتفاقی کی
سزا بھگت رہےہیں، ورنہ اگر ہندوستانیوں میں اتفاق ہوتا تو ہماری
غلامی کی زنجیریں کبھی کی کٹ چکی ہوتیں۔

مولانا۔ آپ سچ فرماتے ہیں۔

بی اماں

خطبۂ صدارت

[۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ع کو احمد آباد میں آل انڈیا لیڈیز
کانفرنس ہوئی تھی جس کی صدارت بی اماں (والدۂ علی
برادران) نے کی تھی۔ صدر کی حیثیت سے انھوں نے جو
خطبہ پڑھا تھا اس کے اقتباسات یہاں دئے جاتے ہیں۔]

پیاری بہنو، ہمارا پہلا فرض یہ ہی کہ ہم خدا کےساتھ سچے رہیں اور اپنے
عقیدوں پر مضبوط و استوار۔ وہ شخص جو خدا کے ساتھ وفادار نہ ہو کبھی
بھی کسی گورنمنٹ کے ساتھ جسے انسان نے قائم کیا ہو وفادار نہیں رہ سکتا۔

اس کے بعد اس کی ضرورت ہی کہ ہم اپنے مابین اتحاد و اتفاق پیدا کریں۔ تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہی کہ ہمارے اس ملک میں جو مختلف قومیں اور فرقے آباد ہیں ان میں اتحاد و اتفاق کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے اور جس وقت تک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں میں کامل اتحاد و اتفاق نہ ہو ہم ملک کو آزاد نہیں کراسکتے اور نہ پُر امن و با عزت زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ تاریخ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہی کہ مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جس وقت برطانوی تجار ہندوستان میں اپنی تجارتی مہم پر آئے اس وقت انھوں نے یہ معلوم کیا کہ ان کی کامیابی کا انحصار ہماری پھوٹ اور تفریق پر ہی۔ چنانچہ جس وقت سے بیرونی حکومت یہاں قائم ہوئی ہی ہماری قوم نہایت تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کے سمندر میں غرق ہوتی چلی جارہی ہی۔ ہم عیش پسندی اور کاہلی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو دوسروں نے ہمارے لئے مہیا کی ہیں اور ہم نے یورپ کی اچھی عادتوں کے مقابلہ میں بری عادتیں سیکھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہی کہ ہم خداوندی قوانین اور اپنے ملکی مطالبات سے بہت جلد لاپرواہ ہوگئے۔ خدائے قادر و توانا جسے زندہ رکھنا چاہے اسے خواہ کتنا ہی زہر دیا جاوے لیکن وہ نہیں مر سکتا۔ جس روز گورنمنٹ نے ہندوستان کو رولٹ ایکٹ، پنجاب کی خوں ریزی اور خلافت کی تقسیم و تجزیہ کرکے دیا تھا وہی دن بیداری اور ہندوستان کی بحالیٔ قوت کا تھا۔ ہندوستان کو یہ معلوم ہوگیا ہی کہ اس کا علاج غیر ہمدرد برطانوی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہی بلکہ خود اس کے پاس ہی اور اب ہم خود ہی جدوجہد کرکے اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ جن مختلف امراض کا ہم شکار ہو رہے ہیں آپ اپنے کو نجات دلائیں۔

بہنو، خداوندی قانون مردوں اور عورتوں پر یکساں اثر ڈالتے ہیں۔ قومیں

مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جو فرائض مردوں پر عاید ہوتے ہیں ان سے عورتیں بھی مستثنا نہیں ہیں۔ ہندوستان کی یہ انتہائی بدنصیبی ہی کہ اس کی عورتیں عیش پسندی اور آرام طلبی کی زندگی کی زیادہ عادی ہوگئی ہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو کُلی حب الوطنی کے فرائض سے علاحدہ کرلیا ہی۔ زمانۂ موجودہ کے تاریخ پڑھنے والے کو اس بارے میں بہت زیادہ شک و شبہ پیدا ہوتا ہی کہ آیا نورجہاں، چاند بی بی، رانی لکشمی بائی آف جھانسی، زیب النساء، اہلیا بائی، پاربتی ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن خداوندِ عالم کا ہزار ہزار شکر و احسان ہی کہ اس نسل میں مسز گاندھی، مسز سروجنی نائڈو، انسویا بائی، سرلا دیوی چودھرانی، بیگم محمد علی، بیگم انصاری، بیگم خواجہ، بیگم حسرت موہانی، بیگم کچلو وغیرہم ایسی خواتین موجود ہیں جو اپنی ہمت و جذبات حب الوطنی اور عزم و استقلال میں شہرۂ آفاق ہیں اور جنھوں نے سچائی اور ملک کے لئے حیرت انگیز قربانیاں کی ہیں اور مجھے اس کا پورا اطمینان ہی کہ ہندوستان کا آئندہ مورخ مہاتما گاندھی اور دیگر لیڈران کے ساتھ ان خواتین کا نام لکھنا نہ بھولے گا جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہی۔

پیاری بہنو، تمہارے درمیان میں سیتا اور حضرت زینب کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے شوہر یا شہید کر دئے گئے ہیں اور یا تو قید خانوں میں ڈال دئے گئے ہیں۔ تمہارے درمیان میں حضرت بی بی فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور کنسکا کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے پیارے بچوں نے اپنے کو دھرم اور ملک کی قربان گاہ پر خوشی خوشی بھینٹ چڑھا دیا ہی۔۔۔۔۔۔۔۔

اپنے کو والنٹیروں کی حیثیت سے بھرتی کرانے کے متعلق میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب اس کا وقت آگیا ہی کہ ہر وہ مرد اور عورت جس میں ذرہ برابر

ایمان اورخودداری ہی اسے اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی فوج کا سپاہی سمجھنا چاہئیے۔ ہم ہندوستانیوں میں کا ہر مرد اور ہر عورت والنٹیر ہی خواہ مصلحت اور تیقن کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے تم معاہدہ پر دستخط نہ کرسکو۔

میں تم پر زور ڈال کر کہتی ہوں کہ پروردگار عالم کے سوا کسی سے نہ ڈرو لیکن اسی کے ساتھ اپنے کو کسی وقتی خیال سے مرعوب بھی نہ ہونے دو۔ ہمارے ملک کی حالت اب بہت زیادہ نازک ہی اور اس کے ساتھ ہمارا فرض بھی کچھ کم نازک نہیں ہی۔ قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ، لیکن اسی کے ساتھ اپنی مذہبی اور سوشل زندگیوں کی ذمہ داریوں کو بھی فراموش نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گی کہ جذبات کو مشتعل کر کے اپنی گرفتاری کا سبب نہ پیدا کرو۔ لیکن اسی کے ساتھ جب وہ پیش آئے تو اس سے بھاگو بھی نہیں۔ وہ تمہاری جراءت اور بےخودی کے ایک قدرتی نتیجہ کے طور پر وقوع میں آئے گی۔ تمہیں قرآن پاک اور شاستر کے احکامات کا پابند رہنا چاہئیے۔ یاد رکھو کہ جب ہمارے کل مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو اس وقت آزادی کے پھریرے کو تمہیں آتے دیکھنا پڑے گا۔

ابو الکلام آزاد

قولِ فیصل

[ابوالکلام آزاد کو نومبر ۱۹۲۱ع میں بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ انہوں نے مقدمہ کی کاروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن محض اظہار حقیقت کی خاطر آخر میں ایک مجرومی بیان دیا

جو ادبی حیثیت سے بھی ایک شاہکار ہی- اسی بیان
کے بعض اقتباسات یہاں دئے جاتے ہیں-]

تاریخ شاہد ہی کہ جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلہ میں ہتھیار اُٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہی- عدالت کا اختیار ایک طاقت ہی اور وہ انصاف و نا انصافی دونوں کے لئے استعمال کی جاسکتی ہی- منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل و حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہی، لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لئے اس سے بڑھ کر انتقام اور نا انصافی کا کوئی آلا بھی نہیں-

تاریخ عالم کی سب سے بڑی نا انصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں. دنیا کے بانیانِ مذاہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہی جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو- بلا شبہ زمانہ کے انقلاب سے عہد قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں- میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنۂ متوسطہ (مڈل ایجز) کی پُراسرار «انکویزیشن» وجود نہیں رکھتی- لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہی- وہ عمارتیں ضرور گرادی گئیں جن کے اندر خوف ناک اسرار بند تھے، لیکن داوں کو کون بدل سکتا ہی جو انسانی خودغرضی اور ناانصافی کے خوف ناک راروں کا دفینہ ہیں؟

عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہی- تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہوسکی- ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان

کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کئے گئے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہی جس کو صرف اس لئے زہر کا پیالا پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فلورنس کے فدا کار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہی جو اپنی معلومات و مشاہدات کو اس لئے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک اُن کا اظہار جرم تھا۔

. . . .

ہندوستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہی جیسا اقتدار ملک و قوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ اقتدار قومی بیداری کے نشوونما اور آزادی و انصاف کی جدوجہد کو مبغوض رکھتا ہی کیوں کہ اس کا لازمی نتیجہ اُس کی غیر منصفانہ طاقت کا زوال ہی اور کوئی وجود اپنا زوال پسند نہیں کرسکتا اگرچہ از روے انصاف کتنا ہی ضروری ہو۔ یہ گویا تنازع للبقاء (Struggle For Existance) کی ایک جنگ ہوتی ہی جس میں دونوں فریق اپنے اپنے فوائد کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ قومی بیداری چاہتی ہی کہ اپنا حق حاصل کرلے۔ قابض طاقت چاہتی ہی کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ کہاجاسکتاہی کہ پہلے فریق کی طرح آخرالذکر بھی قابل ملامت نہیں کیوں کہ وہ بھی اپنے بچاؤ کی خاطر ہاتھ پیر مارتاہی۔ یہ دوسری بات ہی کہ اس کا وجود انصاف کے خلاف واقع ہوا ہو۔ ہم طبیعت کی مقتضیات سے تو انکار نہیں کرسکتے۔ یہ واقعہ ہی کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہی۔ وہ خود کتنی ہی قابل ملامت ہو لیکن زندگی کی خواہش تو قابل ملامت نہیں ہی۔

ہندوستان میں بھی یہ مقابلہ شروع ہوگیا ہی۔ اس لئے یہ کوئی غیرمعمولی

بات نہیں ہی۔ اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد
جرم ہو اور اُن لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق خیال کرے جو انصاف
کے خیال سے اس کی غیرمنصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کررہے ہیں، میں
اقرار کرتاہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ اُن لوگوں میں ہوں
جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم میں تخم ریزی کی ہی اور اس کی آب یاری
کےلئے اپنی پوری زندگی وقف کردی ہی .... اگر گورنمنٹ مجھے اپنے
خیال میں مجرم سمجھتی ہی اور اس لئے سزا دلانا چاہتی ہی تو میں پوری
صاف دلی کے ساتھ تسلیم کرتاہوں کہ یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں ہی جس
کےلئے مجھے شکایت ہو۔

میں جانتاہوں کہ گورنمنٹ فرشتہ کی طرح معصوم ہونے کا دعوا
رکھتی ہی کیوں کہ اس نے خطاؤں کے اقرار سے ہمیشہ انکار کیا ہی۔ لیکن
مجھے یہ بھی معلوم ہی کہ اس نے مسیح ہونے کا کبھی دعوا نہیں کیا۔ پھر میں
کیوں امید کروں کہ وہ اپنے مخالفوں کو پیار کرے گی؟ وہ تو وہی کرے گی
جو کررہی ہی اور جو ہمیشہ استبداد نے آزادی کے مقابلہ میں کیا ہی۔ پس
یہ ایک ایسا قدرتی معاملہ ہی جس میں دونوں فریق کے لئے شکوہ و شکایت کا
کوئی موقع نہیں۔ دونوں کو اپنا اپنا کام کئے جانا چاہئے۔

. . . .

یقیناً میں نے کہا ہی «موجودہ گورنمنٹ ظالم ہی۔» لیکن اگر میں یہ نہ
کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ مجھ سے کیوں یہ توقع کی جائے کہ
ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے
انکار کرتاہوں۔

میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتاہوں

یہی ہے۔ ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو میرے علم میں کوئی نہیں۔

میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں: گورنمنٹ نا انصافی اور حق تلفی سے باز آجائے۔ اگر باز نہیں آسکتی تو مٹادی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جاسکتے ہیں۔ جو چیز بری ہے اسے یا تو درست ہوجانا چاہئے یا مٹ جانا چاہئے۔ تیسری بات کیا ہوسکتی ہے؟ جب کہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ وہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔

.

. . . .

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لئے کیسے ہی خوش نما نام کیوں نہ رکھ لئے جائیں لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک اور قوم کو نجات دلاؤں۔

«اصلاحات» اور «بتدریج توسیع اختیارات» کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کرسکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے۔ یہ کہنا کہ کسی قوم کو اُس کی آزادی بتدریج

ملنی چاہئے بعینہ ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ مالک کو اُس کی جائداد اور قرض دار کو اُس کا قرض ٹکڑے ٹکڑے کرکے دینا چاہئے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مقروض سے ایک ہی دفعہ قرض واپس نہ مل سکے تو قرض دار کو یہی کرنا پڑے گا کہ قسط کی صورت میں وصول کرے لیکن یہ ایک مجبوری کا سمجھوتا ہوگا۔ اس سے یک دفعہ وصولی کا حق زائل نہیں ہوجاسکتا۔

" رفارم" کی نسبت میں روس کے عظیم الشان لیوٹالسٹائی (Leo Tolstoy) کے لفظوں میں کہوں گا " اگر قیدیوں کو اپنے ووٹ سے اپنا جیلر منتخب کرلینے کا اختیار مل جائے تو اس سے وہ آزاد نہیں ہوجائیں گے۔"

....

اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے جو نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لئے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خودغرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقت ور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگانِ خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹادئے اور بتلادیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ، معیار فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے کام سب سے اچھے ہوں۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ! ۞ (سورۂ حجرات)

انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مشہور مورخ گبن کے لفظوں میں «اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا۔» پیغمبر اسلام اور اُن کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی اور صرف قوم کی رائے۔ نیابت اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لئے موجود ہیں شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں پائے جائیں۔ اسلام نے بادشاہ کے اقتدار اور شخصیت سے انکار کیا ہے اور صرف ایک رئیس جمہوریت (پریزیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے۔ لیکن اُس کے لئے بھی «خلیفہ» کا لقب تجویز کیا جس کے لغوی معنی نیابت کے ہیں، گویا اُس کا اقتدار محض نیابت ہے۔ اس سے زیادہ وہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اسی طرح قرآن میں نظام حکومت کے لئے «شوریٰ» کا لفظ استعمال کیا، وامرھم شوریٰ بینھم۔ چنانچہ ایک پوری سورت اسی نام سے قرآن مجید میں موجود ہے۔ «شوریٰ» کے معنی باہم مشورہ کے ہیں، یعنی جو کام کیاجائے جماعت کی باہم رائے اور مشورہ سے کیاجائے۔ شخصی رائے اور حکم سے نہ ہو۔ اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لئے کیا ہوسکتا ہے؟

. . . .

موجودہ گورنمنٹ محض ایک ناجائز بیوروکریسی ہے۔ وہ کروڑوں انسانوں کی مرضی اور خواہش کے لئے محض نفی ہے۔ وہ ہمیشہ انصاف اور سچائی پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ جلیانوالا باغ (امرتسر) کا وحشیانہ قتل عام جائز رکھتی ہے۔ وہ انسانوں کے لئے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی کہ چارپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں۔ وہ بے گناہ لڑکوں کو صرف اس لئے تازیانے کی ضرب سے بے ہوش ہوجانے دیتی ہے کہ کیوں ایک بت کی

طرح یونین جیک کو سلام نہیں کرتے - وہ تیس کروڑ انسانوں کی پیہم التجاؤں پر بھی اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی- وہ اپنے تمام وعدوں کو توڑ دینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی- وہ سمرنا اور تھریس کو صریح نامنصفانہ طور پر یونانیوں کے حوالہ کردیتی ہی اور پھر تمام اسلامی آبادی کے قتل و غارت کا تماشا دیکھتی ہی-

انصاف کی پامالی میں اس کی جراءت ان تھک اور دلیری بالکل بےباک ہی اور حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے اس کے منہ میں کوئی لگام نہیں- سمرنا میں ۷۰ فی صدی مسلمانوں کی آبادی ہی- مگر وزیراعظم بغیر کسی شرمندگی کے مسیحی آبادی کی کثرت کا اعلان کردیتا ہی - یونانی حکومت تمام اسلامی آبادی کو خون اور آگ کے سیلاب میں غرق کردیتی ہی - لیکن وہ بے دھڑک ترکی مظالم کی فرضی داستانیں بیان کرتا رہتا ہی اور خود انگلستان کے بھیجے ہوئے امریکن کمیشن کی رپورٹ پوشیدہ کردی جاتی ہی -

پھر نہ تو ان تمام مظالم و جرائم کے لئے اس کے پاس اعتراف ہی نہ تلافی، بلکہ ملک کی جائز اور باامن جدوجہد کو پامال کرنے کے لئے ہر طرح کا جبر و تشدد شروع کردیا جاتا ہی اور وہ سب کچھ کیا جاتا ہی جو گذشتہ ایک سال کے اندر ہوچکا ہی اور ۰۰۰۰۰۰ اس وقت تک ملک کے ہر حصہ میں ہورہا ہی- میں اگر ایسی گورنمنٹ کو "ظالم" اور "یا درست ہوجاؤ یا مٹ جاؤ" نہ کہوں تو کیا "عادل" اور "نہ درست ہو نہ مٹو" کہوں؟

کیا صرف اس لئے کہ ظالم طاقتور ہی اور اس کے پاس جیل ہی اس کا حقدار ہوجاتا ہی کہ اُس کا نام بدل دیا جائے؟ میں اٹلی کے نیک اور حریت پرست جوزف میزینی (Mazzini) کی زبان میں کہوں گا "ہم صرف اس لئے کہ تمہارے ساتھ عارضی طاقت ہی تمہاری برائیوں سے انکار نہیں کرسکتے-"

. . . .

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت گارڈینیوبرونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا:

"زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جاسکتی ہو بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتاہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیداہوگی اُس کا عشرِعشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔"

مسٹر مجسٹریٹ، اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہی جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہی۔ تمہارے حصہ میں مجسٹریٹ کی وہ کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہی جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ، اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کردیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہی اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہی۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازا کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہی۔ وقت اُس کا جج ہی۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اُسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ والحمدُ للّٰہِ اوّلاً وآخراً۔

چودھری عبدالغنی

۱- ہندوستان اور پلیگ[1]

ہندوستان کے اکثر مقامات میں پلیگ کا مرض دیگر جسمانی امراض کی طرح جاگزیں ہو گیا ہی۔ ۰۰۰۰۰ حکومت کے محکمۂ حفظانِ صحت کی طرف سے مختلف عملی اور نظری تجاویز پیش کی جاتی ہیں، مگر امراض میں روزافزوں ترقی ہی اور خاص کر پلیگ تو مستقل طور پر ہندوستانی امراض کا ایک جز بن گیا ہی۔ کبھی چوہوں کو مارنے کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اور کبھی صفائی وغیرہ کے متعلق لوگوں کو ہدایات دی جاتی ہیں۔ مگر ان تمام کوششوں کا نتیجہ نہایت مایوس کن ہی۔ سوال یہ ہی کہ آخر ہندوستان میں آج کل مختلف جسمانی امراض کا کیوں اضافہ ہورہا ہی؟ اس جواب کے لئے کسی بڑے شہر کا معائنہ کیجئے۔ شہر کا بہترین حصہ سفید آبادی کی نذر ہوجاتا ہی۔ بلدیہ کی آمدنی کا کثیر حصہ اُس حصہ کی سڑکوں اور راستوں کی صفائی پر صرف کردیاجاتا ہی اور سفید آبادی کی تفریح گاہوں کی وسعت کی خاطر اصلی باشندوں پر زمین تنگ کردی جاتی ہی۔ غریب باشندے تنگ و تاریک مکانات میں رہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور اُن کے مکانات وغیرہ کی صفائی کا کام اُنھیں پر چھوڑدیاجاتا ہی۔ اس پر غربت و افلاس کا یہ عالم ہی کہ اکثر کو پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ ہندوستان کی تمام پیداوار دوسروں کے کام آتی ہی اور بے چارے ہندوستانی روزبروز فاقہ کشی پر مجبور ہورہے ہیں جس کا نتیجہ

---

[1] یہ مضمون روزنامۂ خلافت، (بمبئی) میں ۳۰ اپریل ۱۹۲۳ع کو چھپا تھا اور اس پر حکومتِ بمبئی کی طرف سے اڈیٹر سے ایک سال کے لئے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی گئی تھی جس کے انکار پر اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور بالآخر ایک سال کی سزائے قید ہوئی۔

یہ ہی کہ اگر متعدی امراض کسی شہر میں نمودار ہوتے ہیں تو وہاں کی کثیر ہندوستانی آبادی کو نیست و نابود کرنے کے علاوہ دیہات میں بھی پھیل جاتے ہیں۔

لہذا وبائی امراض کی اصل وجہ ہندوستان کا ہمہ گیر افلاس ہی جو سلطنت برطانیا کی شہنشاہیت کا نتیجہ ہی۔ جب تک اس شہنشاہیت کا خاتمہ نہ ہوجائے ہندوستان کا افلاس رفع نہیں ہوسکتا اور جب تک افلاس کی فارغ البالی نصیب نہ ہوجائے مختلف امراض کا نمودار ہونا یقینی ہی۔ لہذا پلیگ کے انسداد کے لئے چوہوں کو مارنے کی مہم کے ساتھ ساتھ اُن چوہوں سے نجات حاصل کرنا بھی ضروری ہی جو ہندوستان کے پیٹ میں گھس گئے ہیں اور غریب ہندوستانیوں کی مالی اور اقتصادی تباہی و بربادی کا باعث ہورہے ہیں۔ اس اقتصادی بربادی کا علاج حکومتِ ہند کا محکمۂ حفظانِ صحت نہیں کرسکتا بلکہ خود ہندوستانی ہی کرسکتے ہیں۔ کاش تمام ہندوستانی متفقہ طور پر اس عالمگیر مالی اور اقتصادی پلیگ کا جلد انسداد کریں! پھر دیکھ لیجئے گا کہ پلیگ کے چوہے خودبخود بھاگ جائیں گے اور ہندوستان کو آرام و چین کے دن نصیب ہوں گے۔

ایران کے ایک محبِ وطن سے ایک دفعہ کسی نے شکایت کی تھی کہ بمبئی کی آب و ہوا نہایت خراب ہی۔ اُس نے کیا اچھا جواب دیا کہ "جب موجودہ حکومت سے شہر آزاد ہوگا تو انشاءاللہ تعالی آب و ہوا بہت اچھی ہوجائے گی۔" کاش ہمارے ہندوستانی بھائی ایک ایرانی محبِ وطن کے الفاظ پر غور کرکے تمام ہندوستان کی آب و ہوا کو مغربی اثرات سے پاک و صاف کردیں اور آزادی کی جدوجہد تکمیل تک پہنچادیں!

قفلِ بے کلید

. . . .

ڈائرکٹر معلوماتِ عامہ کی نوازش سے «بکار سرکار» ایک طویل و عریض لفافہ موصول ہوا جس میں ایک ٹکٹ بند تھا۔ اس ٹکٹ نے اطلاع دی کہ ۱۸ جنوری کو ۱۱ بجے دن کے وائسرائے مجالس قانون ساز کے لئے جو محل تیار ہوا ہے اس کا افتتاح فرمائیں گے۔ تارک موالات ہوں۔ حکومت کی بے وفائی پر وفاداری کا حلف نہ اُٹھانے کا حلف اُٹھا چکا ہوں۔ اسمبلی اور کاؤنسلوں کی جنگ زرگری کو شاعری سے زیادہ کار بے کاراں سمجھتا ہوں بلکہ اس کی میری نگاہ میں چخ دنداں سے زیادہ وقعت نہیں۔ مگر ملک و ملت کی خبر گیری نے خبررسانی کو میرا پیشا بنادیا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی اسمبلی کے اجلاس میں جاکر کامریڈ کے ذریعے اسمبلی والوں کی خبر لیا کرتا تھا۔ مگر سال بھر سے وہ سلسلہ بھی بند تھا۔ البتہ ہمدرد نے مجبور کیا کہ اس افتتاحی جلسے میں شریک ہوں اور دیکھوں کہ کیا ہوتا ہے اور سنوں کہ کیا ملتا ہے۔

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مقامی معاصرین نے نہ معلوم کس بنا پر توقعات کا پہلے ہی سے ایک طومار باندھ رکھا تھا ۰۰۰۰۰ چنانچہ کل کے اخبارات میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ کمیشن کے مرادوں کے دن جلد آنے والے ہیں۔ «اصلاحات» کی توسیع کے لئے شاہی تقرر کا غالباً آج کی تقریر میں حضور وائسرائے اعلان فرمائیں گے۔

کتنے سادہ لوح ہوں گے جو اپنے دلوں میں اس آرزو کو چھپائے ہوئے امید و بیم کی حالت میں رائے سینا گئے ہوں گے! کتنے اور ہوں گے جن کا اُصول زندگی عشاق کی طرح یہی ہو کہ

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

یہ نام کے عاشق اسی میں مگن ہیں کہ اصلاحات کی توسیع کے لئے شاہی کمیشن مقرر ہو یا نہ ہو نائب شہنشاہ کا درشن تو نصیب ہوگا۔ اسی سے بھاگ کھلیں گے۔ ملک کی وارث خالق کے حکم سے تو خلق ہی تھی مگر اس نے بادشاہت اور شہنشاہیت کے فریب میں آکر اپنی آزادی کیا بلکہ ملکیت کو بھی غلامی کے عوض کبھی کا بیچ دیا اور وہ حقیقت شناس ہستیاں بھی جن سے توقع کی جاسکتی تھی کہ انی جاعل فی الارض خلیفہ کے ترکے کو کبھی کسی کے فریب میں آکر نہ چھوڑیں گی وہ بھی بظاہر دولت و ثروت سے محروم ہوکر اس فریب دہی پر مجبور تھیں کہ بادشاہوں کو دیکھ کر قصیدوں میں لکھیں کہ

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریب طغرل و سنجر کھلا

جب خواص کی ذہنیت کی یہ حالت ہو تو اس "درشنیہ" فرزند سے جس کا نام خلق ہی کیا توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے سوا کسی اور کو ملک کا حقیقی وارث نہ جانے گی اور کم سے کم کل کے آئے ہوئے ایک اجنبی کو ملک کا وارث سمجھ کر دیکھنے نہ جائے گی۔ کاش! طغرل و سنجر کے فریب کی طرح قیصر ہند اور نائب قیصر ہند کا فریب کھل جاتا اور کوئی ان تماشائیوں سے کہتا کہ

ای تماشاگاه عالم روی تو
تو کجا بهر تماشا می روی

بتیس کروڑ خدا کی مخلوق یعنی نسل انسانی کا خمس ایک مٹھی بھر اجنبیوں کی غلامی میں مبتلا ہی جو سات ہزار میل کے فاصلہ سے سات سمندر پار آکر ان پر حکومت کرتے ہیں۔ عجوبۂ روزگار یہ چیز ہی اور پانچ براعظموں کے تماشائی دوردراز مقامات سے آکر تاج بی بی کا روضہ اور دلی کا لال قلعہ یا قطب مینار کی جگہ اس کا تماشا کریں تو تعجب کی بات نہیں۔ لیکن آج یہ مخلوق خود دوسروں کی تماشائ ہی۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو ای دہقاں ذرا
دانہ‌تو، کھیتی بھی‌تو، باراں بھی‌تو، حاصل بھی‌تو

آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہی تجھے؟
راہ تو، رہ‌رو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

کانپتا ہی دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا؟
ناخدا تو، بحرتو، کشتی بھی‌تو، ساحل بھی‌تو

دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں بھی کبھی
قیس‌تو، لیلابھی‌تو، صحرا بھی تو، محمل بھی‌تو

وای نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا!
می بھی‌تو، مینابھی‌تو، ساقی بھی‌تو، محفل بھی‌تو

اسی دانے کو، اسی کھیتی کو، اسی باراں کو، اسی حاصل کو، اسی راہ کو، رہ‌رو کو، رہبر کو، منزل کو، اسی ناخدا کو، بحر کو، کشتی کو، ساحل‌کو،

اسی قیس کو، لیلا کو، صحرا کو، محمل کو، اسی مے کو، مینا کو، ساقی کو، محفل کو آوارۂ عناں‌تاب رائےسینا کی سڑکوں پر دیکھا کہ داخلہ کے ٹکٹ ہاتھ میں لئے ہوئے جارہی ہیں گویا وہ بھی کسی تاریخی خاندان کا شجرا یا جنت کے لئے پروانۂ راہداری ہے۔ ''منزل مقصود'' پر پہنچے تو گو اپنا دل بھی یہی کہتا تھا:

یاں قافلہ لٹتا ہے، بس اب یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہدے گا کہ منزل تو نہیں یہ

لیکن ہزاروں کو یہی منزل مقصود معلوم ہوتی ہے۔ ہر ملت اور ہر طبقہ کے لوگ تھے اور سب سے زیادہ نمایاں وہ وارثان تاج و تخت تھے جو نائب‌السلطنت کے سیدھے ہاتھ پر جلوہ کناں تھے جن میں سورج بنسی بھی تھے اور چندر بنسی بھی۔ مگر ...... ان کی درخشانی اس قطرۂ شبنم کی درخشانی تھی جس پر

صبح دم دروازۂ خاور کھلا — مہر عالم تاب کا منظر کھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو راز مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازی‌گر کھلا
سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگار آتشیں رخ، سر کھلا
تھی نظر بندی، کیا جب ردِّ سحر — بادۂ گل‌رنگ کا ساغر کھلا
بزم سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ ''امن و اماں'' کا در کھلا

جو گذشتہ دو تین سال کے اندر اس فرقے پر گذر چکا ہے اس کا خیال

کرتا ہوں تو ان آواز بلند کرنے والے آلات سے جو نائب السلطنت کے نمگیرہ کے سامنے نصب تھے صاف سنائی دیتا تھا:

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

لیکن اس بھری محفل میں عوام کے سوا ایک فرقہ تھا جس کی نظر اپنے آغاز و انجام پر نہ تھی۔ یادش بخیر! تعلیم یافتہ جماعت کس سے کم مخمور تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ ساقی کی نشیلی آنکھ نے ایک کو ہوشیار نہ چھوڑا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ع اور سنہ ۱۹۲۱ع کا سرور اب کہاں تھا۔ مگر اب بھی خمار باقی تھا۔ یہ سادہ و پرکار اب بھی سمجھ رہے تھے کہ لاٹ صاحب دارالضرب قوانین کا دروازا کھولیں گے اور ہم جاکر اجنبی حکومت پر اپنی لفاظی کا سکہ جمائیں گے اور چند ہی دن میں فتح کے شادیانے بجائیں گے۔

. . . .

وائسرائے کی تقریر سنی اور ضرور سنی۔ حضور رس نہ تھا مگر (Loudspeakers) یعنی آلہائے ترفیع الاصواب نے ایک ایک حرف بلکہ کھانسی کھکار تک سنوادی مگر گوش مژدہ نیوش ساری تقریر میں ایک حرف مطلب بھی نہ سن سکا۔ سارے ملک میں سرکار والا تبار کے قدوم میمنت لزوم نے تفریق و انتشار پھیلا رکھا ہے۔ لیکن لاٹ صاحب بہادر نے فرمایا کہ یہ قانون سازی کا گول گھر اتحاد کی علامت ہے اور ملک کے اتحاد کی نہیں بلکہ سرکار ابدقرار کی ابدیت کی بھی نشانی ہے اور کیوں نہ ہو ہمارے تعلیم یافتہ ہمیشہ ہمیشہ اسی چکر میں رہیں گے اور یہ دائرۃالسوء اسی طرح تاقیامت باقی رہے گا۔ اگر غالب آج زندہ ہوتے تو آج بھی کہتے مگر ایک اور

لہجے میں کہ

جانتا ہوں ہی خط لوح ازل　　تم پہ ای خاقان نام آور کھلا
تم کرو صاحب قرانی جب تلک　　ہی طلسم روز و شب کا در کھلا

خیال تھا کہ کم‌ازکم شاہی کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوگا مگر صرف دعا پر تقریر کا خاتمہ ہوا۔ دوا کا نام بھی نہ تھا۔ صاحب نے دعا فرمائی کہ خدا اس عمارت میں کام کرنے والوں کو عقل کی توفیق دے۔ ہم سوائے آمین کے کیا کہہ سکتے ہیں۔ خدایا، اِن کو عدل نہیں دیتا تو ہمیں عقل دے کہ اس فریب عدل سے نجات پائیں۔ اب سب کی نظریں سنہ ۲۹ء پر لگی ہوئی ہیں۔ لیکن جوکچھ ہوگا ہمیں معلوم ہی۔ کمیشن کا تقرر ہی جس قوم کا اُفق آرزو ہو اسے کیا ملے گا؟

جب لاٹ صاحب خراماں خراماں دروازے تک گئے اور کنجی ہاتھ میں لے کر تالا کھولا تو نہ معلوم اوروں پر کیا گذری، مگر ایک شخص بے کس و ناکس اس مجمع میں بیٹھا سنہ ۱۹۲۱ء کا خیال کر کے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا　　کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا!
ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے　　یار کا دروازا پائیں گر کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک　　میری حد وسع سے باہر کھلا

تھا درِ وابستہ قفل بے کلید
کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا؟

ظفر علی خاں

دعوت عمل

اگر تم کو حق سے ہو کچھ بھی لگاؤ
تو باطل کے آگے نہ گردن جھکاؤ

حکومت کو تم نے لیا آزما
اب اپنے مقدر کو بھی آزماؤ

ہو تم جس کے ذرے وہ ہو خاک ہند
چھپے ہیں جو اس میں وہ جوہر دکھاؤ

فلک پر مہ و مہر پڑ جائیں ماند
زمیں پر اس انداز سے جگمگاؤ

ہمالا بھی آجائے گر راہ میں
تو ٹھکرا کے آگے سے اس کو ہٹاؤ

کرے تم سے گنگا بھی گر بے رخی
پلٹ کر اُلٹ دو تم اس کا بہاؤ

زمانے میں روشن کرو نام ہند
ہر اقلیم میں اس کا سکا چلاؤ

ہر اک ملک کا ہاتھ میں لے کے دل
ہر اک قوم سے اپنی عزت کراؤ

پسینا گرے ہندوؤں کا جہاں
وہاں تم مسلمان کا خوں بہاؤ

زمیں ہو جب اس خون سے لالہ زار
تو اس پر بساط اخوت بچھاؤ

پرانا ہوا دفتری اقتدار
سمجھ لو اب اس کا بھی ہو چل چلاؤ

کسی روز خود غرق ہو جائے گی
بہت بہ چکی ہی یہ کاغذ کی ناؤ

ظفر علی خاں

اعلان جنگ

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کردیا
باطل سے حق کو دست و گریبان کردیا

سر رکھ دیا رضاے خدا کی حریم پر
خنجر کو پھر حوالۂ شیطان کردیا

ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادیٔ حیات کا سامان کردیا!
دشمن میں اور دوست میں ہونے لگی تمیز
کتنا بڑا یہ ملک پہ احسان کردیا
دے کر وطن کو ترک موالات کا سبق
ملت کی مشکلات کو آسان کردیا
شیخ اور برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد
گویا انہیں دو قالب و یک جان کردیا
اوراق جبر و جور و جفا کو بکھیر کے
شیرازہ سلطنت کا پریشان کردیا
ظلم و ستم کی ناؤ ڈبونے کے واسطے
قطرے کو آنکھوں آنکھوں میں طوفان کردیا
تن من کیا نثار خلافت کے نام پر
سب کچھ خدا کے نام پہ قربان کردیا
پروردگار نے کہ وہ ہو آدمی شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کردیا

جوش ملیح آبادی

شکست زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہی، گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آآکر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہی توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہی دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سرخی ہی، بے نور ہی چہرا سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہی، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارسیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

ظفر علی خاں

انقلاب

گر ہماری طرح تم بھی غیر کے محکوم ہو
پھر ذرا تم کو بھی قدر عافیت معلوم ہو

ظلم کو انصاف کہلینا تو آساں ہی مگر
قائل اس منطق کے ہم جب ہوں کہ تم مظلوم ہو

وقت آپہنچا کہ برپا ہو نیا اک انقلاب
اور یہ نظم زندگی بار دگر منظوم ہو

وقت آپہنچا کہ ہو تقسیم قوموں کی نئی
اک نئی دنیا ہو اور اس کا نیا مقسوم ہو

وقت آپہنچا کہ ہونابود تہذیب جدید
ہست و بود اس کا وجود نقطۂ موہوم ہو

وقت آپہنچا کہ محنت کا ملے بندوں کو اجر
ساعت آپہنچی کہ جو خادم ہی وہ مخدوم ہو

«انتم الاعلون» کا غل مچ رہا ہو عرش پر
اور پرستارانِ حق کی قدسیوں میں دھوم ہو

ظفر علی خاں

قانونِ وقت

حق کا نہ کر اظہار کہ قانون یہی ہی
فرماتی ہی سرکار کہ قانون یہی ہی

پھٹ جائے جو تلی تو نہ ٹھوکر سے گلہ کر
مر کر بھی نہ دم مار کہ قانون یہی ہی

کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل زینگ کران کو
شکریہ کے دے تار کہ قانون یہی ہی

فتوا علما کا ہو کہ گاندھی کی نصیحت
دونوں سے ہو بےزار کہ قانون یہی ہی

تنکانہ کو چل آگ میں جل راکھ کا ہو ڈھیر
رہ پھر بھی وفادار کہ قانون یہی ہی

کرنی ہی تجھے سیر اگر باغ گرو کی
پٹ جا سر بازار کہ قانون یہی ہی

گدی سے اُتر راج کو چھوڑ اور کر اقرار
ہوں میں ہی خطاوار کہ قانون یہی ہی

اس پردۂ زنگار میں نغموں کے عوض سن
زنجیر کی جھنکار کہ قانون یہی ہی

آوازۂ منصور کو کہتے ہوئے لبیک
دوڑے رسن و دار کہ قانون یہی ہی

جینے کی تمنا ہو گر اس عہد میں تجھ کو
مرنے کو ہو تیار کہ قانون یہی ہی

حسرت موہانی

جورِ غلامانِ وقت

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حب وطن مست خواب دیکھئے کب تک رہے

دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ حزم وحجاب دیکھئے کب تک رہے

تا بکجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا
خلق خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوئے کیا کیا ستم
جبر بزیر نقاب دیکھئے کب تک رہے

دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بےعدد و بےحساب دیکھئے کب تک رہے

ہی تو کچھ اکھڑا ہوا بزم حریفاں کا رنگ　　اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے

حسرت آزاد پر جور غلامان وقت
ازرہ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

حسرت موہانی

دعوتِ عمل

ای کہ نجات ہند کی دل سے ہی تجھ کو آرزو　　ہمت سر بلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان　　روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بہ عذر مصلحت وقت پہ جو کرے گریز　　اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر
خدمت اہل جور کو کر نہ قبول زینہار　　فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر
غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہی گناہ　　کوشش ذات خاص پر ناز کر، اعتماد کر

نیرنگ (میر غلام بھیک)

دعوتِ عمل

تجھے ای بلبل رنگیں نوا سوجھی ہی گانے کی
مگر مجھ کو پڑی ہی فکر تیرے آشیانے کی

یہ تیرے آڑے ترچھے چار تنکے شاخ گلبن پر
کبھی سے بجلیاں ہیں فکر میں انکے جلانے کی

یہ گلچیں، باغباں، صیاد، یہ تیرے کرم فرما
لئے بیٹھے ہیں دل میں حسرتیں تیرے مٹانے کی

سنبھالے اپنے پر پرزے ترے سب ہم صفیروں نے
ہر اک نے فکر کی ہو اپنے اپنے آشیانے کی

مگر اک تو ہی غافل ہو مآلِ کارِ گلشن سے
ترے حصہ میں آئیں غفلتیں سارے زمانے کی

پرانے برگ و گل سب چھانٹے جائیں گے خیاباں سے
لگی ہے باغباں کو دھن نیا گلشن بنانے کی

نئے پودے، نئے بوٹے، نئے گلبن، نئے تختے
نئی شرطیں بنینگی اب چمن میں آنے جانے کی

قفس بھی، دام بھی مقراض بھی بالکل نئے ہوں گے
نئی ترکیب ہو گی تجھ کو پھندے میں پھنسانے کی

اگر گلشن میں رہنا ہو بدل لے تو بھی ڈھنگ اپنا
سماعت اب نہیں ہو گی کسی حیلے بہانے کی

نہ بایستی ترا در باغ سازِ آشیاں کردن
چو کردی زندگی باید بحکم باغباں کردن

سمجھ لے ہم نفس جو کچھ کہا میں نے اشاروں میں
سنائی ہے تجھے تیری کہانی استعاروں میں

نئی حالت ہی دنیا کی، نرالا رنگ ہستی ہی
نئے گل کھل رہے ہیں گلشنوں میں، لالہ زاروں میں

جہاں گل خار و خس تھے وہ جگہ اب صحن بستاں ہی
مبدل ہو گیا ہی صحن بستاں خار زاروں میں

مگر تیری وہی عادت، وہی حالت، وہی دھن ہی
نہ وہ محفل نہ وہ ساقی، مگر تو ہی خماروں میں

ہر اک کشت عمل شاداب ہی فیض تمدن سے
چمن تیرا ہی کمہلایا گیا ہی ان بہاروں میں

نہ سمجھے اب بھی جو کوئی وہ سمجھے اپنی خوش فہمی
زمانہ کہہ چکا سب کچھ اشاروں میں، کنایوں میں

نئے حالات کو دیکھ اور سنبھل گر زندہ رہنا ہی
نہیں تو خود کو زندہ گاڑنا ہوگا ہزاروں میں

غضب ہی آج تیری غفلتیں رسوائے عالم ہوں
سمجھتے تھے تجھے ہم چشم کل تک ہوشیاروں میں

خدا ہی حافظ و ناصر ہی تیری قومِ بے کس کا
شمار اس کا ہی مدت سے حوادث کے شکاروں میں

غم دیروز و دوشت کردہ حیران تمناہا
گرفتہ ہم زہانت منزلِ سامانِ فرداہا

اسیری

(مولانا محمد علی کی گرفتاری پر)

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند　　قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے؟ اک لہو کی بوند ہے　　مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر　　کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن دربند قید و صید نیست
این سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

صدائے خاتون

[ستمبر سنہ ۱۹۲۱ع میں علی برادران کو اس جرم کی پاداش میں کہ خلافت کانفرنس میں اُنھوں نے باغیانہ تقریریں کیں، دو دو سال کی سزائے قید ہوئی۔ ادھر علی برادران جیل گئے ادھر

کہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کا ترانہ بچے، بوڑھے، جوان سب کی زبان پر تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی نظمیں کہی گئیں۔ ایک نظم خصوصیت کے ساتھ بہت مقبول ہوئی اور وہ تھی

«صداے خاتون»۔ اگرچہ نظم میں کوئی شاعرانہ خوبی نہیں لیکن چوں کہ اس دور کی مقبول ترین نظموں میں سے ہی اس لئے اس کے چند بند یہاں دئے جاتے ہیں۔ نظم بی اماں کی زبان سے ادا کی گئی ہی۔]

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہی شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اُترنا — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ہوتے میرے اگر سات بیٹے — کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

حشر میں حشر برپا کروں گی — پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعوا کروں گی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اکبر الہ آبادی

انقلاب

نگرانئ مراحل کبھی ایسی تو نہ تھی — تند موج لب ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی
بدگمانی تری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی — بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہی تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

کرتی ہی خلق کو لیلاے لبرٹی مفتوں — ہند کے دل کو لبھا لیتا ہی مل کا یہ فسوں
لاجپت بھی ہوئے شاید کہ اسیر و محزوں — پاے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہی مجنوں

آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

پیشتر اس سے طبائع کے نہ تھے یہ پہلو — کہیں اشنان کی تھی لہر کہیں موج وضو

ای مس سیم تن و ماہ جبین و گل رو — تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو

کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

محمد علی

کام کرنے کا یہی ہے، تمہیں کرنا ہے یہی

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی — ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

قلزم عشق میں ہیں نفع و سلامت دونوں — اس میں ڈوبے بھی تو کیا پار اُترنا ہے یہی

اور کس وضع کی جویاں ہیں عروسان بہشت — ہیں کفن سرخ، شہیدوں کا سنورنا ہے یہی

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا — اب بھی احساس ہو اس کا تو اُبھرنا ہے یہی

ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست — قلب مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی

نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر

کام کرنے کا یہی ہے، تمیں کرنا ہے یہی

محمد علی

چشم یہ خوں نابہ بار دیکھئے کب تک رہے

سینا ہمارا فگار دیکھئے کب تک رہے — چشم یہ خوں نابہ بار دیکھئے کب تک رہے

حق کی کمک ایک دن آہی رہے گی ولے — گرد میں پنہاں سوار، دیکھئے کب تک رہے
یوں تو ہی ہر سو عیاں آمد فصلِ خزاں — جور و جفا کی بہار دیکھئے کب تک رہے
رونق دہلی پہ رشک تھا کبھی جنت کو بھی — یوں ہی یہ اجڑا دیار دیکھئے کب تک رہے
زور کا پہلے ہی دن نشا ہرن ہو گیا — زعم کا باقی خمار دیکھئے کب تک رہے

محمد علی

آشیاں برباد

ہیں یہ انداز آزمانے کے — اور ہی ڈھنگ ہیں ستانے کے
گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے — تھے نہ ہم اس کے آستانے کے
ایک اک کر کے سب کے سب تنکے — گئے برباد آشیانے کے
کچھ دنوں گھومتا مقدر تھا — ساتھ ساتھ اپنے آب و دانے کے
دیکھئے اب یہ گردش تقدیر — کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

•

محمد علی

خوگر قفس

نہ اُڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے — ذرا پر باندھنا صیاد کس کے

نشان آشیاں کیا جس چمن میں لگے ہوں ڈھیر ہرسو خار و خس کے
ملے اک خم تو ہیخانے سے ساقی کہ ہم چھوٹے ہوئے ہیں دو برس کے
گراں ہو اب تو شاید سیر گل بھی کچھ ایسے ہوگئے خوگر قفس کے
ملی ہی قید آزادی کی خاطر نہ پڑجائیں کہیں دونوں کے چسکے
چمن تو ہم نے خود چھوڑا ہی گلچیں گلے پھر کیا کریں قید و قفس کے

فلک (لالا لال چند)

بیداریٔ ہند

مبارک، ہند کی بیدار قسمت ہوتی جاتی ہی
نمایاں ہندیوں میں اب اخوت ہوتی جاتی ہی

جگایا ہی ہمیں شبنم نے چھینٹے منہ پہ دیدے کر
دلوں سے اب ہمارے دور غفلت ہوتی جاتی ہی

شعاعیں آن پہنچیں ہند میں مہر ترقی کی
رفو چکر ہمارے گھر سے ظلمت ہوتی جاتی ہی

سمجھ لو مشکلیں سب دور اپنی ہونے والی ہیں
کہ مائل قوم پر اپنی طبیعت ہوتی جاتی ہی

اٹھا غفلت کا پردا اپنے دل سے بعد مدت کے
نمایاں ملک کی اب ہم میں الفت ہوتی جاتی ہی

ترقی پر ہی ان روزوں فلک پرچار دیسی کا
پرائے دیس کی چیزوں سے نفرت ہوتی جاتی ہی

نیاز فتح پوری

دعوتِ درد

اُٹھ، دل راحت طلب پیدا سر شوریدہ کر
آپ بھی غم دیدہ ہو، اوروں کو بھی غم دیدہ کر

پھونک دے محفل کو اپنے شعلۂ آواز سے
گرمئ ہنگامہ سے ہر قلب کو تفتیدہ کر

سرمہ آسا اہل بینش کی نگاہوں میں سما
ذرۂ ہستی کو اپنی اور بھی سائیدہ کر

شور پیدا کر جہاں میں نالۂ بیتاب سے
زخم ہاے سینا کو اپنے نمک پاشیدہ کر

کر کے عریاں شمع ہستی کو دکھا اس کا فروغ
یعنی نذر شعلۂ غم جامۂ بوسیدہ کر

ہاں، زمانہ دیکھ لے رفعت تری شکل ہلال
اور بھی اپنے تن کاہیدہ کو کاہیدہ کر

کارواں کی چشم خوابیدہ کا ہوجا درد تو
جب وہ سر گرم تگاپو ہو تو بن جا درد تو

ساقیا، پھر جلوہ پیرا ہو اسی انداز سے
زندہ کر دے اہل محفل کو اسی اعجاز سے

طائر سدرہ ہماری خستگی پر کر نظر
زور بازو گھٹ گیا، پر رہ گیا پرواز سے

جھانک لے پھر پردۂ برد یمانی سے ذرا
پھر سکھا طرز فغاں چشم نوا پرواز سے

وہ حدی خوانوں کے نغمے، وہ سرودِ ساز آہ!
ہو گئے نا آشنا اپنے پرائے ساز سے

ہم نوا ہوں غیر کا میں بھی بھلا ممکن کہاں
جب کراہا تک نہیں جاتا یہاں آواز سے

محو کر دل سے خطا ولدادگانِ حسن کی
روٹھتا ہی یوں بھی کوئی عاشق جاں باز سے

سر اگر ہم کو دیا ہی سرفروشی بھی سکھا
مے عنایت کی تو پھر وارفتہ ہوشی بھی سکھا

محوی لکھنوی (محمد حسین)

وقت بیداری

ہماری بے زبانی ہمت افزاے ستم ٹھری
کہ چپ رہنے پہ بھی ملتا ہی اب الزام غداری

شہیدوں کا تڑپنا لوٹنا دیکھا نہیں جاتا
مگر ممنوع ہی اس دور میں اظہار غم خواری

حکومت ہم پہ ہو سکتی ہی دل پر ہو نہیں سکتی
کوئی روکے تو کیونکر چشم دل کی گریۂ وزاری

مٹائے اپنی ہستی کو کہاں تک کوئی گھٹ گھٹ کر
نہیں ہی صبر کی اب تاب ای آئین خودداری

کہاں تک کوئی خاموشی سے دنیا کے ستم جھیلے
کہاں تک کوئی دیکھے جائے اپنی ذلت و خواری

یہ جینا بھی کوئی جینا ہی ای جویائے آسائش
بس اب خواب گراں سے چونک ہی یہ وقت بیداری

تری بربادیاں دیکھی نہیں جاتی ہیں اب ہم سے
خدا کے واسطے اُٹھ اور ہو آزاد اس غم سے

حشر کاشمیری (آغا محمد شاہ)

شکریۂ یورپ

ای زمین یورپ، ای مقراض پیراہن نواز
ای حریف ایشیا، ای شعلۂ خرمن نواز

چارہ سازی تیری بنیاد افگن کاشانہ ہی
تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہی

اشک حسرت زا سے چشم حریت نمناک ہی
خوں چکاں روداد اقوام گریباں چاک ہی
صرف تصنیف ستم ہی فلسفہ دانی تری
آدمیت سوز ہی تہذیب حیوانی تری
عظمت دیرینہ نالاں ہی ترے برتاؤ سے
دھل گیا حسن قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہ شوکت مشرق کو سونا کردیا
جنت دنیا کو دوزخ کا نمونا کردیا
اُٹھ رہا ہی شور غم خاکستر پامال سے
کہہ رہا ہی ایشیا روکر زبان حال سے
برمزار ما غریبان نی چراغی نی گلی
نی پرپروانہ سوزد نی صدای بلبلی

گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہی
اُمت خیرالوریٰ لیکن تری ممنون ہی
کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں ہوں؟ سب حقیقت کھلگئی
تونے وہ ٹھوکر لگائی چشم ملت کھل گئی
چوٹ کھاکر بھر گیا دل لذت ایثار سے
جلوے جاگے شیشۂ بشکستہ کی جھنکار سے
یک بیک خون تن بے جاں میں ہیجاں آگیا
قطرا دریا بن گیا، دریا میں طوفاں آگیا

چونک اُٹھی روح اخوت، ایک دل خستہ ہوئے
پتیاں گل بن گئیں، گل مل کے گلدستہ ہوئے
ہو گئیں بکھری ہوئی اینٹیں بہم تعمیر کی
مل گئی ہر اک کڑی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی
از کرم بپذیر یارب، جوش بی اندازہ را
تاقیامت زندہ دار این زندگی تازہ را

سہیل (اقبال احمد)

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگادے

مانا کہ قفس میں ہی بہت چین میسر نی برقِ چمن سوز نہ صیادِ ستمگر
ہی زیست غلامی کی مگر موت سے بدتر قابو میں رہے اپنے پر و بال تو کیا ڈر

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگادے

گائیں گے ہم آزادئ گلشن کا ترانا بے کار ہی ای برق بلا ہم کو ڈرانا
کافی ہی بہت وسعتِ صحرائے زمانا ہم اور کہیں ڈھونڈھ نکالیں گے ٹھکانا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگادے

جاں اس وطن خواجہ و جی پال پہ صدقے دل اس چمن حشمت و اجلال پہ صدقے
سر مشہد آزادی و اقبال پہ صدقے کردیں گے اسے اپنے پر و بال پہ صدقے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگادے

مانا کہ نشیمن سے ہی بجلی کی عداوت مانا کہ مری سعی کا انجام ہی حسرت
پھر بھی مری کوشش نہیں جانے کی اکارت بازو تو ہیں، اس مشق سے آجائے گی قوت

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگادے

ہی معرکہ ہرچند سہیل اہل جفا سے جاں باز وطن ڈرتے ہیں کب اہل جفا سے
ہٹنے کو نہیں منزل تسلیم و رضا سے جو کچھ بھی گذرنی ہی گذر جائے بلا سے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگادے

محمود اسرائیلی (محمود الحسن)

نالۂ عندلیب

زخم دل کو اب نمک پاشی کی لذت چاہئے
فکر مرہم ہوچکی، فکر طبیباں ہوچکی

جادۂ مقصد پہ چلنا ہی تو اُٹھ ہمت دکھا
دست حسرت مل چکا اور چشم گریاں ہوچکی

وحشت آباد جنوں بھی دیدۂ بینا سے دیکھ
فکر داماں ہوچکی، فکر گریباں ہوچکی

اب مثال گل ذرا تو بھی تو ہو سینافگار
ای فدائے رنگ و بُو سیر گلستاں ہوچکی

انقلاب آیا، نئے سیارے اب گردش میں ہیں
اپنی آنکھیں کھول، وہ رفتار دوراں ہوچکی

اب تو اپنی داستانِ صبح محشر بھی سنا
ختم وہ غیروں کی عشرت کی شبستاں ہوچکی

خونِ دل سے آبیاری کر جو دل میں درد ہی
مردِ میدان شجاعت بن اگر تو مرد ہی

غیرتِ افلاک پھر یہ گلستاں ہوجائے گا
اس کا ذرّہ ذرّہ مہر ضوفشاں ہوجائے گا

مردہ دل پھر آتش گل سے حرارت پائیں گے
مائل ذوقِ عمل پیر و جواں ہوجائے گا

ظلمت دل نور حق سے پھر فنا ہوجائے گی
دور باطل چشم عالم سے نہاں ہوجائے گا

حریت انسان کی مٹی میں ڈالی جائے گی
جذبۂ حب وطن گھر گھر عیاں ہوجائے گا

یہ ستم کے تیر ترکش میں پڑے رہ جائیں گے
پھر توانا دستگیر ناتواں ہوجائے گا

دور گیتی سے عیاں ہی اوج و پستی کا مآل
ہر کمالی را زوال و ہر زوالی را کمال

مایہ‌دار عیش ہوں گے آج جو کلفت میں ہیں
صاحب اقبال ہوں گے آج جو عسرت میں ہیں

اب حکومت کے لئے اُن کو بلایا جائے گا
آج جو برگشتہ قسمت غیر کی طاعت میں ہیں

وقت بیداری ہے ای ہندوستاں بیدار ہو
دیکھ نعمت ہاے گوناگو تری قسمت میں ہیں

حسب منشا تو بھی چن لے اپنے دامن کے لئے
سیکڑوں گلہاے مقصد گلشنِ قدرت میں ہیں

مہر پرتنویر بن کر چرخ مشرق پر نکل
تیری ظلمت سے ہزاروں ہستیاں ظلمت میں ہیں

تیری ہستی گردش دوراں سے مٹ سکتی نہیں
کچھ عناصر غیرفانی بھی تری فطرت میں ہیں

دست قدرت کارفرما ہے تری تدبیر میں
منہمک ہو آنے والے دور کی تعمیر میں

احمق پھپھوندوی (محمد مصطفیٰ خاں)

کڑے مرحلے

نہیں سہل آزادئ ہند یارو ابھی تم کو میداں میں آنا پڑے گا

ابھی امتحاں تم کو دینے پڑیں گے
ابھی تم کو جیلوں میں جانا پڑے گا
ابھی چکیاں پیسنی ہوں گی تم کو
ابھی پمپ گرا چلانا پڑے گا
ابھی جسم ہوں گے لہو پتھروں سے
ابھی زخم سینے پہ کھانا پڑے گا
پڑے گا ابھی کام تیغ و تبر سے
ابھی خاک و خوں میں نہانا پڑے گا
چلیں گی ابھی ہر طرف گن مشینیں
ابھی توپ کی زد میں آنا پڑے گا
ہوائی جہاز آکے یورش کریں گے
ابھی سر پہ بم کا نشانا پڑے گا
یہ سب امتحاں ختم ہو جائیں گے جب
تو سر تم کو اپنا کٹانا پڑے گا
کھنچو گے ابھی تختۂ دار پر تم
ابھی تم کو پھانسی پہ جانا پڑے گا

بہت سے کڑے مرحلے راہ میں ہیں
یہ طی کرکے منزل تک آنا پڑے گا

ساغر نظامی

تاج کا پیغام

نغمۂ ماضی کو اپنے پھر اسیر ساز کر
پھر اسی عنواں سے نظم زندگی آغاز کر
عالم موجود سے بہتر کوئی عالم بنا
ازسرنو اپنی دنیا کے لئے آدم بنا
لوٹ جا پھر اولیاتِ بقا تک لوٹ جا
گم شدہ شان و نشان ارتقا تک لوٹ جا
پھر شکستہ رشتۂ سعی و عمل کو جوڑ دے
اٹھ کے اک جھٹکے میں زنجیر غلامی توڑ دے
اپنی خفتہ بختیوں کو نیند سے بیدار کر
عظمت و عزت کی اک دنیا نئی آباد کر
توڑ کر بیکار کردے تیغ استبداد کو
فرصت امن و سکوں دے عالم ایجاد کو
موج سیلاب غلامی کے تھپیڑوں کو سنبھال
میری بنیادوں کو بھی تھرّا نہ دے تیرا زوال

اپنی غیرت اور شرافت کا ثبوتِ تام دے　　خون سے بھر کر زمانے کو چھلکتا جام دے
دردِ ملت ہی یہی، احساس غیرت ہی یہی　　راہ آزادی میں موت آئے شہادت ہی یہی
ذرہ ذرہ بند کا پھر گلفشاں ہو ایک دن　　کاش تجدیدِ بہارِ گلستاں ہو ایک دن

پرچمِ آزادئ ہندوستاں ہو اور میں
ایشیا کا افتخارِ جاوداں ہو اور میں

ساغر نظامی

پیغامِ عمل

اُٹھ، ای مشرق اور اپنے حق فطرت کی حفاظت کر
جو آزادی ترا مقسوم ہی اس کی حمایت کر

فضا پر غور کر ہر چیز کو حاصل ہی آزادی
بلند اپنی نظر، اپنی طبیعت، اپنی فطرت کر

ہلادے جور واستبداد کی سنگین بنیادیں
غلامی کے بتوں کو گرز حریت سے غارت کر

اگر بیدار بختی کی سند لینی ہی دنیا میں
تساہل کو مٹا اور انسداد خواب غفلت کر

غلامی مستقل لعنت ہی اور توہین انساں ہی
غلامی سے رہا ہو اور آزادوں میں شرکت کر

ترا مذہب بھی دیتا ہے تجھے تعلیم آزادی
اگر دعوائے مذہب ہے تو مذہب کی اطاعت کر

تری قربانیاں زنہار ضائع جا نہیں سکتیں
مگر پیدا دل بے کیف میں کیف شہادت کر

جو مستقبل میں فکر اہتمام سرخروئی ہے
تو اپنے خون سے رنگیں بیاضِ ملک و مات کر

قدم ہیں چندباقی حد منزل تک پہنچنے میں
ابھی کچھ اور کوشش کر، ابھی کچھ اور ہمت کر

قریب ایوان آزادی ہے کیوں مایوس ہوتا ہے
تبسم کامیابی کا مجھے محسوس ہوتا ہے

احسان دانش

ترانۂ جہاد

مجاہدینِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

روش روش، چمن چمن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
جبل جبل، دمن دمن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بکش بکش، بزن بزن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

مجاہدین صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

زمیں رشکِ آسماں تمہاری انجمن سے ہی
رگ جہاں میں خوں رواں تمہارے بانکپن سے ہی
رہے تمہارا بانکپن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
مجاہدینِ صف‌شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

قدم اُٹھاؤ اس طرح زمیں کا دل دہل اُٹھے
وہ نعرہ ہائے گرم ہوں کہ رنگِ چرخ جل اُٹھے
بہ نازشِ کمالِ فن بڑھے چلو، بڑھے چلو
مجاہدینِ صف‌شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

ذرا جو موت سے نہیں وہ شادکامِ زندگی
ڈرو نہ موت سے کہ موت ہی دوامِ زندگی
ہی دل کی زندگی لگن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
مجاہدینِ صف‌شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

فضا خلاف ہی تو ہو، شکوہ سے عَلم اُٹھے
ہی دھڑکنوں کی جو روش اسی طرح قدم اُٹھے
خوشی خوشی، مگن مگن بڑھے چلو، بڑھے چلو
مجاہدینِ صف‌شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

جو راہ میں پہاڑ ہوں تو بے دریغ اُکھاڑ دو
اُٹھاؤ اس طرح نشاں فلک کے دل میں گاڑ دو
ہے کھیل دار اور رسن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
مجاہدینِ صف‌شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

وفا کا عہد باندھ کر وفا سے کھیلتے ہوئے
لہو میں تیرتے ہوئے، فضا سے کھیلتے ہوئے
دلاورانِ تیغ‌زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
مجاہدینِ صف‌شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

بلند برچھیاں کرو وہ رحمتِ خدا جھکی
وہ زندگی کا در کھلا، وہ سر کے بل قضا جھکی
سپاس‌خوانِ ذوالمنن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
مجاہدینِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

جوش ملیح آبادی

۱- دامِ فریب

سحر ہوتے ہی مخمورِ شبانہ
کہا یوں چشم ساقی نے فسانہ
کہ ای زندانئ دیر و حرم چونک
زمیں سے تا فلک ہی آستانہ
تجھے رسموں سے کیا ہو رستگاری
ترا ایمان تو ہی کافرانہ
ترا صید زبونِ بزمِ ہستی
ورائے لا مکاں ہی آشیانہ
تجھے قطرے کا ہی اپنے پہ دھوکا
تو اک دریا ہی ناپیداکرانہ
کہاں تک یہ سکوتِ بے نوائی؟
کہاں تک یہ جمودِ عامیانہ؟
تجھے ہی موت کا ڈر، موت کیا ہی؟
حقیقی زندگانی کا بہانہ
ہمیشہ سے ہی رد میں بجلیوں کی
شکستہ خاطری کا آشیانہ

۱- یہ نظم سائمن کمیشن کی آمد پر کہی گئی تھی۔

کھیں ہی دھوپ سے نادان، بدتر
غلامی کی گھٹا کا شامیانہ

جہاں میں کچھ نہ رہ جائے گا باقی
مگر ہاں ایک مردوں کا فسانہ

جگایا ہی اگر سینے میں دل کو
تو بن تیرِ حوادث کا نشانہ

لگی ہی گھات میں مدت سے تیری
فرنگی کی نگاہِ جاودانہ

عدو تیری گرفتاری کی خاطر
مہیا کر رہا ہی آب و دانہ

اگر جینا ہی آزادی سے تجھ کو
سنا دشمن کو بڑھ کر یہ ترانہ

« برو این دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ »

ساغر نظامی

ہو مرتب اک نیا قانونِ گل

گلشنِ ہندوستاں آزاد ہو
جنتِ برباد پھر آباد ہو

ہو مرتب اک نیا قانونِ گل
اک نئی رسم چمن ایجاد ہو

کاش یوں بھی انقلاب آئے کبھی
خودمری پر اک نظر صیاد ہو

باغباں پیدا ہو خاکِ باغ سے
اور جو گلچیں ہو گلشن زاد ہو

باغ میں کوئی نہ ہو لب پا بہ گل
سرو ہو، لالہ ہو یا شمشاد ہو

ای مغنی، تجھ کو بربط کی قسم
سب سنا دے آج جو کچھ یاد ہو

خشت میخانہ ہی سنگ اتحاد
قصر آزادی کی یہ بنیاد ہو

ساقیا، برخیز و دردہ جام را
خاک بر سر کن غمِ ایام را

۳۔ بیداریٔ عوام

[پہلی جنگ عظیم کے دوران میں روس میں اشتراکی نظریہ عملی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ آخر ۱۹۱۷ء میں زار کی حکومت ختم ہوگئی۔ اب روس میں رعایا کی حکومت تھی اور کارل مارکس کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل ہورہا تھا۔ ہندوستان میں خلافت کی تحریک نے زور پکڑا تو بہت سے مسلمان حکومت برطانیا کے خلاف احتجاج کے طور پر ہندوستان سے ہجرت کرکے ترکی، افغانستان وغیرہ چلے گئے۔ بہت سے مہاجرین روس کی سرحد پر بھی پہنچ گئے۔ روس میں ان دنوں اشتراکی نظریہ بڑے زوروں پر اشاعت پارہا تھا۔ اکثر ہندوستانی مہاجرین اس نظریہ سے متاثر ہوئے اور جب وہ ہندوستان واپس آئے تو اپنے ساتھ اپنے ملک کےلئے ارمغانِ روس اشتراکی نظریہ کی صورت میں لائے۔ ہندوستان میں بھی ۱۹۱۹عیسوی میں مزدوروں کا طبقہ اپنی تنظیم کرچکا تھا اور ان کی تحریک زوروں پر تھی۔ جو لوگ اشتراکی خیالات روس سے لے کر آئے تھے ان کو اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ اس طرح اشتراکی نظریہ ہندوستان میں جڑ پکڑ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ نظریہ روس و ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی پھیل گیا۔ ادب نے بھی اس کا اثر قبول کیا۔ ۱۹۳۶ء میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنا پڑی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ادب کو محض تفریحی مشغلہ نہ سمجھا جائے بلکہ اس میں زندگی پیدا کی جائے اور اسے زندگی کا ترجمان بنایا جائے۔ ہندوستان میں بھی ترقی پسند مصنفین کی ایک انجمن قائم ہوئی۔ اس میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ کہنہ مشق افسانہ نگار و ادیب و شاعر بھی شامل تھے۔ اب قومی و وطنی ترانہ کے بجائے کسان، مزدور، بے کاری، افلاس، بغاوت وغیرہ ہماری شاعری کے موضوع قرار پائے اور ملوکیت و سرمایاداری کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ کیا جانے لگا۔]

حسرت موہانی

کمیونیزم کی تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد

[۱۹۲۶ء میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس کان پور میں ہوئی۔ اس کا خطبۂ استقبالیہ حسرت موہانی نے پڑھا تھا۔ چونکہ یہ کانفرنس اور خطبہ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں اس لئے اس کا ایک حصہ یہاں دیاجاتا ہے۔]

کمیونیزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے۔ اس تحریک کے اصول اور اغراض و مقاصد سے جمہور اہل ہند عموماً اتفاق کرتے ہیں البتہ بعض صریح غلط فہمیوں کی بنا پر کمیونیزم کے نام سے گھبراتے ہیں حالانکہ یہ غلط فہمیاں سب سرمایاداروں اور دوسرے بدخواہوں کی پھیلائی ہوئی ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کمیونیزم اور خوں ریزی و فساد لازم و ملزوم ہیں، حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدد کو صرف ضرورت و مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازم قرار نہیں دیتے۔ نیز بعض احمق یا شریر لوگ یہ بھی بکتے پھرتے ہیں کہ کمیونیزم اور "جو تیرا سو میرا" ایک ہی چیز ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جائداد اور ملکیت کی دو قسمیں مقرر ہیں۔ ایک ذاتی جس کو انگریزی میں پرسنل کہتے ہیں۔ مثلاً گھڑی، چھتری، لوٹا، بستر، کپڑے وغیرہ۔ دوسری شخصی جس کو انگریزی میں پرائیوٹ کہتے ہیں۔ مثلاً زمین، کارخانے وغیرہ۔ اور کمیونسٹ اصول کا عمل ذاتی جائداد پر نہیں ہوسکتا، صرف شخصی پر ہوتا ہے۔

ہمارے اصول تفصیل کا موقع نہیں۔ مجملاً یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے اصولوں میں سرمایاداری اور شخصی جائداد کی مطاق گنجائش نہیں۔ زبان عوام میں یہ بات یوں بھی ادا کی جاسکتی ہی کہ زمین بھی پانی اور ہوا کی طرح عطیۂ الہٰی ہی جس پر کسی کی ملکیت نہیں مقرر ہوسکتی۔ البتہ اس کو انسان حسب ضرورت اپنے فائدے کےلئے استعمال کرسکتا ہی اور اس باب میں بدنظمی کو روکنے اور اپنی آزادی اور آرام کو قائم رکھنے کی غرض سے ہر مقام کے لوگ اپنے کل معاملات کا انتظام جمہوری اصولوں پر خود کرسکتے ہیں۔ اسی کا نام سویٹ گورنمنٹ ہی۔

ہمارے اغراض و مقاصد ہماری پارٹی کا تفصیلی لائحۂ عمل جو سویٹ کانسٹی ٹیوشن سے ملتا جلتا ہی ہماری اس پہلی کانفرنس میں پیش ہوکر پاس ہوگا۔ ہمارے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ

(۱) ہندوستان میں سوراج یعنی آزادیٔ کامل کا کل جائز ذریعوں سے قائم کرنا۔

(۲) سوراج کے قائم کرنے پر یہ دیکھنا کہ اس سوراج کی ہئیت سویٹ رپبلک کی ہو جہاں کمیونیزم کے کل اصولوں پر عمل کیا جائے۔

(۳) سوراج کے قائم ہونے تک کاشتکاروں اور مزدوروں کی فلاح و آزادی کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس ضمن میں ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت کے ساتھ اس حد تک اشتراک عمل کو جائز رکھنا جس حد تک وہ جماعت ہمارے مذکورہ بالا اغراض کی تائید کرے۔

(٤) کمیونیزم کے اصولوں کی اشاعت کا سامان کرنا اور جمہور کو اپنا ہم خیال بنانا تاکہ سوراج کے قیام کے ساتھ فوراً ان پر عمل شروع ہوسکے۔

سرمایا و محنت

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہی یہ پیام کائنات
ای کہ تجھ کو کھا گیا سرمایا دار حیلہ گر — شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہل ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش — اور تو ای بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے — سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایادار — انتہاے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہی
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہی

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول — غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
نغمۂ بیداریٔ جمہور ہی سامان عیش — قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا — آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام — دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک
باغبان چارہ فرما سے یہ کہتی ہی بہار — زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

اقبال

الارض للہ

پالتا ہی بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہی سحاب؟

کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد ساز گار؟
خاک یہ کس کی ہی؟ کس کا ہی یہ نور آفتاب؟

کس نے بھردی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہی خوے انقلاب؟

دہ خدایا، یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اقبال

لینن

(خدا کے حضور میں)

ای انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات — حق یہ ہی کہ ہی زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہی یا کہ نہیں ہی — ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے — بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت — میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے　　تو خالق اعصار و نگارندۂ آنات

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں　　حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے　　کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا　　جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کون سا آدم ہی کہ تو جس کا ہی معبود؟　　وہ آدم خاکی کہ جو ہی زیر سماوات؟

مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی　　مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

یورپ میں بہت روشنئ علم و ہنر ہی　　حق یہ ہی کہ بے چشمۂ حیواں ہی یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں　　گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات

ظاہر میں تجارت ہی حقیقت میں جوا ہی　　سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت　　پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

بےکاری و عریانی و میخواری و افلاس　　کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم جو فیضان سماوی سے ہو محروم　　حد اس کے کمالات کی ہی برق و بخارات

ہی دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت　　احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر　　تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

میخانہ کی بنیاد میں آیا ہی تزلزل　　بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہی سر شام　　یا غازا ہی یا ساغر و مینا کی کرامات

تو قادر و عادل ہی مگر تیرے جہاں میں　　ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینا
دنیا ہی تری منتظر روز مکافات

فرشتوں کا گیت

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی　　نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر　　تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست　　بندا ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام　　عشق گرہ کشاے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی!

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اُٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگادو　　کاخِ امرا کے درو دیوار ہلادو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑادو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانا　　جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھادو
حق را بسجودی، ضمارا بطوافی　　بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھادو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　میرے لئے مٹی کا حرم اور بنادو

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعرِ مشرق کو سکھادو

زوالِ جہاں بانی

جہاں بانی دہکتی آگ ہی گرتی ہوئی بجلی
ہمیشہ اس نے دنیا میں کیا دورِ محن پیدا
نہ ہو چینِ جفا جب تک جبینِ شہریاری پر
نہیں ہوتا کلاہِ خسروی میں بانکپن پیدا
امید اس سے نہ رکھ نادان، مرغانِ خوش الحاں کی
ہمیشہ جس بیاباں سے ہوئے زاغ وزغن پیدا
ترا، ای حامیٔ تاج و علم، کیا یہ عقیدا ہی ؟
کہ ہوسکتی ہی نافِ گرگ سے مشکِ ختن پیدا
سمجھتا ہی کہ وہ حق بات کی تلخی کو سہ لیگا؟
خوشامد سے بھی جس ماتھے پہ ہو اکثر شکن پیدا
سن ای غافل کہ تاروزِ قیامت نسلِ شاہی سے
نہ ہوگا بزمِ انسانی کا صدرِ انجمن پیدا
اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایاداری کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلادے شہریاری کی

تنِ نازک پہ تیرے رحم آتا ہی مجھے لیکن
نہ دوں دعوت تجھے کس طرح قوت آزمانے کی
تجھے ای کاش! شاعر کی طرح محسوس ہوسکتا
نظر پڑتی ہی تجھ پر کس حقارت سے زمانے کی

ازل سے نوعِ انسانی کے حق میں طوقِ لعنت ہو
کسی ہم جنس کی چوکھٹ پہ عادت سر جھکانے کی
نہ ہو مغرور اگر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی
کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے غافل بنانے کی
گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا
ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی
گئے وہ دن کہ تو محرومیٔ قسمت پہ روتا تھا
ضرورت ہے تجھے اب آفتوں پر مسکرانے کی
تڑپ، پیہم تڑپ، اتنا تڑپ برقِ تپاں بن جا
خدارا اے زمینِ بے حقیقت، آسماں بن جا

جوش ملیح آبادی

کسان

(ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار)

طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظمِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ
ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
قلب پر جس کے نمایاں نور ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام

خون ہی جس کی جوانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہی شراب
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہی جاں پرور گلاب

ساز دولت کو عطا کرتی ہی نغمے جس کی آہ
مانگتا ہی بھیک تابانی کی جس سے روے شاہ
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہی کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے بھبکتا ہی تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کا نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہی رواں

اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہی نظر
جس میں آجاتی ہی تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر نیشِ غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہی ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھند لے آنسوؤں پر ہی نگاہ
پھر رہا ہی خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا امید دیوی کا شبابِ سو گوار
سوچتا جاتا ہی کن آنکھوں سے دیکھا جائیگا
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اُترا ہوا

سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری ہائے ہائے!
یہ ستم ای سنگ دل سرمایا داری ہائے ہائے!
بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات
ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہو اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
ادعاے پیروئ ابنِ مریم اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہو لہو
ہاں، سنبھل جا اب کہ زیرے اہل دل کیے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بیتاب ہیں

جوش ملیح آبادی

نظامِ نو

کھیل ہاں ای نوعِ انساں ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پابجولاں ہے تو کیا
مسکرانے کے لئے بے چین ہے صبح وطن
اور چندے ظلمت شام غریباں ہے تو کیا
چل چکی ہو پیشوائی کو نسیم باغ مصر
[illegible]

اب دکھلاہی چاہتا ہی پرچمِ بادِ مراد
آج ہستی کا سفینا وقفِ طوفاں ہی تو کیا
ختم ہوجائے گا کل یہ ناروا پست و بلند
آج نا ہموار سطحِ بزم امکاں ہی تو کیا
مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہی انقلاب
ابرِ غم، زلفِ جہاں پر بالجنباں ہی تو کیا
سایہ افگن ہی ہیولا برقِ ایواں سوز کا
آج صرف باغ سلطاں خون دہقاں ہی تو کیا

افسر میرٹھی (حامد اللہ)

طلوع خورشید نو

امن کے مشرق سے پھر ظاہر سحر ہونے کو ہی
آفتابِ عافیت پھر جلوا گر ہونے کو ہی

عہد گل آنے کو ہی پھولوں کی بارش کے لئے
ختم دورِ برق و بارود و شرر ہونے کو ہی

جلوا گر ہونے کو ہی صبحِ بہارِ آشتی
ظلم سے آزاد کل نوعِ بشر ہونے کو ہی

خضر کے اوصاف ہر رہرو کو بخشے جائیں گے
رہزنوں سے پاک اب ہر رہ گذر ہونے کو ہی

ظلم و خودغرضی کا پرچم ہورہا ہی سرنگوں
امن و راحت کا نشاں پیشِ نظر ہونے کو ہی

زیست کی لذت سے ہوگی آشنا نوعِ بشر
یعنی ہراک تلخ اب شہدوشکر ہونے کو ہی

فرق مٹ جانے کو ہی انسان اور انسان کا
وحدت اقوام عالم جلوا گر ہونے کو ہی

مل رہا ہی خاک میں قصرِ روایاتِ قدیم
مطلعِ خورشیدِ نو ہر بام و در ہونے کو ہی

شورش کاشمیری

نئے دور کا فرمان

دیکھ کونین کا جی ڈوب رہا ہی ساقی
شاخساروں سے لہو بہتا ہی
خونِ احرار سفیہوں کو روا ہی ساقی
مرغزاروں سے لہو رستا ہی

دور ساحل سے بہت دور، افق سے بھی پرے
ناؤ غرقاب ہوئی جاتی ہی
ان گھٹاٹوپ اندھیروں میں شفق سے بھی پرے
موج گرداب ہوئی جاتی ہی

آج تک گردش حالات کی سنگینی پر
روحِ کونین بھڑکتی ہی رہی
سرمئی شب میں جھلکتی ہوئی رنگینی پر
نبضِ ایام دھڑکتی ہی رہی

باغباں رسمِ گلستاں کو بدلتے ہی رہے
ہائے افسوس! عزیزانِ چمن
رہنما جادۂ منزل سے بھٹکتے ہی رہے
آہ! ای سفلگئ چرخِ کہن

اہلِ محفل کا لہو بادۂ گل فام بنا
جگمگاتے ہوئے پیمانوں میں
نالۂ دردکشاں خندۂ صمصام بنا
جھلملاتے ہوئے ایوانوں میں

وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے دھارے کی صدا
جنگِ جمہور کا عنوان بنی
ٹوٹتی شب کے سحر تاب ستارے کی صدا
اِک نئے دور کا فرمان بنی

کچھ دنوں اور اندھیرے کی فراوانی ہی
طلعتِ صبحِ درخشاں کی قسم
کچھ دنوں اور غریبوں پہ ستم رانی ہی
کج کُلاہوں کے گریباں کی قسم

آخر اک روز یہ دولت کا فسوں ٹوٹے گا
رنگ محلوں کے دریچوں سے لہو پھوٹے گا

شورش کاشمیری

ذرا صبر

اِک نئے دور کی ترتیب کے ساماں ہوں گے
دست جمہور میں شاہوں کے گریباں ہوں گے

برق خود اپنی تجلی کی محافظ ہوگی
پھول خود اپنی لطافت کے نگہباں ہوں گے

نغمہ و شعر کا سیلاب اُمڈ آئے گا
وقت کے سحر سے غنچے بھی غزل خواں ہوں گے

ناؤ منجدھار سے بے خوف و خطر کھیلے گی
ناخدا بربط طوفاں پہ رجزخواں ہوں گے

راہ‌رو اپنی مسافت کا صِلا مانگیں گے
رہنما اپنی سیاست پہ پشیماں ہوں گے

احسان دانش

میخانۂ انقلاب

پلا وہ جام ساقی انجمن سرشار ہوجائے
خودی کو نیند آجائے، جنوں بیدار ہوجائے

تنوں میں مے کشوں کے پھونک دے وہ روحِ آزادی
غلامی کا سکوں آمادۂ پیکار ہوجائے

طلسم بے خودی کے ٹوٹنے کا وقت آ پہنچا
قیامت سے یہ کہہ دو خواب سے بیدار ہوجائے

بہاریں ڈھونڈھتی ہیں پھر وہ پُر آشوب ہنگامے
وہی دارورسن کا گرم پھر بازار ہوجائے

اُٹھائے تو کوئی تعمیرِ آزادی کی بنیادیں
مرا ذمہ نہ ہر مزدور اگر معمار ہوجائے

زمانے بھر پہ جب روشن ہی قیمت خون دہقاں کی
تو پھر طوقِ غلامی کیوں گلے کا ہار ہوجائے

ابھی تو وقت ہی بیدار ہوسکتی ہی خودداری
کہیں ایسا نہ ہو احساس بھی دشوار ہوجائے

ادا بدایونی (عزیز جہاں)

تعمیرِ نو

محرومیٔ تقدیر کا الزام کہاں تک
شرمندگیٔ کوششِ ناکام کہاں تک

دنیا کو ضرورت ہی ترے عزم جواں کی
سرگشتہ رہے گا صفتِ جام کہاں تک

کبتک ترے ہونٹوں پہ حدیث رخ تاباں
سر میں ترے سودائے لبِ بام کہاں تک

گیسوے سیہ تاب و رخ صاعقہ پرور
یہ مرگ و حیات سحر و شام کہاں تک

لیلاے حقیقت سے بھی ہوجا کہیں دوچار
خوابوں کی حسیں چھاؤں میں آرام کہانتک

رخ گردش دوراں کا پلٹ سکتا ہی تو خود
ناداں گلۂ گردش ایام کہاں تک

ای ذرۂ ناچیز، خجل مہر کو کردے افتادہ و تفتیدہ و گم نام کہاں تک

جز وہم نہیں قیدِ رہ و رسم زمانا
ای طائر آزاد، تہِ دام کہاں تک

مجاز (اسرارالحق)

سرمایا داری

کلیجا پھنک رہا ہی اور زباں کہنے سے عاری ہی
بتاؤں کیا تمہیں کیا چیز یہ سرمایاداری ہی

یہ وہ آندھی ہی جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہی
یہ وہ بجلی ہی جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہی

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہی
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہی

قیامت اس کے غمزے، جاں لیوا ہیں ستم اس کے
ہمیشہ سینۂ مفلس پہ پڑتے ہیں قدم اس کے

کہیں یہ خوں سے فردِ مال و زر تحریر کرتی ہی
کہیں یہ ہڈیاں چن کر محل تعمیر کرتی ہی

بظاہر چند فرعونوں کا دامن بھر دیا اس نے
مگر کُل باغِ عالم کو جہنم کر دیا اس نے

یہ اکثر لوٹ کر معصوم انسانوں کو راہوں میں
خدا کے زمزمے گاتی ہی چھپ کر خانقاہوں میں

یہ غیرت چھین لیتی ہی، حمیت چھین لیتی ہی
یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہی

ہمیشہ خون پی کر ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہی
زمانا چیخ اُٹھتا ہی یہ جب پہلو بدلتی ہی

گرجتی گونجتی یہ آج بھی میداں میں آتی ہی
مگر بدمست ہی، ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہی

مبارک دوستو، لبریز ہی اب اس کا پیمانا
اُٹھاؤ آندھیاں، کمزور ہی بنیادِ کاشانا

مجاز

انقلاب

آرہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

کوہ و صحرا میں زمیں سے خون اُبلے گا ابھی
رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی

بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراتے ہوئے
اک جنوں انگیز لَے میں جانے کیا گاتے ہوئے

سرکشی کی تند آندھی دم بہ دم چڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی، ہر طرف بڑھتی ہوئی

بھوک کے مارے ہوئے انساں کی فریادوں کے ساتھ
فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ

ختم ہوجائے گا یہ سرمایاداری کا نظام
رنگ لانے کو ہی مزدوروں کا جوشِ انتقام

گر پڑیں گے خوف سے ایوان عشرت کے ستوں
خون بن جائے گی شیشوں میں شرابِ لالہ گوں

خون کی بو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی

خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں

خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائے گی بہار
ریگِ صحرا پر نظر آئیں گے لاکھوں لالہزار

کوہساروں کی طرف سے "سرخ آندھی" آئے گی
جابجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی

سرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہوں گے آتشِ ملبوس میں منظر تمام

اس طرح لے گا زمانا جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی، فرق پر رنگِ شفق

اور اِس رنگِ شفق میں با ہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

مجاز

نوجوان سے

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیدا کر

ترے خرام میں ہی زلزلوں کا راز نہاں
ہر ایک گام پہ اک انقلاب پیدا کر

صدائے تیشۂ مزدور ہی ترا نغمہ
تو سنگ وخشت سے چنگ ورباب پیدا کر

شراب کھینچی ہی سب نے غریب کے خوں سے
تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر

گرادے قصر تمدن کہ اک فریب ہی یہ
اُٹھادے رسم محبت، عذاب پیدا کر

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہوسکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

سوچ

میرا دل غمگیں ہے تو کیا　غمگیں یہ دنیا ہے ساری
یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا　ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں　بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں　سپنوں کی تعبیریں سوچیں
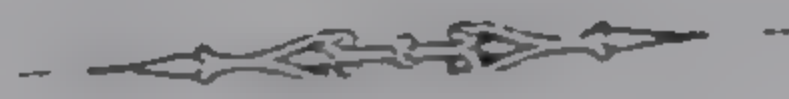
بے فکرے دھن دولت والے　یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں؟
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں　یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے　سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہ جائیں گے　ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا

فیض

چند روز اور مری جان

چند روز اور مری جان، فقط چند ہی روز

ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ تعزیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ زنجیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

جدیل مظہری

ای مرد جواں، چل

افلاس کا نوحہ ہے بغاوت کا گھنا راگ
چولھا ترا ٹھنڈا سہی، سینے میں تو ہے آگ
ای مرد جواں جاگ
سلگے ہوئے تنور سے اٹھنے دے دھواں، چل
ای مرد جواں، چل

بھیگی ہوئی اشکوں سے یتیموں کے ہوا ہی
آہِ دلِ مظلوم سے تاریک فضا ہی

گھنگھور گھٹا ہی

ساتھ اپنے لئے یہ قدم ابر رواں چل
ای مرد جواں، چل

مزدور کے نغموں سے مسنکتی ہیں فضائیں
تیشے سے زحر کے جو نکلتی ہیں صدائیں

ہلتی ہیں فضائیں

ساتھ ان کے دھڑکتا ہی دلِ کون و مکاں، چل
ای مرد جواں، چل

جدیل مظہری

مزدور کی بانسری

ہم سے بازار کی رونق ہی، ہم سے چہروں کی لالی ہی
جلتا ہی ہمارے دل کا دیا، دنیا کی سبھا اجیالی ہی

دولت کی سیوا کرتے ہیں ٹھکرائے ہوئے ہم دولت کے
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم، سوتیلے بیٹے قسمت کے

سونے کو چٹائی تک بھی نہیں ہم ذات کے اتنے ہیٹے ہیں
یہ سیجوں پر سونے والے شاید بھگوان کے بیٹے ہیں

وہ بھوکوں کے ان داتا ہیں حق ان کا ہی بیداد کریں
ہم کس دروازے پر جائیں کس سے جاکر فریاد کریں

بازار تمدن بھی ان کا، دنیاے سیاست بھی ان کی
مذہب کا ادارا بھی ان کا، عادل کی عدالت بھی ان کی

پابند ہمیں کرنے کے لئے سو راہیں نکالی جاتی ہیں
قانون بنائے جاتے ہیں، زنجیریں ڈھالی جاتی ہیں

پھر بھی آغاز کی شوخی میں انجام دکھائی دیتا ہی
ہم چپ ہیں لیکن فطرت کا انصاف دکھائی دیتا ہی

احساس خودی مظلوموں کا اب چونک کے کروٹ لیتا ہی
جو وقت کہ آنے والا ہی دل اس کی آہٹ لیتا ہی

طوفان کی لہریں جاگ اٹھیں سوکر اپنے گہوارے سے
کچھ تنکے شوخی کرتے ہیں سیلاب کے سرکش دھارے سے

مندیل سروں سے گرتی ہی اور پاؤں سے روندی جاتی ہی
سینے میں گھٹاؤں کے بجلی بےچین ہی کوندی جاتی ہی

منظر کی کدورت دھو دے گی، دھرتی کی پیاس بجھائے گی
موسم کے اشارے کہتے ہیں یہ بدلی کچھ برسائے گی

یہ ابر جو گھرکر آتا ہی گر آج نہیں کل برسے گا
سب کھیت ہرے ہوجائیں گے جب ٹوٹ کے بادل برسے گا

وجد (سکندر علی)

کسان

اسلام ای پیکر غم، محسنِ ہندوستاں   تیرے دریاے کرم کا فیض ہی پیہم رواں

تار تیرے پیرہن کے گر نہ ہوں صرف رفو   خلعتِ شاہی کی اُڑجائیں ہوامیں دھجیاں
جلد ہی تیری شب غم کی سحر ہونے کو ہی   سر زمینِ ہند پر لہرائیگا تیرا نشاں
پھر لہو سے جلنے والے سب دئے بجھ جائینگے   رنگ لائے گی ہوائے انقلاب خونچکاں

کلفتِ امروز، عیدِ عیش کی تمہید ہی
اس اندھیری شب کے پیچھے نُور صبح عید ہی

وجد

نیا گیت

سن لے ساتھی تازا گیت
نیند میں جیون جائے نہ بیت
چھوڑ پرائی پیت کی ریت
جانبازوں کی ہار بھی جیت

قہر غلامی، زہر ملال
خوف کا جینا اک جنجال

بند نہیں ہی میخانہ
تو بھی چھلکا پیمانہ
آج چمن کل ویرانہ
ساری حقیقت افسانہ

دل کا ہر ارمان نکال
آئینے میں آجائے نہ بال

خطِ ہزیمت چین جبیں
گھبرانے کا وقت نہیں

ہاتھ میں لے کر تیغِ یقیں
کرلے دنیا زیرِ نگیں

کانٹوں میں پھولوں کی مثال
ہنس ہنس کر جینا ہی کمال

بھیڑئیے بھیڑوں کے ہادی
گلوں کی ہی بربادی
آدھی دنیا فریادی
کس کو ملے گی آزادی

کب تک ہوگا حق پامال؟
قیدی کرتے ہیں یہ سوال

دنیا کا بدلے گا رنگ
سنگیں جرم بنے گی جنگ
دُھل جائے گا دلوں کا رنگ
سب کا ہوگا اک آہنگ

کالے، پیلے، گورے، لال
مِل جُل کر ہوں گے خوش حال

اُٹھے محکوموں کے قدم
کُھلے بغاوت کے پرچم
عظمتِ انساں مستحکم
بھاگ رہے ہیں اہلِ ستم

زورِ حکومت خواب و خیال
جیت گئے دھرتی کے لال

سوالیہ نشان

دہقان سنوارتا ہی مٹی
چن چن کے بکھیرتا ہی دانے
اور سوچتا جارہا ہی جی میں
پھر آئے گی جنگ آزمانے
اور دل کو ٹٹولتا ہی رک کر
پھر دور اُفق کو دیکھتا ہی
کچھ رنگ سے تیرگی میں ڈوبے
مجبور اُفق کو دیکھتا ہی

آنکھوں میں لہو کی بوند کانپی
گرتے ہی زمیں پہ کھو گئی پھر
پروان چڑھائے تھے جو پودے
وہ جل گئے رات ہوگئی پھر
خالی کئی گوشے ہوگئے ہیں
تنہا تو نہ تھا، یہ رہ گیا ہی
کرنا پڑا نیشِ غم گوارا
کس کس کا نہ خون بہہ گیا ہی

پھر دور اُفق کو دیکھتا ہی
یہ کھیت، وسعتِ بیاباں

سر سبز زمین کے یہ پھول
یہ سبزۂ نورستہ، یہ خیاباں
سب آگ میں جل رہے ہیں گویا
تھم تھم کے پگھل رہے ہیں گویا

دہقان سنوارتا ہی مٹی
رک رک کے بکھیرتا ہی دانے
اور سوچتا جارہا ہی جی میں
پھر آئے گی جنگ آزمانے

مخدوم محی الدین

جہانِ نو

نغمے شرر فشاں ہوں اُٹھا آتشیں رباب
مضراب بے خودی سے بجا ساز انقلاب
معمارِ عہدِ نو ہو ترا دست پُرشباب
باطل کی گردنوں پہ چمک، ذوالفقار بن

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

کل اور آج

(۱)

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا

بادل یہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے ہیں
دوشِ ہوا پر میخانے ہی میخانے گھر آئے ہیں
رُت بدلے گی، پھول کھلیں گے، جھونکے مدھ برسائیں گے
اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگین آنچل لہرائیں گے
چرواہے بنسی کی دھن سے گیت فضا میں بوئیں گے
آموں کے جھنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھوئیں گے
پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکیں گے
جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھیں جھپکائیں گے
الجھی الجھی راہوں میں وہ آنچل تھامے آئیں گے
دھرتی، پھول، آکاش، ستارے سپنا سا بن جائیں گے

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا

آج بھی بوندیں برسیں گی
آج بھی بادل چھائے ہیں
اور کوی اُس سوچ میں ہی

بستی پر بادل چھائے ہیں، پر یہ بستی کس کی ہی؟
دھرتی پر امرت برسے گا لیکن یہ دھرتی کس کی ہی؟
ہل جوتے گی کھیتوں میں الھڑ ٹولی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلے کا ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آکر سب «پونجی» لے جائیں گے
بوڑھے دہقانوں کے گھر بنئے کی قرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی
آج بھی جنتا بھوکی ہی اور کل بھی جنتا ترسی تھی
آج بھی رم جھم برکھا ہوگی، کل بھی بارش برسی تھی

آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
اور کوی اس سوچ میں ہی

وامق جون پوری (احمد مجتبا)

جنتا کی لڑائی

یہ کون اُٹھا ہے بر و بحر میں انگڑائیاں لیتا؟
یہ کون اُٹھا ہے کشتی خون کے طوفان میں کھیتا؟
یہ کون اُٹھا ہے اپنی جان کی قربانیاں دیتا؟
یہ مزدوروں کا لشکر ہے، کسانوں کی چڑھائی ہے

یہ جنتا کی لڑائی ہے

یہ کس نے سر اُٹھایا؟ کس نے دنیا کا چلن بدلا؟
یہ کس نے جنگ فرسودہ کا اندازِ کہن بدلا؟
یہ کس کے اک اشارے پر نظر بدلی، سخن بدلا؟
یہ مزدوروں کا لشکر ہے، کسانوں کی چڑھائی ہے

یہ جنتا کی لڑائی ہے

یہاں ہر قطرۂ خوں جنس آزادی کی قیمت ہے
یہاں انسان کو انسان سے کتنی محبت ہے
یہاں کا ہر سپاہی مادر گیتی کی دولت ہے
یہ مزدوروں کا لشکر ہے، کسانوں کی چڑھائی ہے

یہ جنتا کی لڑائی ہے

یہ فاشیت کو دنیا سے مٹا لیں گے تو دم لیں گے
یہ استبداد کے ایواں کو ڈھا لیں گے تو دم لیں گے

یہ نغمے اپنی آزادی کے گائیں گے تو دم لیں گے
یہ مزدوروں کا لشکر ہی، کسانوں کی چڑھائی ہی
یہ جنتا کی لڑائی ہی
یہ جنتا کی لڑائی ہی

سردار جعفری

پیغام بیداری

اُٹھو، ہند کے باغبانو اُٹھو	اُٹھو، انقلابی جوانو اُٹھو
کسانو اُٹھو، کام گارو اُٹھو	نئی زندگی کے شرارو اُٹھو
اُٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے	اُٹھو خاکِ بنگال و کشمیر سے
اُٹھو وادی و دشت و کہسار سے	اُٹھو سندھ و پنجاب و ملبار سے
اُٹھو مالوے اور میوات سے	مہاراشٹر اور گجرات سے
اودھ کے چمن سے چہکتے اُٹھو	گلوں کی طرح سے مہکتے اُٹھو
اُٹھو کھل گیا پرچمِ انقلاب	نکلتا ہی جس طرح سے آفتاب
اُٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے	کڑکتے، گرجتے، برستے ہوئے

غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

وقت کا ترانہ

قافلا انقلاب کا ہی رواں
بج رہی ہی خوشی کی شہنائی
زلزلوں سے دہل رہی ہی زمیں
لے رہے ہیں پہاڑ انگڑائی

سلگ اُٹھی ہی انتقام کی آگ
برف کی چوٹیاں دہکتی ہیں
ظلم اور جبر کے اندھیرے میں
سیکڑوں بجلیاں چمکتی ہیں

جن کو کچلا گیا ہی صدیوں سے
آج تک ان کے دل دھڑکتے ہیں
زندگی کے بجھے ہوئے شعلے
اک نئی شان سے بھڑکتے ہیں

فصل کے ساتھ ساتھ کھیتوں سے
اُگ رہی ہی بغاوتوں کی سپاہ
جگمگاتی ہی عدل کی شمشیر
مل سکے گی نہ ظالموں کو پناہ

کارخانوں کے آہنی دل سے
ایک سیلاب سا اُبلتا ہی

سرخ پرچم ہوا کے سینے پر
بن کے رنگِ شفق مچلتا ہے

بادباں کھل گئے بغاوت کے
بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے
ایسے جانباز غازیوں کو سلام

دیدنی اہل شہر کا ہے شکوہ
گولیاں روکتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرے، نگہ میں عزم جہاد
حریت ضوفگن جبینوں پر

ہر سڑک پر سمندروں کا اُبال
ہر گلی میں ہے جوش طوفانی
غرق کردے گی بادشاہی کو
آدمی کے لہو کی طغیانی

سردار جعفری

جمہور کا اعلان نامہ

"زمانے کے انداز بدلے گئے نئے راگ ہیں ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دور سرمایا داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
ہمالا کے چشمے اُبلنے لگے
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے"
اُٹھا خاک جاوا سے طوفانِ نور
بغاوت نے پھونکا قیامت کا صور
بھڑکتی ہیں ایراں میں چنگاریاں
یہ ہیں صبح عشرت کی تیاریاں
اُجالا ہی مشرق کے ایوان میں
سحر ہوگئی شام و لبنان میں
بڑھی لے کے جمہوریت اپنی فوج
ملی نیل سے جا کے دجلے کی موج
جل اُٹھے غلاموں کے سینے کے داغ
بکنگھم میں گل ہو رہے ہیں چراغ
گرے قصرِ شاہی، ہلے تخت و تاج
نئی کروٹیں لے رہا ہی سماج
ملے زندگی کو نئے بال و پر
نئی منزلیں ہیں، نیا ہی سفر
نئی صبح ہی اور نیا آفتاب
مبارک زمانے کو یہ انقلاب

چوتھا حصہ

۱۔ سول نافرمانی کی تحریک اور نیا قانون

۲۔ دوسری جنگ عظیم

۳۔ اگست ۱۹۴۲ء کی بغاوت اور اس کے بعد

۴۔ صبحِ نَو

۱۔ سول نافرمانی کی تحریک اور نیا قانون

[۱۹۲۹ع میں کانگرس نے یہ اعلان کیا کہ اگر ایک سال کے اندر ہندوستان کو حکومت خود اختیاری نہ ملی تو وہ کامل آزادی کی تحریک شروع کردے گی۔ حکومت نے کانگرس کے اس اعلان پر کوئی توجہ نہ کی۔ آخر مارچ ۱۹۳۰ع میں کانگرس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی۔ پھر قید و بند کا سلسلا شروع ہوگیا۔ ہزاروں مردوں اور عورتوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ حکومت نے اسی سال کے آخر میں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس کی۔ لیکن کانگرس نے اس میں شرکت کرنے سے انکار کردیا۔ دوسری کانفرنس کے منعقد ہونے سے پہلے گاندھی اور دوسرے لیڈر رہا کردئے گئے اور کانگرس اور وائسرائے (لارڈ ارون) میں معاہدا ہوگیا۔ کانگرسی لیڈروں نے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل چونکہ نہ نکل سکا اس لئے کانفرنس کا کوئی نتیجا نہ نکلا۔ تیسری کانفرنس کے نتیجہ میں 'وھائٹ پیپر' شائع ہوا۔ لیکن کانگرس ان تجاویز سے مطمئن نہ ہوسکی اور گاندھی جی نے پھر سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ یہ تحریک ۱۹۳۴ع تک جاری رہی۔ اس تحریک کا ثمرہ ہندوستان کو ۱۹۳۵ع کے نئے قانون ہند کی صورت میں ملا۔ اب ملک میں کانگرس اور مسلم لیگ کی وزارتیں حکومت کرنے لگیں۔]

پریم چند

آشیاں برباد

مردلا مجسٹریٹ کے اجلاس سے زنانہ جیل میں واپس آئی تو اس کا چہرا شگفتہ تھا۔ بری ہوجانے کی گلابی امید اس کے رخساروں پر چمک رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سیاسی قیدیوں کے گروہ نے اُسے گھیرلیا اور پوچھنے لگیں «کتنے دن کی ہوئی بہن؟»

مردلا نے فاتحانہ انداز سے کہا: «میں نے تو صاف صاف کہدیا، میں نے دھرنا نہیں دیا۔ یوں آپ زبردست ہیں۔ جو فیصلا چاہیں کریں۔ نہ میں نے کسی کو روکا نہ پکڑا، نہ دھکا دیا، نہ کسی سے آرزو منت ہی کی۔ کوئی خریدار میرے سامنے آیا ہی نہیں۔ ہاں میں دوکان پر ضرور کھڑی تھی۔ وہاں کئی والنٹیر گرفتار کرلئے گئے تھے۔ خلقت جمع ہوگئی تھی۔ میں بھی کھڑی ہوگئی۔ بس تھانےدار نے مجھے آکر گرفتار کرلیا۔»

چھما دیوی کچھ قانون جانتی تھی۔ بولی «یہ تو ایک طرح کی صفائی دینے کے برابر ہے۔» مردلا نے فوراً تردید کی، «میں مقدمہ کی کسی کارروائی میں شریک نہ ہونا چاہتی تھی۔ لیکن جب میں نے ان لوگوں کو صریح جھوٹ بولتے دیکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ میں نے ان سے جرح کرنا شروع کی۔ میں نے بھی اتنے دنوں گھاس نہیں کھودی ہے۔ تھوڑا سا قانون جانتی ہوں۔ پُلیس والوں نے سمجھا یہ کچھ بولے گی تو نہیں، ہم جو بیان چاہیں گے دے دیں گے۔ جب میں نے جرح شروع کی تو سب کے سب بغلیں جھانکنے لگے۔ میں نے تینوں گواہوں کے بیان کو فرضی ثابت کردیا۔ اس وقت جانے مجھے کیوں کر نکتے سوجھتے گئے۔ . . . . ابھی مجسٹیریٹ نے فیصلا نہیں

سنایا۔ لیکن مجھے یقین ہے، بری ہوجاؤں گی۔ میں جیل سے نہیں ڈرتی لیکن بےوقوف بھی نہیں بننا چاہتی۔ . . . . »

عورتیں اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ایک ایک کرکے چلی گئیں۔ ان میں سے کسی کی میعاد سال بھر کی تھی، کسی کی چھہ مہینے کی۔ کسی نے بھی عدالت کی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کے مشرب میں یہ کفر سے کم نہ تھا۔ مردلا پُلیس سے جرح کرکے ان کی نگاہوں میں گرگئی تھی۔

دور جاکر ایک دیوی نے کہا، «اس طرح تو ہم لوگ بھی چھوٹ جاتے۔ ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ سرکاری عدالتوں سے ہمیں انصاف کی کوئی امید نہیں۔»

دوسری خاتون بولیں، «یہ تو معافی مانگ لینے کے برابر ہے۔ گئیں تھیں دھرنا دینے، ورنہ دوکان پر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ والنٹیر گرفتار ہوئے تھے، آپ کی بلا سے۔ آپ وہاں کیوں گئیں؟ مگر اب کہتی ہیں، میں دھرنا دینے گئی ہی نہیں۔ یہ تو معافی مانگنا ہوا۔ تیسری دیوی نے فرمایا، «جیل میں رہنے کےلئے بڑا کلیجا چاہئے۔ اس وقت تو واہ واہ کہلانے کےلئے آگئیں۔ ایسی عورتوں کو تو قومی کام کے نزدیک ہی نہ آنا چاہئے۔ تحریک کو بدنام کرنے سے فائدہ؟»

۲

صرف چھمادیوی اب تک مردلا کے پاس متفکر کھڑی تھی۔ اس نے ایک تقریر کے الزام میں سال بھر کی سزا پائی تھی۔ دوسرے ضلع سے تبدیل ہوکر ایک ماہ ہوا یہاں آئی تھی۔ ابھی میعاد پوری ہونے میں آٹھ ماہ باقی تھے۔ یہاں کے پندرہ قیدیوں میں سے کسی سے اس کا دل نہ ملتا تھا۔ ذرا ذرا سی باتوں کےلئے ان کا آپس میں جھگڑنا، آرائش اور شوق کےلئے لیڈی وارڈوں کی

خوشامدیں کرنا، گھر والوں سے ملنے کے لئے ان کا اضطراب اُسے پسند نہ تھا۔۔۔۔
وہ خودداری جو اس کے خیال میں ایک سیاسی قیدی میں ہونا چاہئیے کسی میں نہ تھی۔
ان کا زیادہ تر وقت اپنے خانگی معاملات میں صرف ہوتا تھا۔ چھما ان سے نہ تھی
احتراز کرتی تھی۔ اس میں قوم کا فدائیانہ جوش تھا اور سچا درد۔ مگر دوسری
دیویاں اُسے مغرور سمجھتی تھیں اور احتراز کا جواب احتراز سے دیتی تھیں۔ مردلا
کو حراست میں آئے صرف آٹھ دن ہوئے تھے۔ اتنے ہی دنوں میں چھما کو
اس سے خاص اُنس ہوگیا تھا۔ مردلا میں تنگ دلی اور رقابت نہ تھی۔ نہ بدگوئی
کی عادت، نہ آرائش کا خبط، نہ بیہودہ مذاق۔ اس نے مہر پذیر دل پایا تھا جوش
خدمت سے پُر، ہمدردی سے لبریز۔ چھما نے سوچا تھا اس کے ساتھ چھ مہینے
لطف سے گذر جائیں گے۔ لیکن تقدیر اُسے یہاں بھی پامال کرنے پر آمادا تھی۔
کل مردلا یہاں سے چلی جائے گی۔ پھر وہ اکیلی ہو جائے گی۔ مردلا نے پوچھا
"تمہیں تو ابھی آٹھ مہینے باقی ہیں بہن؟ بڑی مشکل سے گذریں گے۔" چھما نے
حسرت ناک لہجے میں کہا "کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائیں گے بہن۔ مگر تمہاری
یاد ہمیشہ ستایا کرے گی۔ اس ایک ہفتے کے اندر تم نے مجھ پر نہ جانے کیا
جادو کردیا۔ جب سے تم آئی ہو مجھے یہ جیل خانہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی
ملتی رہنا۔"

مردلا نے دیکھا چھما کی انکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ تشفی کے
انداز میں بولی: "ضرور ملوں گی بہن۔ مجھے خود بغیر تم سے ملے چین نہ آئے گا۔
بھان کو بھی لاؤں گی۔ کہوں گی تیری موسی آئی ہے۔ تجھے بلا رہی ہے۔ دوڑا ہوا
آئے گا۔ اب آج تم سے کہتی ہوں بہن یہاں مجھے کسی کی یاد آتی تھی تو بھان کی۔
بے چارا اماں اماں کہہ کر مجھے تلاش کرتا ہوگا اور روتا ہوگا۔ مجھے دیکھ کر روٹھ
جائے گا۔ "تم کہاں چلی گئی تھیں؟ جاؤ میں تم سے نہیں بولتا۔ تم میرے گھر سے

نکل جاؤ۔، بڑا شیطان ہی بہن۔ دم بھر بھی آرام سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ صبح اُٹھتے ہی گاتا ہے ''جھنا اونتا لہے امالا جھولاج کا مندل ریل میں ہی،، (جھنڈا اونچا رہے ہمارا سوراج کا مندر جیل میں ہی) .... باپ کو تو کہتا ہی ،تم گلام ہو۔ ایک انگریزی کمپنی میں نوکر ہیں۔ باربار سوچتے ہیں استعفا دے دوں لیکن گذر بسر کی بھی کوئی صورت ہو۔ کیسے چھوڑیں؟ وہ اب تک چھوڑ بیٹھے ہوتے بہن۔ سچ کہتی ہوں نوکری سے انہیں نفرت ہی۔ لیکن میں ہی منع کرتی رہی ہوں۔ بیچارے کیسے دفتر جاتے ہوں گے۔ کیسے بھان کو سنبھالتے ہوں گے۔ ساس جی کے پاس تو رہتا ہی نہیں۔ وہ بیچاری بوڑھی اس کے ساتھ کہاں کہاں تک دوڑیں۔ چاہتی ہیں کہ میرے پاس بیٹھا رہے۔ وہ پل بھر نچلا نہیں بیٹھتا۔ اماں بہت بگڑیں گی۔ بس یہی ڈر لگ رہا ہی۔ مجھے دیکھنے ایک دن بھی نہیں آئیں۔ کل بابوجی کہتے تھے ’تم سے بہت ناراض ہیں، .... میں تو ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی بہن۔ پرانے زمانے کی ہیں .... کل چل کر منانا پڑے گا۔ بڑی منتوں سے مانیں گی۔ کل ہی کتھا ہوگی، دیکھ لینا۔ برہمن کھائیں گے۔ جیل خانہ کا پراشچیت تو کرنا ہی پڑے گا۔ تم ہمارے گھر ایک دو دن رہ کر تب جانا بہن۔ میں تمہیں آکر لے جاؤں گی۔،،

چھما کو ان خوشیوں میں سے ایک بھی نصیب نہ تھی۔ وہ اکیلی بیوا تھی۔ جلیان والا باغ میں اس کا آشیانہ برباد ہوگیا تھا۔ شوہر مارا گیا، لڑکے مارے گئے۔ اب کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتی۔ ان دس برسوں سے اس کا حرماں نصیب دل قوم کی خدمت میں تشفی اور سکون کی تلاش کر رہا تھا۔ جن اسباب نے اس کے بسے ہوئے گھر کو ویران کردیا، اس کے سہاگ کو لوٹا، اس کی گود سونی کردی، ان اسباب کو مٹانے مجنونانہ جوش کے ساتھ مصروف تھی۔ بڑی سے بڑی قربانیاں تو وہ پہلے ہی کرچکی تھی۔ اب اس کے پاس اپنے دل

و دماغ کو قربان کرنے کے سوا اور رہ ہی کیا گیا تھا۔ اوروں کے لئے خدمت قوم تہذیب کا تقاضا ہو یا نمود کا ایک ذریعہ، اس کے لئے تو یہ عبادت تھی۔ وہ اپنی ساری نسوانی عقیدت اور انہماک کے ساتھ اسے بجا لاتی تھی۔ لیکن طائر کو آسمان پر پرواز کرنے کے بعد آشیانے کی یاد تو آتی ہی ہے۔ چھما کا یہ آشیانا کہاں تھا .... یہاں درد شناس مردلا کو پاکر وہ اپنی قسمت کی تعریف کررہی تھی۔ مگر یہ صحبت بھی اتنی جلد برہم ہوگئی۔

چھما حسرت ناک انداز سے بولی: «یہاں سے جاکر بھول جاؤگی...... کبھی کہیں ملاقات ہوجائے گی تو یا تو پہچانوگی ہی نہیں یا ذرا سا مسکرا کر نمستے کہتے ہوئے اپنی راہ چلی جاؤگی۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ اپنے رونے سے فرصت ہی نہیں ملتی، دوسرے کے لئے کیوں کر روئے۔ تمہارے لئے تو میں کچھ نہ تھی، میرے لئے تم سب کچھ تھیں۔ اپنے پیاروں میں بیٹھ کر کبھی کبھی مجھے ضرور یاد کرلیا کرنا۔ بھکاری کے لئے چٹکی بھر آٹا ہی بہت ہے۔»

دوسرے دن مجسٹریٹ نے فیصلا سنا دیا۔ مردلا رہا ہوگئی۔ شام کو وہ سب بہنوں سے گلے مل کر، روکر، رلا کر رخصت ہوئی، گویا میکے سے بدا ہوئی ہو۔

۳

تین مہینے گذر گئے۔ مگر مردلا ایک بار بھی نہ آئی۔ اور قیدیوں سے ملنے والے آتے رہتے تھے اور بعضوں کے گھر سے کھانے پینے کی چیزیں بھی آجاتی تھیں۔ لیکن چھما کو کون پوچھنے والا تھا۔ ہر مہینے کے آخری اتوار کو وہ صبح سے مردلا کا انتظار کرنے لگتی۔ جب ملاقات کا وقت گذرجاتا تو ذرا دیر روکر دل کو سمجھالیتی، ‹زمانے کا یہی دستور ہے۔›

ایک دن شام کو چھما سندھیا کر کے اُٹھی تھی کہ دیکھا مردلا سامنے چلی آرہی ہے۔ نہ وہ چہرا ہے نہ وہ رونق۔ دوڑ کر اُس کے گلے سے لپٹ گئی اور روتی ہوئی بولی، «یہ تیری کیا حالت ہے مردلا؟ صورت ہی بدل گئی۔ کیا تم بیمار ہو؟» مردلا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ بولی «بیمار تو نہیں ہوں بہن، مصیبت زدہ ہوں۔ تم مجھے بےوفا اور وعدہ فراموش سمجھتی ہوگی۔ ان ساری شکایتوں کی تلافی کرنے آئی ہوں اور ساری فکروں سے آزاد ہوکر آئی ہوں۔»

چھما کا دل کانپ اُٹھا۔ سینے کی گہرائیوں سے ایک لہر سی اُٹھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بولی «خیریت تو ہے؟ اتنی جلدی تم پھر یہاں کیوں آگئیں؟ ابھی تو تین مہینے بھی نہیں ہوئے۔»

مردلا زورِ تبسم سے بولی: «اب سب خیریت ہے بہن۔ ہمیشہ کے لئے خیریت ہوگئی۔ کوئی فکر نہیں رہی۔ اب یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے تیار ہوں۔ تمھاری محبت کی کشش اب معلوم ہوئی۔» اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی: «تمہیں باہر کی خبر کیا ملی ہوگی۔ پرسوں شہر میں گولیاں چلیں۔ دیہاتوں میں آج کل لگان وصول کیا جارہا ہے۔ کسانوں کے پاس روپیہ ہے نہیں۔ غلّہ ارزاں ہوگیا ہے اور دن بدن بھاؤ گرتا جارہا ہے۔ پونے دو رُپے میں من بھر گیہوں آتا ہے۔ میری عمر ہی کیا ہے۔ اماں بھی کہتی ہیں اتنا سستا غلّہ کبھی نہیں تھا۔ کھیت کی پیداوار سے بیجوں کے دام تک نہیں آتے۔ سنچائی اور محنت اوپر۔ غریب کہاں سے دیں۔ سرکار کا حکم ہے کہ جیسے بھی ہو لگان وصول کیا جائے۔ کسان اس پر بھی راضی ہیں کہ ہمارے مال و اسباب نیلام کرلو، قرق کرلو، اتنی زمین لے لو۔ مگر یہاں تو حاکموں کو اپنی کارگذاری دکھانے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ بھیروی گنج کا علاقا پِسا جارہا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ایک کسان کے گھر میں آکر کئی کانسٹبلوں نے اُسے پیٹنا شروع کیا۔

بیچارا بیٹھا مار کھاتا رہا۔ اس کی بیوی سے نہ رہا گیا۔ شامت کی ماری کانسٹبلوں کو گالیاں دینے لگی۔ بس ایک کانسٹبل نے اُسے برہنہ کردیا .... اب کسان سے ضبط نہ ہوا۔ کبھی پیٹ بھر غریبوں کو کھانے کو تو ملتا نہیں۔ اس پر اتنی بڑی مشقت۔ جسم میں نہ طاقت باقی رہتی ہے نہ ہمت۔ مگر انسان کا دل ہی تو ٹھہرا۔ بیچارا بےدم پڑا تھا۔ بیوی کا چلانا سن کر اُٹھ بیٹھا اور اس بدمعاش کانسٹبل کو زور سے دھکا دے کر اس سے لپٹ گیا۔ ایک کسان کسی پُلیس کے آدمی کے ساتھ اتنی بے ادبی کرے، اسے بھلا کہیں وہ برداشت کرسکتا ہے۔ سب کانسٹبلوں نے غریب کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔

چمپا۔ گاؤں کے اور لوگ تماشا دیکھتے رہے ہوں گے۔

مردلا۔ اس میں بھی آفت ہے۔ اگر دس بیس آدمی جمع ہوجاتے تو پُلیس سمجھتی کہ مزاحمت کرنے آئے ہیں۔ شاید ڈنڈے چلانا شروع کر دیتی۔ اور اگر کوئی آدمی غصہ میں ایک آدھ پتھر پھینک دیتا تو گولیاں چلادیتی۔ دو چار آدمی بُھن جاتے۔ اسی لئے لوگ جمع نہیں ہوئے۔ لیکن جب وہ کسان مرگیا تو گاؤں والے طیش میں آگئے۔ لاٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے اور کانسٹبلوں کو گھیر لیا۔ ممکن ہے دو چار آدمیوں نے لاٹھیاں بھی چلائی ہوں۔ کانسٹبلوں نے گولیاں چلانی شروع کیں۔ دو کانسٹبلوں کے چوٹیں آئیں۔ اس کے بدلے دس بارہ آدمیوں کی جانیں لے لی گئیں۔ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو اختیارات مل جاتے ہیں تو یہ لوگ اس کا بےجا استعمال کرتے ہیں۔ گاؤں کے غریب لوگوں پر اپنا رعب جما کر کانسٹبل فتح کے نعرے بجاتے ہوئے لوٹ گئے۔ گاؤں والوں کی فریاد کون سنتا۔ غریب ہیں، بےکس ہیں، بےزبان ہیں۔ جتنے آدمیوں کو چاہو مارڈالو۔ حکام اور عدالت سے انہوں نے انصاف کی امید چھوڑدی۔ سوچتے ہیں، آخر اسی سرکار نے تو کانسٹبلوں کو تعینات کیا تھا۔ وہ سرکار کسانوں کی فریاد کیوں سننے لگی؟ مگر

آدمی کا دل بغیر فریاد کئے نہیں مانتا۔ گاؤں والوں نے اپنے شہر کے بھائیوں سے فریاد کرنے کا فیصلا کیا۔ پبلک اور کچھ نہیں کرسکتی، ہمدردی تو کرتی ہی۔ غم کی داستان سن کر آنسو تو بہاتی ہی۔ مظلوم کے لئے ہمدردی کے آنسو بھی تو کم پیارے نہیں ہوتے۔ اگر آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہوکر کچھ ہمدردی کرتے تو ان غریبوں کو تشفی ہوجاتی۔ مگر پُلیس نے اس گاؤں میں لوگوں کا آنا جانا بند کردیا تھا۔ چاروں سرحدوں پر کانسٹبل کھڑے کردئے تھے۔ یہ زخم پر نمک تھا .... آخرکار لوگوں نے لاشیں اُٹھائیں اور شہر والوں کو اپنی مصیبت سنانے آئے۔ ہنگامے کی خبر پہلے ہی شہر میں پہنچ چکی تھی۔ ان مظلوموں کو دیکھ کر پبلک میں اشتعال پیدا ہوگیا اور جب سپرنٹنڈنٹ پُلیس نے ان لاشوں کا جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی تو لوگ اور بھی جھلائے۔ بہت بڑا مجمع ہوگیا۔ میرے بابوجی بھی اس میں تھے۔ سمجھاتی رہی، مت جاؤ۔ آج کا رنگ اچھا نہیں۔ کہنے لگے، میں کسی سے لڑنے تھوڑے ہی جاتا ہوں۔، پچاس ہزار آدمی جنازے کے ساتھ تھے اور پانچ سو مسلح پُلیس روکے ہوئے تھی ...... جب بار بار پُلیس کی دھمکیوں پر بھی مجمع منتشر نہ ہوا تو گولیاں چلانے کا حکم ہوگیا۔ فائر ہونے لگے۔ کتنے گھائل ہوئے کون جانتا ہے۔ میرا مکان سڑک پر ہے۔ میں اپنے چھجے پر کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ ہزاروں آدمی بھاگے چلے آرہے تھے۔ بہن وہ نظارا یاد کرکے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایسی وحشت، ایسی سراسیمگی کہ تم سے کیا کہوں! مگر ان بھاگنے والوں کے پیچھے سرفروش جاں بازوں کی ایک جماعت تھی جو دیوار کی طرح مستقل کھڑے گولیاں کھا رہے تھے اور پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ بندوقوں کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں اور ہر ایک دھائیں کے بعد ہزاروں گلوں سے جے کی صدا نکلتی تھی۔ اس صدا میں کتنی کشش تھی، کتنا جوش، تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ جاکر گولیوں کے سامنے کھڑی ہوجاؤں اور ہنستے ہنستے مرجاؤں۔ اس

وقت ایسا معلوم ہورہا تھا کہ مرجانا کوئی کھیل ہے۔ اماں جی کمرے میں بھان کو لئے مجھے اندر بلا رہی تھیں۔ جب میں اندر نہ گئی تو بھان کو لئے چھجے پر آگئیں۔ اسی وقت دس بارہ آدمی ایک اسٹریچر پر میرے سوامی کی لاش لئے ہوئے دروازے پر آئے۔ اماں کی نظر ان پر پڑی۔ سمجھ گئیں۔ مجھے تو سکتا سا ہوگیا۔ اماں جان نے جاکر لاش کو ایک بار دیکھا۔ اسے چھاتی سے لگایا۔ اس کا بوسا لیا اور سیدھی چوراہے کی طرف چلیں جہاں سے اب بھی دھائیں اور جی کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نقش دیوار بنی کبھی لاش کو دیکھتی تھی کبھی اماں جی کو۔ نہ کچھ بولی، نہ جگہ سے ہلی، نہ روئی نہ بے قرار ہوئی۔ احساس کی مجھ میں قوت ہی نہ رہی تھی۔ اماں جی جاں بازوں کی صف میں جاکر سامنے کھڑی ہوگئیں اور ایک منٹ میں ان کی لاش بھی زمین پر گر پڑی۔ ان کے گرتے ہی جاں بازوں کا ضبط بھی رخصت ہوگیا۔ ان کے سر پر خون سا سوار ہوگیا۔ نہتے تھے مگر ہر ایک فرد اپنے دل میں شیر کی قوت محسوس کررہا تھا۔ سپاہیوں نے سیلاب کو آتے دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ جانیں لے کر بھاگے۔ کوئی ادھر کوئی ادھر۔ مگر بھاگتے ہوئے بھی گولیاں چلاتے جاتے تھے۔ بھان چھجے پر کھڑا تھا۔ نہ جانے کدھر سے آکر ایک گولی لگی۔ میرا لال بھی وہیں گر پڑا۔ سانس تک نہ لی۔ مگر میری آنکھوں میں اب بھی آنسو نہ تھے۔ میں نے بھان کو گود میں اٹھالیا۔ اس کے سینے سے خون جاری تھا۔ میں نے اسے جو دودھ پلایا تھا اسے وہ خون سے ادا کررہا تھا۔ اس کے خون سے تر کپڑے دیکھ کر مجھے ایسا فتح مندانہ غرور ہورہا تھا جو شاید اس کے بیاہ میں ریشمی کپڑے پہن کر بھی نہ ہوتا۔ لڑکپن، جوانی اور موت ساری منزلیں ایک ہچکی میں تمام ہوگئیں۔ میں نے بیٹے کی لاش کو باپ کی گود میں دے دیا۔ اتنے میں اماں جی کا جنازا بھی آپہنچا۔ معلوم ہوتا تھا لیٹی ہوئی مسکرا رہی ہیں۔ مجھے تو روکتی رہتی تھیں اور خود اس طرح بھاگ کر آگ میں کود پڑیں، گویا وہی سورگ کا راستہ ہے۔ جب

ندی کے کنارے ایک ہی چتا میں لاشیں رکھی گئیں تب میرا سکتا ٹوٹا۔ ہوش آیا۔ ماں اپنے جنم بھر کی کمائی لئے جاتی ہی - جنہیں نازوں سے پالا، انہیں چھوڑ کر کیسے جاتی۔ وہ تو اپنے بیٹے اور پوتے کے ساتھ گئیں۔ میرے لئے کیا چھوڑا؟ ایک بار جی میں آیا میں بھی انہیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں۔ سارا کنبا ایک ساتھ ایشور کے دربار میں جاپہنچے۔ لیکن پھر میں نے سوچا تو نے ابھی ایسا کام ہی کون سا کیا ہی جس کا معاوضہ یہ ملے۔ بہن، اس چتا کی لپٹوں میں ایسا معلوم ہورہا تھا کہ اماں جی سچ مچ بھان کو گود میں لئے بیٹھی مسکرا رہی ہیں اور سوامی جی مجھ سے کہہ رہے ہیں تم جاؤ اور بے فکر ہوکر۔ کام کرو۔ ان کے چہرے پر کتنا جلال تھا! خون اور آگ میں ہی تو دیوتا بنتے ہیں۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ندی کے کنارے نہ جانے کتنی چتائیں جل رہی تھیں۔ دور سے یہ جلتی ہوئی چتائیں مشعلوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں جیسے دریا کے پل پر برقی لالٹینوں کی ایک قطار ہو۔ اسی پل پر ہوکر شہادت کی منزل ہی اور یہی مشعلیں بقائے دوام کی طرف لے جاتی ہیں یا یہ بھٹیاں تھیں جن میں بھارت کی تقدیر گڑھی جارہی تھی۔

جب چتائیں راکھ ہوگئیں تو ہم لوگ لوٹے۔ لیکن اس گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ میرے لئے اب وہ گھر نہ تھا۔ میرا گھر اب یہ ہی جہاں میں بیٹھی ہوں یا پھر وہی چتا۔ میں نے گھر کا دروازا بھی نہیں کھولا۔ مہلا آشرم میں چلی گئی۔ کل کی گولیوں میں کانگرس کمیٹی کا صفایا ہوگیا تھا۔ کانگرس باغی انجمن قرار دے دی گئی۔ اس کے دفتر پر پُلیس نے چھاپا مارا اور اس پر اپنا قفل ڈال دیا۔ مہلا آشرم پر بھی حملہ ہوا۔ اس پر بھی قفل ڈال دیا گیا۔ ہم نے ایک درخت کے سائے میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کرتے رہے۔ شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلا کیا۔ کل کے خونیں واقعہ کی یاد اور خوشی

اور مبارکباد میں جلوس نکالنا ضروری تھا۔ لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ہم زندہ ہیں، مستعد ہیں، میدان سے ہٹے نہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ یہ دکھا دینا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں۔ ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد خودغرضی اور خون چوسنے پر رکھی گئی ہے۔ پُلیس نے جلوس روک کر اپنی زندگی اور قوت کا ثبوت دینا بھی ضروری سمجھا۔......... وہ یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے۔ تمہاری خوشی یا ناخوشی کی ہم کو پرواہ بھی نہیں۔ جلوس نکالنے کی ممانعت کردی گئی۔ پبلک کو ہدایت اور تنبیہہ کی گئی کہ خبردار! جلوس میں نہ آنا ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔ مگر شام کے وقت پچاس ہزار کا مجمع ہوگیا۔ آج کانگرس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کررہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا شعور بھی نہیں، جس نے گھر سے قدم نہیں نکالا آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس رتبے پر پہنچ گئی تھی جو بڑے سے بڑے سرکاری افسر کو بھی، بڑے سے بڑے مہاراجا کو بھی حاصل نہیں۔ یہ دلوں کی حکومت تھی۔ یہ مجمع کیا میرا تنخواہ دار تھا یا اسے مجھ سے کسی نفع کی امید تھی یا نقصان کا خوف تھا۔ ہرگز نہیں۔ پھر بھی وہ میرے کڑے سے کڑے حکم کو بسر و چشم ماننے کے لئے تیار تھے اسی لئے کہ ان کے دلوں میں آزادی کی جو تڑپ، غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے کی جو بےچینی ہے، میں اسی تڑپ اور بےچینی کی زندہ مثال تھی۔ جلوس روانہ ہوا۔ اسی وقت پُلیس نے میری گرفتاری کا وارنٹ دکھایا۔ مجھے وارنٹ دیکھتے ہی تمہاری یاد آئی۔ پہلے تمہیں میری ضرورت تھی۔ اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ پہلے تم مجھ سے ہمدردی کی خواستگار تھیں۔ اب میں تمہاری ہمدردی کے لئے ہاتھ

پھیلائے ہوئے ہوں اور مجسٹریٹ جو بڑی سے بڑی سزا دے اس کے لئے تیار ہوں۔ اب میں پُلیس کی غلط بیانیوں یا بےجا الزام کے خلاف زبان تک نہ کھولوں گی کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ آزاد رہ کر جو کچھ کرسکتی ہوں جیل میں اس سے کہیں زیادہ کرسکتی ہوں۔ آزادی میں غلطی کا امکان ہے، بھٹکنے کا خوف ہے، مصالحت کا اندیشہ ہے، رقابت کی فکر ہے۔ جیل احترام اور عقیدت کا ایک دائرا ہے جس کے اندر شیطان قدم نہیں رکھ سکتا۔ میدان میں جلتا ہوا الاؤ ہوا میں اپنی حرارت کھو دیتا ہے لیکن انجن میں بند ہوکر وہی آگ تحریک کا لازوال خزانہ بن جاتی ہے۔"

اور دیویوں کو بھی خبر ملی۔ سب کی سب مردلا سے ملنے آپہنچیں۔ پھر بھارت ماتا کی جے کی صدا جیل کی دیواروں کو توڑتی ہوئی آسمان میں جا پہنچی۔

منٹو (سعادت حسن)

شرابی

["یاد رکھو جب تک لوگ خائف ہیں وہ دلدل میں برچ کے درختوں کی طرح گلتے سڑتے رہیں گے۔ ہمیں حوصلہ مند ہونا چاہئیے۔" گورکی]

"کام ختم ہوچکا ہے۔ آؤ، چلیں۔ بارش ہو رہی ہے۔ تانگا منگوالیتے ہیں۔"

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ حلیم صاحب نے اپنے دفتر کے نوکر سے تانگا منگوایا اور ہم اس میں سوار ہوگئے۔ پشاور کے بازار میرے لئے بالکل نئے تھے۔

اگر حلیم صاحب یہاں موجود نہ ہوتے تو شاید مجھے اس جگہ آنے کا کبھی اتفاق نہ ہوتا۔ میں پشاور میں پہلی مرتبہ آیا تھا اس لئے فطری طور پر میری نگاہیں سڑک کے ہر زاویے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ مکانوں کی ساخت اور دوکانوں کی شکل و صورت میں کوئی فرق نہ تھا۔ البتہ فضا کسی قدر غیر مانوس تھی۔

ہمارا تانگا مختلف بازاروں سے ہوتا ہوا ایک خاموش اور نیم تاریک بازار کے موڑ پر پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور حلیم صاحب تانگے کا توازن قائم رکھنے کے لئے کوچوان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جب تانگا ایک خفیف جھٹکے کے ساتھ ٹھہرا تو میں نے مڑ کر حلیم صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ تانگے والے کو کرایا ادا کر رہے تھے۔ میں نے تانگے پر سے اترنے کے لئے اپنی ٹوپی اٹھاتے ہوئے ان سے پوچھا:
«آپ نے اسی بازار میں رہائش کا انتظام کیا ہے؟»

حلیم صاحب تانگے والے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ «آپ آج ہی یہاں تشریف لائے ہیں۔» پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔ «چلو بھئی، چلیں۔»

ہم دونوں تانگے پر سے اتر پڑے اور پیدل چلنا شروع کیا۔ بارش تیز نہ تھی۔ ننھی ننھی بوندیں سڑک کی پتلی کیچڑ پر گر کر ایک مدھم گنگناہٹ پیدا کر رہی تھیں ....

میں سڑک کے کیچڑ بھرے گڑھوں سے بچتا ہوا مختلف خیالات میں غرق چلا جا رہا تھا کہ حلیم صاحب کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ وہ ایک دکان کے چھپر کے نیچے کھڑے اپنے ہاتھ سے مجھے بلا رہے تھے۔ میں واپس مڑا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ جس دکان کے پاس وہ کھڑے تھے اس کے باہر مٹی سے لپے ہوئے چبوترے پر ایک آدمی لوہے کی

میلی کڑاہی میں مچھلی کے ٹکڑے تل رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ دکان میں داخل ہونے کا راستا چھوڑ کر پان والے کی چھوٹی سی دکان تھی ....

"یہ چینیوں کا غار ہے!"........... حلیم صاحب نے دکان کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارا کرتے ہوئے معنی خیز لہجہ میں کہا۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور ہنستے ہوئے کہا، "کچھ پینے کا ارادا ہے؟"

ہم دونوں دکان کے اندر داخل ہوئے۔ حلیم صاحب میرے آگے تھے۔ میں نے جوں ہی دہلیز پر قدم رکھا بھاپ کا ایک جھونکا میرے نم آلود گالوں سے مس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دیسی شراب کی تیز بو میری ناک میں گھس گئی۔ کمرے کے اندر دس پندرہ آدمی شغل مے نوشی میں مصروف تھے۔

حلیم صاحب اور میں کمرے کے وسط میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے مستطیل چوبی تختے کے ساتھ ہو کر سرکنڈوں سے بنے ہوئے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ ان پر ٹاٹ کے میلے ٹکڑے منڈھے ہوئے تھے جس سے وہ بہت غلیظ معلوم ہوتے تھے۔ چوبی تختا بھی بے حد میلا تھا۔ اس پر جابجا میل ابھر رہا تھا۔ ....

ٹھیکے کے ایک پہاڑی نوکر کے آنے پر حلیم صاحب نے اسے ایک ادھیا لانے کو کہا۔ اس کو چند اور ہدایات دینے کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئے۔

"میں اور رتن چند عام طور پر یہیں آیا کرتے ہیں۔ ہماری اکثر شامیں اسی چھت کے نیچے گذرتی ہیں۔ پھر مسکرا کر کہا، کیا یہ جگہ تمہیں پسند ہے؟"

میں نے کمرے کو ایک نظر دیکھا اور جواب دیا، «خاصی دلچسپ ہی۔»

«رتن چند اس جگہ کو چینیوں کے غار کے نام سے پکارتا ہو۔ تم بھی کچھ پیوگے نا؟» حلیم صاحب نے مجھ سے کہا۔

مجھے کوئی انکار نہ تھا۔ لیکن مجھے جیل سے رہا ہوئے ابھی ایک ہی مہینا ہوا تھا اور وہاں کی تکلیف دہ زندگی نے مجھے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اس لئے شراب میرے لئے غیر مفید تھی۔

«آپ جانتے ہیں کہ بڑے گھر نے میرے معدے کے تمام پرزے ہلادئے ہیں۔ میرا خیال ہی کہ ابھی کچھ دن اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔»

«آہ! ہمارے آقاؤں کی مہماں نوازیاں۔» حلیم صاحب نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔ «میں بھول ہی گیا تھا کہ تم زندانی پرندے ہو۔ ہم ایک دوسرے سے ایک عرصے کے بعد مل رہے ہیں۔ یہ کس قدر افسوسناک امر ہی کہ تم نہ پیوگے۔»

ہم یہ باتیں کررہے تھے کہ نوکر شراب، سوڈے کی دو بوتلیں، گلاس اور مچھلی لےکر آگیا اور یہ تمام چیزیں تختے پر رکھ کر حلیم صاحب سے کہنے لگا، «کیا سوڈے کی بوتل کھول دوں؟»

حلیم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ چنانچہ نوکر سوڈے کی ایک بوتل اپنے انگوٹھے سے کھول کر باہر چلاگیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کمرے کا جائزا لینا شروع کر دیا۔.........

کمرے کی فضا سخت غم افزا تھی۔ شراب کی تیز بو نے اس تکدر میں اور بھی اضافہ کردیا تھا۔

«تم اُداس ہو۔ .... میرا خیال ہی کہ تم بھی تھوڑی سی لے لو۔ کیوں؟»

«میں، حلیم صاحب، نہیں پیوں گا۔ میری طبیعت ایک عرصے سے اُداس ہی اور ہمیشہ اُداس رہے گی۔»

«مگر اس یاس اور قنوط کی وجہ؟ چھوڑو یار ان خیالوں کو۔»

«میں قطعی طور پر نا امید ہوچکا ہوں۔ جیل نے میرے اعضا پر ایک ناقابل بیان اضمحلال طاری کر دیا ہی۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید زنداں کا دروازا مجھے میرے خوابوں کی دنیا میں لے جائے گا۔ مگر میں اس میں داخل ہوکر بھول بھلیوں میں گرفتار ہوگیا ہوں۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جیل اور گھر کی چاردیواری انسان کو کچھ نہیں سکھا سکتی .... لیکن پھر ان لوگوں کے مضطرب اور متجسس سینوں کو کون قرار بخش سکتا ہی جو وطن کو آزاد دیکھنے کے آرزومند ہیں؟ یہ سوال ہی جس کا جواب مجھے نہیں ملتا اور یہی وجہ ہی کہ میں مغموم ہوں آہ! آزادی .... خدا معلوم اس کا ذائقا کس قدر لذیذ ہوگا! میں آزاد لوگوں کے حالات پڑھتا ہوں تو مجھے ایک افسانا سا معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم بھی کبھی آزاد ہوں گے؟ .... اس کا جواب مجھے نہیں ملتا۔»

«وطن کو لیڈروں کی ضرورت ہی۔» حلیم صاحب نے اپنی رائے ظاہر کی۔ «ہندوستان اب بہت حد تک بیدار ہوچکا ہی۔»

«درست۔ مگر وہ لیڈر کب اور کہاں سے آئیں گے؟ ہم نوجوانوں کو ایسے قائد کی ضرورت نہیں جس کے سینے سیاسیات کے سٹیج پر فرقہ وارانہ مفاد ناچ رہا ہی اور جو ہم‌وطنوں کے تعلقات کو اور بھی کشیدہ کرتا ہی۔ ہمیں

لیڈروں کی ضرورت ہی لیکن ایسے ایڈروں کی نہیں جو اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے مضحکہ خیز حرکات کر رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمارے وطن کو صرف ایک قائد کی ضرورت ہی جو سر سے ننگا ہو، جس کے پاس پہننے تک کے لئے کپڑا نہ ہو، جو برہنہ پا اور گرسنہ شکم ہو اور جس کے دماغ اور سینے میں چنگاریاں بھری ہوئی ہوں۔ ملوکیت کے خس و خاشاک کو جلانے کے لئے نرم و نازک آہوں کی ضرورت نہیں، شعلوں کی ضرورت ہی۔۔۔۔۔»

«حلیم صاحب، کیا گفتگو ہورہی ہی؟» ایک صاحب کی آمد نے گفتگو کے سلسلے کو منقطع کردیا۔ نووارد حلیم صاحب کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف گھور کر دیکھا۔ مونڈھا لے کر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی داڑھی تازہ منڈی ہوئی تھی، اس لئے کہ اس کے گالوں پر صابن کے سپید دھبے صاف نظر آرہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی مونچھوں کے بل اور اس کی چوڑی پیشانی سے آہنی عزم کے آثار مترشح تھے۔ قد لمبا، چھاتی ابھری ہوئی، بازو جو کہنیوں تک ننگے تھے گوشت سے بھرے ہوئے تھے۔

«آج آپ دیر سے آئے۔ شاید بارش کی وجہ سے۔» حلیم صاحب نے نووارد سے کہا۔

نووارد نے جواب دیا «میں وقت پر آیا تھا۔ آدھی خوراک پی کر ذرا داڑھی منڈانے چلا گیا تھا۔» پھر پاس کھڑے ہوئے نوکر سے مخاطب ہو کر کہا «جناب، [illegible]»

«آپ کا اسم گرامی گل زماں ہی» حلیم صاحب نے نووارد کی طرف

اشارا کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”آپ بیدار مغز اور جواں ہمت نوجوان ہیں۔ آپ کے خیالات سننے کے قابل ہیں اور آپ (میری طرف اشارا کرتے ہوئے) آپ میرے عزیز دوست ہیں جو حال ہی میں سیاسی وجوہ کی بنا پر دو سال کی قید کاٹ کر آرہے ہیں۔“

«آپ غالباً پہلی مرتبہ پشاور تشریف لائے ہیں۔» اس نے ہاتھ ملاکر مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

«جی ہاں» یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔ حلیم صاحب نے گلاس میں شراب اور سوڈے کو ملایا اور گل زماں کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اسے بلا تکلف ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا اور اپنی مونچھوں کو کرتے کے بازو سے پونچھتے ہوئے کہا ”حلیم صاحب سے آپ کی گفتگو کے چند آخری فقرے میں نے سن لئے تھے۔ آپ کا دل سچائی کے قریب معلوم ہوتا ہے۔“

«کاش کے مجھے ایسا معلوم ہوتا! میں تو خود کو ایک بھٹکا ہوا مسافر خیال کرتا ہوں جسے کوئی راستا نظر نہیں آتا۔» میں نے جواب دیا۔ «ممکن ہے کہ میرے ان فقروں میں کچھ جان نظر آتی ہو۔ مگر میں بے جان ہوں۔»

«یہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟ یہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟» اس نے نوکر سے شراب کی بوتل، گلاس اور سوڈے کی بوتل لے کر انہیں باری باری تختے پر رکھتے ہوئے کہا «آپ جوان ہیں۔ پھر یہ ناامیدی کیوں؟»

«یہ کہہ کر اس نے گلاس میں شراب اُنڈیلی اور اس میں سوڈا ڈال کر بوتل کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنے پہلے الفاظ کو دہرائے «کیوں کر ہوسکتا ہے؟»

اس کی آنکھیں اب بھی سرخ تھیں۔

«مجھے معلوم نہیں کیوں۔ شاید اس کا جواب ہندوستان کے ماضی اور حال میں مل سکے۔»

«آپ کیسی باتیں کررہے ہیں! ماضی، یعنی جوکچھ گذرچکا ہی ہمیں اس سے کیا تعلق؟ وہ ہماری ملکیت نہیں۔ ہاں، حال، یہ بےشک ہمارا ہی۔ مگر آپ اس سے نا امید کیوں ہیں؟»

گل زماں کی سرخ آنکھیں تپے ہوئے لوہے کی طرح میرے سینے میں داخل ہورہی تھیں۔ اس کے سوال کرنے کا انداز اس قدر بے باک اور تلوار کی دھار کی طرح تیز تھا کہ میں گھبراگیا۔

«ظلم کی فراوانی اور مظلوموں کی بےچارگی، یہ ہی ہمارے حال کی تصویر۔ اسے دیکھ کر کون مایوس نہ ہوگا؟» میں نے جلدی سے اپنے فقرے کو پورا کرتے ہوئے جواب دیا۔

گل زماں نے گلاس منھ سے لگاکر لمبے لمبے پانچ چھ گھونٹ بھرلئے «ظلم اور مظلوم» وہ بڑبڑایا۔ «درست ہی۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں۔»

«وہ کیوں؟» میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے میرا سوال سنا۔ لیکن آرام سے اپنی شراب کے آخری گھونٹوں کو پینا شروع کردیا۔ گلاس خالی کردینے کے بعد اس نے اسے اطمینان سے ایک طرف رکھ دیا اور دونوں کہنیاں چوبی تختے پر ٹیک کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

«اس لئے کہ میں مظاوم نہیں ہوں۔» یہ کہہ کر اس نے شراب کی بوتل سے منھ لگایا اور چشم زدن میں اسے خالی کردیا۔

«اس لئے کہ آپ مظلوم نہیں ہیں۔ یہ کیسی منطق ہی؟» میں نے اس سے پوچھا۔

«منطق صاف ہی۔ میں مظلوم نہیں ہوں۔ اس لئے، کہ میں کسی کو اپنے اوپر ظلم کرنے نہیں دیتا۔ ٹھہرئیے، آپ مظلوم کس کو کہتے ہیں؟»

اس کا رک رک کر سوال کرنے کا یہ انداز کسی کامیاب وکیل کی جرح سے زیادہ پریشان کن تھا۔ اس کی آنکھیں مجھے نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

«مظلوم؟ مظلوم وہ ہی جو کام کرے مگر اسے پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہو۔ مظلوم وہ ہی جو اپنے حقوق کے لئے آواز نکالے مگر یہ آواز اس کے حلق ہی میں دبا دی جائے۔ مظلوم وہ ہی جس پر اُس کی زندگی کے تمام دروازے بند کر دئے جائیں ۰۰۰۰۰»

«غلط۔»

اس مختصر اور ہتوڑے کی ضرب ایسے جواب سے میں جھلا گیا۔ «آپ بغیر سوچے سمجھے یہ رائے قائم کر دی ہی۔ ہم پھر کسی وقت گفتگو کریں گے»

وہ میرے آخری فقرے کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے اپنی مخمور آنکھوں کو جو نشے کی شدت کی وجہ سے خواب آلود ہو رہی تھیں کھولا اور زبان کی لکنت پر قابو پاتے ہوئے کہا: «شراب اعضا کی حرکت پر قفل لگا سکتی ہی مگر اس کا ہاتھ روح تک نہیں پہنچتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ بہت مضطرب ہیں۔ آپ کی ہر بات میں مجھے ایک تلخی سی محسوس ہوتی ہی۔ آپ خفا نہ ہوں۔ مگر میرا خیال ہی کہ آپ کے جذبات کا تیز دھارا آپ کو ایک غلط مقام پر لے گیا ہی۔ مظلوم اور ظالم ۰۰۰۰۰ یہی ہی نا ہمارا موضوع؟»

«لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کی ضربات، بندوقوں کی گولیاں، قانون کا آہنی پنجا، شیطنت۔ میں نے از خود رفتہ ہو کر کہا۔

«ٹھہرئیے، ٹھہرئیے۔ اتنے جوش کی ضرورت نہیں۔» گل زماں نے بڑی متانت سے کہا۔ «آپ پھر غلط کہہ رہے ہیں ..... ہمیں غور سے سوچنا چاہئیے۔»

«آپ ہی فرمائیے۔» میں نے حلیم صاحب کی طرف مایوس نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اپنی شراب ختم کرکے خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہے تھے۔

«مظلوم اور ظالم!» گل زماں زیرِ لب گنگنایا اور پھر بلند آواز میں کہا، «ان کے درمیان کیا شے ہے؟ ..... ایک گلاس پانی سے بھرا ہوا ہے اور دوسرا شراب سے۔ اب غور کرنا ہے کہ شراب والے گلاس میں سے کون سی چیز نکال لی جائے کہ وہ بھی سادا پانی ہوجائے۔ مظلوم اور ظالم دونوں انسان ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں؟»

«جی ہاں»

«ایک ظلم کرتا ہے اور دوسرا اس کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اس پر ظلم کرے۔ ایک طرف طاقت ہے اور دوسری طرف رضا یعنی کم زوری۔ اگر یہ رضا اور کم زوری نہ ہو تو ظلم کا وجود ناممکن ہے۔ پھر نہ ظالم ہوگا نہ مظلوم۔ ٹھیک ہے نا؟»

«آپ گفتگو جاری رکھیں۔» میں نے شرابی کے نظرئیے میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

«ظاہر ہے کہ مظلوم اور ظالم کے درمیان کم زوری اور قوت برسرِپیکار ہے۔ حکومت کے ارباب ان جلسوں پر گولیاں برساتے ہیں جو ان کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ وہ اس آواز کو یقیناً دبائیں گے۔ جو ان کے مفاد کے منافی ہو۔ اس میں وہ حق بجانب ہیں۔ وہ لوگ جو حکومت کرتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں، ان کے دماغوں کی تخلیق کسی اور ہی آب و گل سے

ہوئی ہوتی ہی۔ وہ اپنے محکوم جسم کی باغی رگ کا علاج صرف دولت سے کرنا جانتے ہیں۔ آرام، عیش اور سکون ان کے بازوؤں سے وہ تمام قوت چھین لیتا ہی جو ہماری باہوں میں زندہ ہی۔ وہ مردہ ہیں اور ہم زندہ ہیں۔ یہ کس قدر تعجب کی بات ہی کہ وہ اپنے پیلے چہروں سے ہمیں ڈراتے ہیں اور ہم ڈر جاتے ہیں۔ وہ اپنے استخوانی بازو نکال کر ہماری چوڑی چھاتیوں میں خوف پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ہم خوف زدہ ہوجاتے ہیں۔ یہ کس کا قصور ہی؟ وہ لوگ جن کا خون سرمائے اور ہوس نے خشک کردیا ہی، وہ لوگ جو مستعار ہاتھوں سے کام کرتے ہیں ان لوگوں کو ڈراتے ہیں جن کی جوانیوں میں بغاوت کے شعلے ہوتے ہیں۔ یہ کس کا قصور ہی؟»

«قصور وار ہر حالت میں وہ لوگ ہیں جو ہماری گردنوں پر ظلم کی تلوار لئے کھڑے رہتے ہیں۔» میں نے جواب دیا۔ «ہندوستان کے ۳۵ کروڑ باشندے اپنی چھنی ہوئی آزادی حاصل کرلیتے اگر ظلم کا کڑا ہاتھ ان کی گردنوں کو نہ دبائے ہوتا۔ وہ ڈراتے ہیں اور ہم اس لئے ڈرجاتے ہیں کہ ہمارے جسم کا ہر عضو ان کے ظلم سے مفلوج ہوچکا ہی۔ ہم ان سے خائف ہیں اس لئے کہ استبداد نے ہمیں بچے بنادیا ہی۔ آپ کا نظریہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔»

اس پر گل زماں کی موچھیں تھرائیں اور اس نے اپنی اُبھری ہوئی چھاتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، «ہوسکتا ہی کہ میرا نظریہ قابلِ قبول نہ ہو۔ مگر ہمیں سوچنا چاہئے . . . . . استبداد. جور، ظلم یہ ایک عذر کے تین نام ہیں جو کم زور لوگ اپنے ارتعاش کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ کتنی مضحکہ خیز غلطی ہی! اپنی کم زوریوں کو دوسروں کے ستم سے تعبیر کرنا یہ کہاں کی دانش مندی ہی؟ ایک شخص عورتوں کی طرح ٹسوے بہاتا ہوا آتا ہی اور فریاد کرتا ہی 'فلاں شخص نے میرے گھر پر قبضا جمالیا ہی'۔ اس فریادی کے ہاتھ

سلامت ہیں۔ اس کی انگلیوں میں گرفت زندہ ہے۔ اس میں مقابلے کی قوت موجود ہے اچھا بھلا سانس لے رہا ہے .... میں پوچھتا ہوں کیا یہ آدمی زمین کے سینے پر بدنما دھبا نہیں؟ .... ہندوستان میں ۳۵ کروڑ باشندے آباد ہیں کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس ٹڈی دل پر کتنے لوگ حکومت کررہے ہیں؟ آپ ان کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں......... حاکم ہرگز لعون و مطعون نہیں ہوسکتے۔ ہمارا وطن خوف میں اپٹا ہوا ہے۔ اس دُھند کو دور کردیجئے پھر آپ کو ہر چیز روشن نظر آئے گی۔

«آپ کے خیال میں صرف خوف ہی وطن کے مصائب کا باعث ہے؟» یہ پوچھتے ہوئے میں نے خود کو ایک کم‌سن بچہ محسوس کیا۔

«یقیناً» گل زماں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ «خوف باعث ہے اس اضمحلال کا جو آپ لوگوں پر طاری ہے اور یہ اضمحلال ان مصائب کا جو ہندوستان پر چھائے ہوئے ہیں۔ اپنی تیرہ بختی کو حکام کے جور و استبداد سے تعبیر نہ کیجئے۔ ان کی زندگی صرف اسی وقت تک ہے جب تک آپ خائف ہیں۔ اس خوف کو دور کردیجئے۔ ان کا وجود باقی نہ رہے گا۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو تمام تاریکیاں بھاگ جاتی ہیں۔ اپنے سورج یعنی اپنی قوت کو خوف کے بادلوں میں نہ چھپائیے۔ اس کی تپش کو اپنی ناتوانی کی سردی سے ٹھنڈا نہ کیجئے.......... خوف! .... خدا معلوم آپ نے اس شیطان کو اپنے کاندھوں پر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ اپنی جھولی میں اس خوف کو مارنے والے جراثیم بھر لیجئے اور انہیں بکھیرتے جائیے۔ جب یہ ختم ہوجائیں تو مڑکر دیکھئے۔ آپ کا ہندوستان ایک نئی فضا میں سانس لیتا ہوگا۔ آپ کو ایک چھوٹی سی کھائی پھاندنا ہے۔ کود جائیے۔ اگر جھجکتے رہے تو ممکن ہے کہ زمانے کا ہاتھ اس کھائی کو اور بھی وسیع

کردے .... آپ سن رہے ہیں نا؟»

«جی ہاں»

«تو جائیے۔ اپنے سوئے ہوئے بھائیوں کو جھنجوڑئیے اور ان میں سے ہر ایک کو جگاکر کہئیے، خدا کی قسم تمہارے بازوؤں میں ہاتھیوں سے بھڑجانے کی قوت موجود ہے۔ تم لوگ اپنی طاقت سے غافل ہو۔ تمہارے پنجے سخت سے سخت لوہے کو مروڑ سکتے ہیں۔ کیا وہ چند کمزور اور نحیف آدمیوں کی گردنیں نہیں مروڑ سکتے؟ اُٹھو، ایک انگڑائی لو اور اپنے جسم سے تمام سستی کو پرے پھینک دو۔ پھر ان سے کہئیے کہ وہ اپنی چھاتیوں کی طرف دیکھیں۔ ان میں سالہا سال کا جمع شدہ عزم و خشم موجود ہے .... وہ یہ سن کر حیران ہوں گے۔ .... جائیے، اپنے سوئے ہوئے بھائیوں کو جنجھوڑئیے۔»

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور ایک سگریٹ سلگا کر اسے اپنے منہ میں دباتے ہوئے کہا «میں اب رخصت چاہتا ہوں۔ مجھے صبح کام پر جانا ہے۔ اچھا حلیم صاحب اجازت۔»

«ہاں، ہاں، .... کل پھر ملاقات ہوگی»، حلیم صاحب نے گہری نیند سے بیدار ہوئے انسان کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

میں نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور وہ چلا گیا۔

میں دوسرے روز ہی پشاور سے واپس آگیا۔ چند دنوں کے بعد وہاں چند سیاسی وجوہ کی بنا پر حکومت اور عوام کے تعلقات کشیدہ ہوگئے جس کا نتیجا یہ ہوا کہ وہاں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

ایک صبح جب میں نے غسل سے فارغ ہوکر تازہ اخبار اٹھایا تو

اس کے پہلے صفحہ پر یہ خبر جلی حروف کی تین چار سرخیوں کے نیچے درج تھی:

«پشاور: آج صبح فوجیوں کا ایک دستا آرمرڈ کار کے ساتھ شہر میں امن قائم کرنے کےلئے گشت لگا رہا تھا۔ ایک چوک پر اس دستے کی عوام کے گروہ سے مڈبھیڑ ہوگئی فوجیوں نے ہجوم کو منتشر کرنے کےلئے گولیاں برسائیں جس سے کئی آدمی زخمی ہوئے۔ اس اثنا میں جب کہ لوگ گولیوں کی زد سے بچنے کےلئے بھاگ رہےتھے ایک نوجوان اپنے ساتھیوں کی بزدلی پر اظہار نفرت کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کا رخ آرمرڈ کار کی طرف تھا۔ اس تک پہنچتےہوئے اس کے سینے میں کئی گولیاں لگیں مگر وہ زخمی چھاتی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بڑھا اور اس موٹر کے پٹرول ٹینک کو آگ لگادی۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوا۔ آرمرڈ کار بھک سے اُڑگئی اور نوجوان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ شہر کی فضا سخت مضطرب ہی۔ بیان کیا جاتا ہی کہ آرمرڈ کار کو آگ لگانے والے کا نام گل زماں خان تھا۔»

«گل زماں خان!»اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ مر چکا ہی مگر شاید اس کا آخری جنون ہمارے خوف کر دور کردے ـــــ شاید!

انقلاب

دُراج کی پرواز میں ہی شوکتِ شاہیں
حیرت میں ہی صیاد یہ شاہیں ہی کہ دراج
ہر قوم کے افکار میں پیدا ہی تلاطم
مشرق میں ہی فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

محروم (تلوک چند)

ہندی نوجوان سے

وطن جس کا ہو پابندالم، وہ شادماں کیوں ہو
قفس ہو آشیاں جس کا وہ بلبل نغمہ خواں کیوں ہو
غلاموں کا وطن تیرا وطن ای نوجواں کیوں ہو
جہاں آزاد ہی ہندوستاں تنگِ جہاں کیوں ہو

مٹانے کی اِسے کیا ٹھان لی چرخِ جفا جو نے؟
حمیت کا تقاضا ہی کہ ہو کچھ انسداد اس کا
خود آرائی، تن آسانی سے عقدا وا نہیں ہوگا

سدیشی، سادگی، پاکیزگی پر ہو عمل پیرا
جواں مردی وطن کی ہو رہی ہو آج کیوں رسوا
اِسے رسوا کیا آرائشِ رخسار و گیسو نے

احمق پھپھوندوی

حقیقی مجرم

یہ سچ ہی کہ ہندوستاں میں ابھی تک — نہ علم و ہنر ہی نہ عزم و عمل ہی
مگر یہ بھی سچ ہی کہ یہ سب تباہی — فقط آپ ہی کی توجہ کا پھل ہی

یہ سچ ہی کہ اہلِ وطن کے دلوں میں — نہ حبِ وطن ہی نہ جوش وفا ہی
مگر یہ بھی سچ ہو کہ یہ سب نتیجا — فقط آپ ہی کی عنایات کا ہی

یہ سچ ہی کہ ہندی جواں کی رگوں میں — حمیت رہی ہی نہ غیرت رہی ہی
مگر یہ بھی سچ ہی کہ اب تک یہ صورت — فقط آپ ہی کی بدولت رہی ہی

یہ سچ ہی کہ آپس میں ہندوستانی — ہر اک بات پر بے سبب لڑ رہے ہیں
مگر یہ بھی سچ ہی کہ یہ پیچ سارے — فقط آپ ہی کے سبب پڑ رہے ہیں

یہ سچ ہی کہ باہم دگر ملک بھر میں — رواداریاں ہیں نہ غم خواریاں ہیں
مگر یہ بھی سچ ہی کہ اصل اس کا باعث — فقط آپ ہی کی فسوں کاریاں ہیں

یہ سچ ہی کہ اپنی حماقت کے باعث — بہت جلد مٹ جائیں گے ہند والے
مگر یہ بھی سچ ہی کہ مٹنے سے پہلے — وہ کر دیں گے تم کو قضا کے حوالے

وفادارانِ ازلی کا پیام
شاہنشاہ ہندوستان کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہی ای عالم پناہ
ای غریبوں کے امیر، ای مفلسوں کے بادشاہ

ای گدا پیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار
بےزروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار

ای ہمارے عالموں کے حامیٔ دین مبیں
دور مید کے اولی الامر و امیرالمومنیں

ای رئیس پاک دل، ای شہریار نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجیے سلام

راس کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو
یوں ہی رسمِ تاج پوشی ہو مبارک آپ کو

دل کے دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتے نہیں
آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھل کے کہہ سکتے نہیں

لیکن اتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور
بند سے واقف کئے جاتے نہیں شاید حضور

آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں
تن پر اک دھجی نہیں ہی، پیٹ کو روٹی نہیں

تاج پوشی نے جو دی ہیں بھیک میں دو روٹیاں
شکریہ ان روٹیوں کا ای شہ گردوں نشاں

روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خدام نے
آسکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے

آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا
کھا بھی لیں گے آج گر ڈٹ کر تو کل کھائیں گے کیا

صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہی کام
کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہی اہتمام؟

آپ کے پرچم کے نیچے ہی جو قوم نامراد
کھائے جاتا ہی اسے خدام عالی کا عناد

معدہ محروم غذا ہی، کیسہ ہی محروم زر
آپ کے عمال نے لوٹا ہی ہم کو اس قدر

آپ کے فرق مبارک کو دیا ہی جس نے تاج
آج اس بھارت کا سر ہی اور تیغِ احتیاج

ہر جبیں پر ہی شکن اس کج کلاہی کی قسم
ہر مکاں اک مقبرا ہی قصر شاہی کی قسم

آپ کے سر پر ہی تاج ای فاتح روے زمیں
اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں

ہم وفا کیش آپ کی نظروں سے بھی گر جائیں گے
آپ بھی ہم سے خدا کی طرح کیا پھر جائیں گے

ہم سے باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات
صرف موسا بن کے فرعونوں سے ممکن ہو نجات

ہم تو موسا بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے
پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے

نوجواں بپھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں
ذرے ذرے سے عیاں آثار حرب و جنگ ہیں

کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب
کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

ہم وفاداران بیشیں، ہم غلامانِ کہن
قبر جن کی کھد چکی، تیار ہے جن کا کفن

تندرو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کی امنگوں کو دبا سکتے نہیں

مدح اب ڈر ڈر کے ہم کرتے ہیں یوں سرکار کی
جیسے کوئی دھار چھوتا ہو اپنی تلوار کی

نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی
صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی

آپ کے ایوان میں رقصاں ہیں لپٹیں عود کی
ہندیوں کے سانس سے آتی ہے بو بارود کی

چونکئے جلدی ہوائے تند و گرم آنے کو ہی
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہوجانے کو ہی

آنند نرائن ملا

انقلاب زندہ باد

شوق ہوا بے حجاب ختم ہوا دورِ خواب
آگیا روزِ حساب قوم کا چمکا شباب

زندہ باد انقلاب
انقلاب زندہ باد

فتنہ و شر تا بہ کے؟ دورِ قمر تا بہ کے؟
طاعتِ زر تا بہ کے؟ خونِ ہنر تا بہ کے؟

زیر وزبر تا بہ کے؟
انقلاب زندہ باد

کب تک اسیرِ محن کوہکنِ خستہ تن
خردِ پُر مکر و فن خندہ زن و کام زن

طرحِ جہاں بر فگن
انقلاب زندہ باد

دور ہو سب ایک بار تفرقۂ روزگار
مفلس و سرمایہ دار بندہ و با اختیار
کشمکش گیر و دار
انقلاب زندہ باد

توڑ پرانا نظام دائرۂ خاص و عام
بندشِ قوم و مقام دے یہ جہاں کو پیام
لے کے اخوت کا نام
انقلاب زندہ باد

پھر سے لگا اک چمن سرو و گل و یاسمن
قمریٔ شیریں دہن جب ہو وہاں نغمہ زن
گونجے فضائے وطن
انقلاب زندہ باد

ساغر نظامی

ترانۂ شباب

ای جوانو، نوجوانو توڑ دو بند زارِ غلامی
خوش جمالو، نونہالو پھینک دو سر سے بارِ غلامی
ای حسین و علی کے سپوتو ای محمد کے شہ زور بیٹو

نسل سے بادشاہوں کی تم ہو
پھر بھی ہو یادگارِ غلامی!
ای جوانو، نوجوانو

ابھیمنو کی اولاد تھے تم عہدِ ماضی کی روداد تھے تم
یاد ہو پہلے آزاد تھے تم؟
اب ہو اک یادگارِ غلامی
ای جوانو، نوجوانو

اس غلام آسماں کو اُلٹ دو ارضِ ہندوستاں کو اُلٹ دو
ہوسکے تو جہاں کو اُلٹ دو
کیوں ہو باقی دیارِ غلامی
ای جوانو، نوجوانو

ختم ہو دور بربادیوں کا وقت ہو عالم ایجادیوں کا
کردو اعلان آزادیوں کا
ہوچکا اشتہارِ غلامی
ای جوانو. نوجوانو

نغمے نغمے سے بیراگ برسے ہر طرف آتشیں راگ برسے
ہر طرف سے نئی آگ برسے
جل اُٹھے کاروبارِ غلامی
ای جوانو نوجوانو

ساغر نظامی

عہد

جب طلائی رنگ سکوں کو نچایا جائے گا جب مری غیرت کو دولت سے لڑایا جائیگا
جب رگِ افلاس کہ، میری دبایا جائے گا
ای وطن، اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
اور اپنے پاوں سے انبار زر ٹھکراؤں گا

جب مجھے پیڑوں سے عریاں کر کے باندھا جائیگا گرم آہن سے مرے ہونٹوں کو داغا جائیگا
جب دہکتی آگ پر مجھکو لٹایا جائے گا
ای وطن، اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر سو جاؤں گا

جب درِ زنداں کھلے گا برملا میرے لئے انتہائی جب مزا ہوگی روا میرے لئے
ہر نفس جب ہو گا پیغامِ قضا میرے لئے
ای وطن، اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
بادہ کش ہوں زہر کی تلخی سے کیوں گھبراؤں گا

حکم آخر قتل گہ میں جب سنایا جائے گا جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائیگا
جب یکایک تختۂ خونیں ہٹایا جائے گا
ای وطن، اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا

مطلبی فرید آبادی (سید)

جد و جہدِ آزادی کے تین دور

پہلا دور سنہ ۱۹۱۹ع لغایت ۱۹۲۱ع

۱

اک دو کیسے لاکھ ہزار　　کون کرے ان کا شمار
اُبل پڑے سگرے نرنار　　ایکا ہی ان کا ہتھیار
گھبرائی گوری سرکار　　بھارت جاگی، مچی پکار

۲

ہندو مسلم اور عیسائی　　سب کہویں ہم بھائی بھائی
جو توڑے اپنی اکتائی　　اس کو سمجھو نپٹ قصائی
کتا ہی اسے دو دھتکار　　بھارت جاگی، مچی پکار

۳

محمدعلی کے نعرے ہیں　　گاندھی کے جی کارے ہیں
پریم کے ابلے دھارے ہیں　　جھنجلائے ہتیارے ہیں
لے کر جھپٹے چھری کٹار　　بھارت جاگی، مچی پکار

٤

دیش لہو سے ہوتی ہولی　　شہر شہر میں چلتی گولی
پیتی لہو دھرتی ہو پولی　　بھارت ماں کی بھردی جھولی
گاؤں بچے نہ ہاٹ بزار　　بھارت جاگی، مچی پکار

۵

پھر پہنائے جھانجن کالے تھک گئے پر دشمن ہتیارے
ٹوٹن لاگے بندھن سارے نئے چاند کے کر دتن پیارے
گونجن لاگے من کے تار بھارت جاگی، مچی پکار

۶

گھبرائی گوری سرکار کتا ہی اُسے دو دھتکار
لے کر چھپئے چھری کٹار گاؤں بچے نہ ہاٹ بزار
گونجن لاگے من کے تار بھارت جاگی، مچی پکار
بھارت جاگی، مچی پکار

دوسرا دور سنہ ۱۹۳۰ع

۱

ہزار الجھنیں سہی ہزار کاوشیں سہی
ہزار دشت خار دار فلک کی گردشیں سہی
ہی وقت کی یہی صدا اٹھو. بڑھو، چلو، چلو

۲

یہ باہمی عداوتیں نہیں نہیں رقابتیں
یہ کشمکش ہی زندگی نہ سمجھو ان کو آفتیں
کہو نہ کچھ برا بھلا اٹھو، بڑھو، چلو، چلو

٣

اٹھا نہیں خمیر ابھی بنا نہیں ضمیر ابھی
رگوں کا خون سست سا تپا نہیں سریر ابھی
بڑھو تو طی ہی مرحلہ اٹھو، بڑھو چلو، چلو

٤

ہچر مچر ہی موت اب ٹھٹک کچک ہی موت اب
پلٹنا پیچھا دیکھنا ہر اک اٹک ہی موت اب
کٹھن ہو لاکھ راستا اٹھو، بڑھو، چلو، چلو

٥

قدم کو ہی قرار موت وفا سے ہی فرار موت
سکون اب فریب ہی ہی اس کا لالہ‌زار موت
نہ دیکھو اپنے نقشِ پا اٹھو، بڑھو، چلو، چلو

تیسرا دور دور حاضر

١

ہزار لاکھ ہوں ستم جھکیں گے کس طرح سے ہم
وہاں سے یاں تک آئے سفر ہو لاکھ بیش و کم
رکیں گے کس طرح سے ہم اٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

۲

نظر میں کُل جہان ہے   اور عزم نوجوان ہے
عجب ہے اپنی عاشقی   کہ ہند اپنی جان ہے
عزیز ہیں عرب عجم   اُٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

۳

صحیح اگر شعور ہو   تو غیب بھی حضور ہو
یہ وقت کی پکار ہے   ہر اختلاف دور ہو
یہ ہند پھر سے لے جنم   اُٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

٤

تمام جال توڑ کر   حماقتوں کو چھوڑ کر
حریفِ نابکار کی   کلائیاں مروڑ کر
بلند اپنے ہوں عَلم   اُٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

٥

ہزار لاکھ ہوں ستم   رکیں گے کس طرح سے ہم
عزیز ہیں عرب عجم   یہ ہند پھر سے لے جنم
بلند اپنے ہوں عَلم   اُٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

آہنگِ نو

ای جوانانِ وطن روح جواں ہی تو اُٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہی تو اُٹھو
خوفِ بےحرمتی و فکرِ زیاں ہی تو اُٹھو
پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہی تو اُٹھو
اُٹھو، نقارۂ افلاک بجادو اُٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگادو اُٹھ کر

رنگِ گل ہائے گلستانِ وطن تم سے ہی
شورشِ نعرۂ رندانِ وطن تم سے ہی
نشۂ نرگسِ خوبانِ وطن تم سے ہی
عفتِ ماہ جبینانِ وطن تم سے ہی
تم ہو غیرت کے امیں، تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں، احساس تمہیں ہی کہ نہیں

یہ درندے، یہ شرافت کے پرانے دشمن
تم کہ ہو حاملِ آداب و روایاتِ کہن
جادہ پیما کے لئے خضر ہو تم، یہ رہزن
تم ہو خرمن کے نگہبان، یہ برقِ خرمن
خطۂ پاک میں زنہار نہ آنے پائیں
آہی جائیں جو یہ زندہ تو نہ جانے پائیں

مرد و زن پیر و جواں ان کے مظالم کے شکار
خونِ معصوم میں ڈوبی ہوئی اِن کی تلوار
یہ قیامت کے ہوس ناک، غضب کے خوں‌خوار
اِن کے عصیاں کی نہ حد ہی نہ جرائم کا شمار

یہ ترحم سے نہ دیکھیں گے کسی کی جانب
اِن کی توپوں کے دہن کردو انھی کی جانب

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار دبادو اِن کو
یہ مٹادیں گے تمدن کو، مٹادو اِن کو
پھونک دو اِن کو، جھلس دو کہ جلادو اِن کو
شانِ شایانِ وطن ہو، یہ بتادو اِن کو

یاد ہی تم کو کن اِسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر، بھیم کی اولادیں ہو

مخدوم محی الدین

آزادیٔ وطن

کہو ہندوستاں کی جی
کہو ہندوستاں کی جی

قسم ہی خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہی خونِ دہقاں کی، قسم خونِ شہیداں کی

یہ ممکن ہی کہ دنیا کے سمندر خشک ہوجائیں
یہ ممکن ہی کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سوجائیں
جلانا چھوڑدیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہی
روانی ترک کردیں برق کے تارے یہ ممکن ہی
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمعِ آزادی کبھی گُل ہو نہیں سکتی

کہو ہندوستاں کی جی کہو ہندوستاں کی جی

وہ ہندی نوجواں یعنی علم بردارِ آزادی
وطن کا پاسباں، وہ تیغِ جوہر دارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارا بجلیوں نے جس کو دھویا ہی
وہ انگارا کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہی
وہ شمعِ زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہی
اِک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہی
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ براندام رہتی ہی
وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہی
چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

کہو ہندوستاں کی جی
کہو ہندوستاں کی جی

سلام مچھلی شہری

مجبوریاں

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن
ابھی ان کو غلام آباد میں، میں گا نہیں سکتا

مجھے نفرت نہیں ہے حسنِ جنت زار سے لیکن
ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا

مجھے نفرت نہیں پازیب کی جھنکار سے لیکن
ابھی تابِ نشاطِ رقصِ محفل لا نہیں سکتا

ابھی ہندوستاں کو آتشیں نغمے سنانے دو
ابھی چنگاریوں سے اک گلِ رنگیں بنانے دو

اختر (سیدہ)

وطن کا سپاہی

بہ صد ناز و تمکیں، بہ صد کج کلاہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

وطن جس کا ایماں، وطن جس کا پیارا وطن کے مقدر کا روشن ستارا
جواں بازوؤں پر ردا پارا پارا جبیں سے نمایاں مگر نور شاہی

وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

وہ تھرا اُٹھی ظلم و طاقت کی دنیا وہ گھبرا اُٹھی کبر و نخوت کی دنیا
وہ گرما اُٹھی عزم و ہمت کی دنیا وہ لہرا اُٹھا پرچم بے گناہی

وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

نہ رتبے کی خواہش، نہ شہرت کا طالب نہ زر کی تمنا نہ دولت کا طالب
محبت کا بندا، محبت کا طالب ز سر تا قدم مژدۂ خیرخواہی

وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

ہر اندیشہ رخصت، ہر اندیشہ باطل خوشا عزم راسخ، زہے شوقِ کامل
تصدق ہر اک گامِ ہمت پہ منزل سلامت یہ رہرو، مبارک یہ راہی

وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

عزائم کی تصویر، ہمت کا پیکر نظر جوہرِ تیغ کے آئینے پر
ہر اہلِ وطن کو مبارک ہو اختر وطن کی محبت کی زندہ گواہی

وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

اُمّ بزجیس

نغمۂ بیداری

ہشیار ہو ای اربابِ وطن بیدار ہو ای اربابِ وطن
ظلمت کا گریباں چاک ہی پھر
دامانِ شجر نمناک ہی پھر
اب شعلہ نفس ادراک ہی پھر

ہشیار ہو ای اربابِ وطن بیدار ہو ای اربابِ وطن

اب جام و صبو کا ہوش کہاں
دل میں وہ مئے سرجوش کہاں
ساقی وہ کہاں، مے نوش کہاں

ہشیار ہو ای اربابِ وطن بیدار ہو ای اربابِ وطن

یہ ابر ہی یا آہوں کا دھواں
یہ برق ہی یا شمشیرِ رواں
برہم ہی فضائے کون و مکاں

ہشیار ہو ای اربابِ وطن بیدار ہو ای اربابِ وطن

دیکھو یہ چمن برباد نہ ہو
پامالِ غمِ بیداد نہ ہو
پھر چرخِ ستم ایجاد نہ ہو

ہشیار ہو ای اربابِ وطن بیدار ہو ای اربابِ وطن

یہ جنگ کی خونیں تدبیریں
یہ جبر و ہوس کی تعزیریں
ڈوبی ہیں لہو میں شمشیریں

ہشیار ہو ای اربابِ وطن بیدار ہو ای اربابِ وطن

لیکن یہ زمانہ بدلے گا
اک دن یہ فسانہ بدلے گا
خوں ریز ترانہ بدلے گا

ہشیار ہو ای اربابِ وطن بیدار ہو ای اربابِ وطن

الطاف مشہدی

وطن آزاد کرنے کے لئے

ہند کا اُجڑا چمن آباد کرنے کے لئے
درد کے مارے ہوؤں کو شاد کرنے کے لئے
اک نیا عہدِ جہاں آباد کرنے کے لئے

قصرِ استبداد کو برباد کرنے کے لئے
جھوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

صفحۂ ہستی سے باطل کو مٹانے کے لئے
خرمن اعدا پہ اب بجلی گرانے کے لئے
اہلِ زر کی بے کسی پر مسکرانے کے لئے

یعنی ارواحِ سلف کو شاد کرنے کے لئے
جھوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

پھر سے بھڑکاؤ دلوں میں غیرتوں کی آگ کو
رزم کی جانب بڑھاؤ جراتوں کی باگ کو
پاؤں کے نیچے کچل دو سیم و زر کے ناگ کو

زندگانی کو سراپا شاد کرنے کے لئے
جھوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

مستیٔ صہبائے آزادی سے لہراتے چلو
ابر کی صورت بلند و پست پر چھاتے چلو
قہقہوں سے لیلیٔ مغرب کو شرماتے چلو

پھر دیارِ ہند کو آباد کرنے کے لئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

ظفر علی خاں

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ع

صدر اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام
لیکن ان سے پوچھتے ہیں ہم کہ ہم کو کیا دیا

کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لئے
اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا

اپنے پینے کے لئے شمپین بھر لی جام میں
ہند کے رندان دور آشام کو ٹھرا دیا

میوہ خوری کے لئے چننے لگے جب گول میز
رکھ لیا خود مغز چھلکوں پر ہمیں ٹرخا دیا

آئینِ جدید

ہند کے سر پر مسلط ہوگیا آئینِ نو
مکر و استبداد کی چوٹی سے فرما کر نزول

مغربی کاغذ تراشوں نے کم و بیش اک صدی
صرف کی ہی تب بنا پایا ہی یہ خوش رنگ پھول

یہ وہ نسخہ ہی جو بیمارِ توانا کے لئے
رہنمائی کرسکے گا تا بہ سرحد ذہول

یہ وہ چشمہ ہی جس کے سامنے آبِ فرات
اپنی خست اہلِ حق کے واسطے جائے گا بھول

جان بُل صاحب ہیں کتنے شکریے کے مستحق
دے دیا ہندوستانی وحشیوں کو ہوم رول

ان کا فرمانا اگر سچ ہی تو سچ کہتے ہیں وہ
یہ وہ نعمت ہی بہت دشوار تھا جس کا حصول

ہی حکومت کی یہ فیاضی بہت ہی شاندار
اس رعایا پروری پر دنگ ہی عقل مغول

ان کو حیرت ہی کہ اتنی خوبیوں کے باوجود
ملک والے کس لئے ہیں اس کے اجرا سے ملول

کس لئے دھرتے ہیں اس کے نام سے کانوں پہ ہاتھ
کیوں نہیں کرتے بلا چون و چرا اس کو قبول

خیر مقدم ہی کہیں اس کا سیہ پرچم کے ساتھ
ہی کہیں ہڑتال کی صورت میں اظہارِ عدول

ہی کہیں جلسوں میں پاس اس کے لئے لعنت کا ووٹ
ہی جلوسوں میں کسی جا اس کے سر پر خاک دھول

کوئی دیتا ہی اسے تشبیہ خارستان سے
کوئی کہتا ہی اسے باغِ سیاست کا ببول

میں یہ کہتا ہوں یہ سب ہنگامۂ بحث و نزاع
دیکھئے چشمِ حقیقت سے تو ہی بالکل فضول

ملک والوں سے حکومت کی ہی یہ اک دل لگی
آج اس کو حق بنی ہی اس کا کہ ہی ''اپریل فول''

جوش ملیح آبادی

وفاق

اس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نویدِ گل — اک بے پناہ چوک ہی، اک سخت بھول ہی
یہ بوستاں، یہ اہلِ سیاست کی شاخِ گل — شیطاں کے پاس باغ کی سوکھی ببول ہی
یہ ہی نیا نکاح کہ دولہا تو ہی خموش — قاضی یہ کہہ رہا ہی کہ جی سے قبول ہی
ہشیار اہلِ ہند کہ پھر اس زمین پر — گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہی
کہتے ہیں جس کو دولت بیدار اہلِ غرب — وہ اک متاعِ کاسۂ جنسِ فضول ہی

نادان اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہی

۲- دوسری جنگِ عظیم

[ستمبر ۱۹۳۹ع میں ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کیا۔ فرانس اور انگلستان نے اس کی حمایت میں جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اور بھی کئی ملک ایک دوسرے کی مدد کے لئے اس جنگ میں شریک ہوتے گئے۔ ہندوستان میں اس وقت کانگرس اور مسلم لیگ کی وزارتیں حکومت کررہی تھیں۔ وائسرائے نے مجلس قانون ساز سے مشورہ کئے بغیر یہ اعلان کردیا کہ ہندوستان بھی جنگ میں شریک ہوگا۔ یہ بات دستور کے خلاف تھی اس لئے کانگریسی وزارتوں نے احتجاجاً استعفا دے دیا۔ حکومت نے جنگ سے متعلق تحریر و تقریر پر پابندی لگادی۔ کانگرس نے اس قانون کو ماننے سے انکار کردیا اور اس کی خلاف ورزی کی۔ نتیجا یہ ہوا کہ تمام بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کرکے قید کردیا گیا۔ ادھر یورپ میں ہٹلر کا جو قدم اُٹھتا تھا وہ کامیاب ہوتا تھا اور برطانوی حکومت کے پرخچے اُڑتے ہوئے نظر آرہے تھے اس لئے وائسرائے نے اعلان کیا کہ جنگ ختم ہوجانے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہوگا ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دیا جائے گا۔ پھر جب حالات اور بگڑے تو کرپس مشن بھیجا گیا اور اس بات کا وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے خاتمہ پر ہندوستان کو آزادی دی جائے گی۔ اس موقع پر گرفتار شدہ لیڈروں کو رہا کردیا گیا۔]

صاف اور سادا سوال

غالباً کانگرس کی تاریخ میں اس کے ذہنی نقشے کا ایک نیا رنگ تھا کہ سنہ ۱۹۳۶ع کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین‌الاقوامی (انٹرنیشنل) صورت حال پر ایک لمبی تجویز منظور کرکے اس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کردیا اور اس کے بعد سے وہ کانگرس کے سالانہ اعلان کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلا تھا جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعہ ہم نے دنیا کے سامنے ایک وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا۔ سب سے پہلی بات جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہی ہمارا یہ احساس ہی کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری میں بھی دنیا کی سیاسی صورتِ حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہی کہ اپنے مستقبل کی راہ بتاتے ہوئے ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی نظر رکھیں۔ زمانے کی بےشمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کردیا ہی اور فکروعمل کی لہریں ایک گوشے میں اُبھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کردیتی ہیں کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چاردیواریوں کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہی کہ باہر کے حالات ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں اور ناگزیر ہی کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا جس نے اس فیصلے کی شکل اختیار کی۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کردیا کہ یورپ میں جمہوریت

اور قومی آزادی کے خلاف فاشیزم اور نازی‌زم کی جو ارتجاعی (ری‌ایکشنری) (Reeationary) تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں ہندوستان اسے دنیا کی ترقی اور امن کے لئے ایک عالم‌گیر خطرا تصور کرتا ہی اور اس کا دل و دماغ ان قوموں کے ساتھ ہی جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلا کررہی ہیں۔

لیکن جب فاشی‌زم‌اور نازی زم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جارہا تھا تو ہمارے لئے ناممکن تھا کہ ہم اپنے پرانے خطرے کو بھلادیتے جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لئے مہلک ثابت ہوچکا ہی اور جس نے فی‌الحقیقت ان نئی ارتجاعی تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہی۔ میرا اشارا برطانیا کی سامراجی قوت کی طرف ہی۔ اسے ہم نئی ارتجاعی قوموں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ یہ خود ہمارے گھر پر قبضا جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہی۔ اس‌لئے ہم‌نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات کھول‌دی کہ اگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کرلی تو ہندوستان جو اپنے آزاد ارادے اور آزاد پسندی سے محروم کردیا گیاہی اس میں حصہ لینے سے قاصر رہے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصہ لےسکتا ہی جب کہ اسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلا کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نازی زم اور فاشی زم سے بےزار ہی۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی خصوصیتوں کے ساتھ موجود ہی اور ہندوستان کسی حالت میں تیار نہیں کہ ایسی حالت میں برطانوی شہنشاہی کی فتح‌مندیوں کے‌لئے مدد کرے۔

. . . .

۳ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ع کو لڑائی کا اعلان ہوا اور ۷ ستمبر کو آل انڈیا کانگرس

ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی تاکہ صورتِ حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقع پر کیا کیا؟ کانگرس کے وہ تمام اعلان اس کے سامنے تھے جو سنہ ۳۶ع سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ یقیناً اسے ملامت نہیں کیا جاسکتا اگر وہ کوئی اور فیصلا کردیتی جو اس صورت حال کا منطقی نتیجا تھا۔ لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کرکے وہ قدم اُٹھایا جسے آج ہندوستان سر اُٹھاکر کہہ سکتا ہی کہ اس صورتِ حال میں اس کے لئے وہی ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کردئے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلا دنیا کے سامنے رکھ دے جس پر نہ صرف ہندوستان کا بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلا موقوف ہی۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہی تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہئیے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جارہی ہی؟ اس کا مقصد کیا ہی؟ اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی (ٹریجڈی) کا بھی وہی نتیجا نکلنے والا نہیں ہی جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہی اور یہ واقعی اس لئے لڑی جارہی ہی کہ آزادی، جمہوریت اور امن کے لئے نظم (order) سے دنیا کو آشنا کیاجائے تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبے کا حق حاصل ہی کہ وہ معلوم کرے کہ خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا۔

ورکنگ کمیٹی کے اس مطالبے کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا گیا اور ۱۴ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ع کو یہ شائع ہوگیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لئے ایک مناسب جگہ کا مطالبے کرے گا تو مجھے یقین ہی کہ میں آنے والے مؤرخ سے کوئی بے جا توقع نہیں کررہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت کا ایک سادا مگر ناقابل رد نوشتہ ہی

جس کو صرف مسلح طاقت کا بے پرواہ گھمنڈ ہی رد کرسکتا ہی۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اُٹھی لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی۔ یہ عالم گیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ چکی ہیں مبتلا کی گئی اور صرف اس لئے مبتلا کی گئی تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے۔ کم زور قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت، خود اختیاری فیصلا، ہتھیاروں کی حد بندی، بین الاقوامی پنچایت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوش نما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں جگائی گئیں۔ مگر بالآخر کیا نتیجا نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی۔ ہر جلوا خواب و خیال ثابت ہوا۔ آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں ڈھکیلا جارہا ہی۔ کیا معقولیت اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہونا چاہئیے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کرسکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہی؟ اور ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

....

...... ہم نے جب اعلان جنگ کے بعد یہ سوال اُٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہی اور ہندوستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہی تو ہم اس بات سے بےخبر نہ تھے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی سنہ ۱۷ء اور ۱۹ء میں کیا رہ چکی ہی۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ سنہ ۳۹ء کی اس دنیا میں جو دنوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہی ہندوستان کو

برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہی۔ اس کی جگہ اب بھی بدلی ہی یا نہیں؟ ہم جانتے تھے کہ ہمیں صاف جواب ملے گا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی اپنے سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکی ہی۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہی کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہش مند ہی۔ مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہی۔ صاف اور سادا سوال ہندوستان کے حق کا ہی۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہی یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلا کرے؟ اس سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوال کا جواب موقوف ہی۔ ہندوستان کے لئے یہ سوال بنیاد کی اصل اینٹ ہی۔ وہ اسے نہیں ہلنے دے گا۔ اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہی ہمارے لئے صورت حال بالکل واضح ہوگئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرا اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتح مندیوں کے لئے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقصد بالکل صاف ہی۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لئے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتح مند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جاری ہی۔

احمد عباس (خواجہ)

ایک پائلی چاول

ناگنوں کی طرح بل کھاتی، چیونٹیوں کی رفتار سے رینگتی، شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح بھن بھناتی، دو لمبی قطاریں، ایک مردوں اور ایک عورتوں کی، سرکاری اناج کی دوکان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ عورتوں کی قطار مردوں کی قطار سے بھی زیادہ لمبی۔ کوئی ایک فرلانگ لمبی۔ اس کا آخری سرا سڑک کے نکڑ پر سے مڑتا ہوا ایک تنگ سی گلی میں پہنچا ہوا تھا۔ دیر سے آنے والی عورتیں ایک کے پیچھے ایک کھڑی ہوتی جارہی تھیں۔ ان کو تو اناج کی دور سے جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی۔ بس کچھ نظر آتا تھا تو اپنے سے اگلی عورت کا سر۔

کئی سو عورتیں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھے ہوئے اور بغیر برقعے کے، کالے چکنے جسم والی مچھلی والیاں جن کے بالوں کے پھولوں کی خوشبو ان کے کپڑوں کی مچھلی کی بو میں مل کر ہوا میں پھیل رہی تھی۔ فراک پہنے ہوئے ننگی ٹانگوں، پاؤں میں چپل، غریب دیسی عیسائی گوانی عورتیں گھٹیا قسم کے پینٹ اور پاوڈر اور سینٹ میں نہائی ہوئی نقلی سالک کی جرابیں اور اونچی ایڑی کے جوتے پہنے اینگلو انڈین لڑکیاں، پھولدار ریشمی شالیں کاندھوں پر ڈالے گوری چٹی کالے بالوں والی یہودنیں، سڈول جسم کی مرہٹن اور بہت دبلی یا بہت موٹی گجراتنیں، کلارکوں کی بیویاں، مزدوروں کی بیویاں، معمولی درجہ کے دوکان داروں کی بیویاں، ٹیکسی ڈرائیوروں کی بیویاں، شادی شدہ بیویاں، غیر شادی شدہ بیویاں، موتیا کی کلیاں اور مرجھائے ہوئے پھول، سنٹ اور پسینا، مچھلی اور ناریل کے تیل کی بُو اور دوپہر کی دھوپ میں ان مختلف خوشبوؤں

اور بدبوؤں کے ملے ہوئے ابخرات اوپر کو اٹھتے ہوئے، مرہٹی اور گجراتی اور ہندوستانی اور انگریزی زبانوں میں گفتگو کا ایک ناقابل فہم شور، کئی لاکھ شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ، انتظار، ساٹھ سکنڈوں کا ایک منٹ اور ساٹھ منٹوں کا ایک گھنٹا، ایک گھنٹا، دو گھنٹے، تین گھنٹے، اور ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی چیونٹیوں کی رفتار سے رینگتی عورتوں کی یہ لمبی قطار لحظہ بہ لحظہ بڑھتی رہی۔ جتنی دیر میں اگلے سرے پر ایک عورت اناج لےکر رخصت ہوتی تھی، دو نئی عورتیں پیچھے آکر شامل ہوجاتی تھیں۔ دو سو عورتیں، ڈھائی سو عورتیں، تین سو عورتیں، ساڑھے تین سو عورتیں کھڑی ہوجاتیں۔ صبر اور خلوص اور عقیدت کا ایک عجیب نظارا! جیسے پجارنیں مندر کے دروازے کھلنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک نیا شوالا جہاں ہندو اور مسلمان، پارسنیں اور یہودنیں سب پوجا کےلئے آئی تھیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تھیلا، ہر ایک کے دماغ میں بس ایک خیال، ایک آرزو، ایک ہوس، ایک پائلی چاول۔

درگا آئی اور عورتوں کی قطار کے آخری سرے پر سب سے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ اس کو اج یہاں آنے میں دیر ہوگئی تھی۔ صبح سے اس کے سر میں، جسم میں اور پیٹ میں بڑا شدید درد ہورہا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ آج یہاں گھنٹوں کے لئے آکر کھڑی ہوتی، مگر مجبوری تھی۔ گھر میں چاول کے آخری چند دانے ختم ہوچکے تھے۔ دو وقت بازار کا کھانا کھایا۔ آج کئی دن کے بعد دکان کھلی تھی۔ اگر اس نے چاول نہ خریدے تو معلوم نہیں پھر کب تک گھر کا کھانا نصیب ہو اور اس عرصے میں اگر کہیں دن پورے ہوگئے اور وہ وقت آگیا جس کا انتظار تھا تو پھر اور بھی مشکل ہوجائے گی۔

درگا کا شوہر ایک کارخانے میں کام کرتا ہے۔ صبح کو گھر سے نکلتا تو کبھی چراغ جلے واپس آتا۔ وہ بھی دن بھر مشین کی طرح کام کرتا۔

تھکا ماندا۔ بازار کا سودا سلف سب درگا ہی کو لانا پڑتا تھا۔ وہ مزدوری پیشہ عورت ٹھہری۔ اس کو کام کرنے میں نہ عار تھا اور نہ کوئی دقت۔ وہ جب تک اپنے ماں باپ کے پاس گاؤں میں رہتی تھی کھیتی کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ چرخا کاتتی، چکی چلاتی، اپنے باپ، بھائی کے لئے روٹی پکا کر کھیت پر لے جاتی، گائے بیلوں کے لئے کٹی کاٹتی، دودھ دوہتی، رات کو سونے سے پیشتر ان کو لا کر باندھتی ۰۰۰۰۰۰ بیاہ کے بعد جب سے شہر آئی تھی اپنے نندو کی طرح وہ بھی کارخانے میں کام کرتی تھی۔ دس گھنٹے روزانہ وہاں کام کرتی۔ پھر گھر آکر چولھا پھونکتی۔ مگر اس کو کبھی یہ خیال نہ گذرا تھا کہ وہ بہت محنت کرتی ہی۔ اپنے نندو کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔ اس کا نندو کتنا اچھا تھا۔ اس نے بمبئی لاکر درگا کو کتنی سیریں کرائی تھیں۔ چڑیا گھر، چوپاٹی، اپالوبندر۔ کئی دفعہ سینما لے گیا۔ ایسی چیزیں درگا نے اپنے گاؤں میں کاہے کو دیکھی تھیں۔ نندو اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اور مزدوروں کی طرح نہ وہ شراب پی کر آتا تھا نہ اپنی بیوی کو پیٹتا تھا۔ اور ابھی چھٹا مہینا پورا نہیں ہوا تھا کہ اس نے درگا کا کارخانے جانا بند کردیا۔ «اب تجھے گھر میں آرام کرنا چاہئے۔ اب تو میرے لونڈے کی ماں بننے والی ہی نا۔» نندو نے ہنس کر کہا تھا۔ "دیکھ لونڈا لوں گا۔ مجھے لونڈیا نہیں چاہئے۔"

ناگن کی طرح بل کھاتی. چیونٹیوں کی رفتار سے رینگتی، عورتوں کی لمبی قطار اناج کی دوکان کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ اب درگا کے پیچھے بھی آٹھ دس عورتیں قطار میں آملی تھیں۔ کہیں کہیں آپس میں مباحثے ہورہے تھے۔ ایک پارسن بازار کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر مبسوط تبصرا کررہی تھی۔ ایک خوجن اناج کی کمی کا الزام کانگرس کے سر رکھ رہی تھی۔ ایک عیسائی عورت کا خیال تھا کہ یہ سب گاندھی کا قصور ہی۔ نہ سرکار سے لڑائی مول لیتے نہ سرکار

ہندوستانیوں کو سزا دینے کےلئے اناج پر پابندیاں لگاتی۔

« کانگرس اور مہاتماگاندھی کو کیوں دوش دیتی ہو۔ معلوم نہیں ہی گورنمنٹ نے لاکھوں من گیہوں ایران، عراق اور مصر بھیج دیا ہی۔ » ایک گجراتن بولی۔

« ہاں، گورنمنٹ نے اناج باہر بھیج دیا ہی۔ » ایک مرہٹن چمک کر بولی۔ مگر ہم ہندوستانی کب بےقصور ہیں۔ بنیوں اور آڑھتیوں نے گھروں میں کچھ کم اناج بھر رکھا ہی۔ اور کیا۔ ہم ایک پائلی چاول کےلئے پانچ پانچ اور چھی چھی گھنٹے دھوپ میں کھڑے رہتے ہیں اور یہ بنئے ہیں کہ ہزاروں من اناج چھپا کر رکھا ہی اور چوی سے دوگنی تگنی قیمتوں پر بیچ رہے ہیں۔ »

«ایسے لوگوں کو پھانسی دےدینی چاہئے۔»

« وہ دوسرے ملکوں میں ہوتا ہی۔ ہمارے ہاں تو ان کو رائے بہادر اور خان بہادر کے خطاب ملتے ہیں۔ جنگی کاموں کے ٹھیکے دئے جاتے ہیں۔ یہ ہندوستان ہی۔»

. . . .

کتنی دیر ہوگئی تھی اس کو کھڑے کھڑے۔ درگا نے مڑکر دیکھا کوئی سولہ سترہ عورتیں اس کے پیچھے تھیں۔ اب وہ قطار کے ساتھ بڑھتے بڑھتے سڑک کے نکڑ پر آگئی تھی۔ گردن ٹیڑھی کرکے وہ اناج کی دوکان کا لال لال سائن بورڈ بھی دیکھ سکتی تھی۔ مگر اب بھی کم سے کم سو عورتیں اس کے اور ایک پائلی چاول کے درمیان حائل تھیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ دوکاندار اتنی دیر لگاتا ہی۔ درگا نے ایک تھکی ہوئی ٹانگ سے دوسری تھکی ہوئی ٹانگ پر بوجھ بدلتے ہوئے سوچا۔ اور عورتیں بولتے بولتے تھک گئی تھیں اور گرمی اور خاموشی نے پوری قطار کو اپنے پنجے میں دبوچ لیا تھا۔ نیلی وردی پہنے پُلیس کا ایک سپاہی سامنے درخت کے نیچے اونگھ رہا تھا۔ اس کو اونگھتے دیکھ کر درگا کی تمام تھکن، اس کی ٹانگوں کا درد، پیٹ کی چبھن سب اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اس کا جی چاہا وہیں سڑک کی پٹری پر سر رکھ کر لیٹ جائے۔

اس کے قدم ڈگمگائے تو اس نے اپنی سے اگلی عورت کا سہارا لے لیا۔ «ارے میری بہن، ذرا اپنے ہی سہارے کھڑی رہو۔» کوئی بڑھیا عورت تھی۔ اس کی آواز میں کوئی غصہ یا جلن نہیں تھی۔ مگر درگا شرمندہ ہوکر گھبرا سی گئی۔ بےخیال پیچھے ہٹی تو اس دفعہ سخت ڈانٹ پڑی .... «اندھی ہی؟ میرا پاؤں کچل دیا۔» یہ عورت جب درگا سے بچنے کےلئے بے اختیار پیچھے ہٹی تو قطار کے آخر تک گالیوں اور کوسنوں کا کئی مختلف زبانوں میں شور بلند ہوتا گیا۔

درگا شرمندگی سے پانی پانی ہوگئی۔ اس نے دانت کچکچا کر اپنے بدن کو قابو میں کیا اور زمین میں نظریں گاڑ دیں۔ ایک دفعہ اس کا جی چاہا کہ ایک پائلی چاول کی اُمید چھوڑ کر بھاگ جائے۔ مگر پھر سوچا کہ نندو شام کو تھکا ہارا آئے گا تو کیا کھائے گا؟ اس کا اچھا نندو جو اس کی خاطر کئی کئی گھنٹے روزانہ اوورٹائم کام کرتا ہی۔ اور اب تو وہ دکان کے قریب ہی آگئی تھی۔ اگر کسی نہ کسی طرح ایک آدھ گھنٹا اور گزر جائے تو پھر وہ چاول لے کر ہی گھر جائے گی۔ مگر یہ پیٹ میں اتنا درد کیوں ہورہا ہی جیسے کوئی آدمی چلا رہا ہو۔ درگا تکلیف کے مارے پسینوں میں نہارہی تھی۔ اس کا سر چکرارہا تھا اور پیٹ کے اندر درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ کرب و اذیت کا جوار بھاٹا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دشمن بھالا لئے بار بار حملہ کررہا ہی۔ ایک وار کا زخم نہیں بھرتا کہ دوسرا وار کرتا ہی۔ کیا دن پورے ہوگئے ہیں؟ کیا وہ دن آگیا ہی جس کا وہ اتنے دنوں سے انتظار کررہی تھی؟ نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہی۔ ابھی تین ہی دن تو ہوئے، دائی نے کہا تھا کہ دس پندرہ دن اور لگیں گے۔ شاید یہ کوئی اور قسم کا درد ہی۔ درد اور تکلیف کے اس طوفان میں درگا نہ جانے کس طرح پوری قطار کے ساتھ آپ سے آپ دکان کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اب صرف ایک عورت اس کے سامنے تھی۔ جب یہ عورت بھی دکان کے اندر چلی گئی تو

درگا نے دیکھا کہ اس کو بھی سیڑھی پر چڑھ کر جانا ہوگا ۔ ایک ایک فٹ کی دو سیڑھیاں اس کو ایسی معلوم ہوئیں جیسے اس کے گاؤں کا مندر والا ٹیلا جس کی چوٹی پر جانے کے لئے سو سے زیادہ سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے ۔ ہے بھگوان! وہ اس ڈگمگاتی ہوئی لکڑی کی سیڑھی پر کیسے جاسکتی ہے ؟

اس سے اگلی عورت تھیلے میں ایک پائلی چاول لئے ، مسکراتی، پسینا پونچھتی دکان سے باہر نکل آئی ۔ درگا کے پیچھے والی عورت نے اسے ٹھوکا دیا۔ " چل بابا چل۔ کیا سورہی ہے؟ " بنئے نے بھی درگا کی طرف دیکھا اور کہا " آبائی، کیوں دیر لگا رکھی ہے ؟ " مگر اس نے یہ نہ دیکھا کہ درگا کی رنگت پیلی پڑتی جارہی ہے ۔ اس کی ٹانگیں سیڑھی پر چڑھنے کے خیال سے ہی ڈگمگا رہی تھیں ۔

" مجھ سے ..... مجھ سے ..... مجھے یہیں دے دو بھائی ۔ " اس کے ہونٹ بھی سوکھے ہوئے تھے ۔ آواز بھی مشکل سے نکلی ۔

" تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ لینا ہے تو اندر آکر لو ۔ "

" چلتی کیوں نہیں آخر ؟ "

" نہیں لینا ہے تو راستا چھوڑو۔ دوسروں کو جگہ دو ۔ "

ہر قدم پر درگا یہی سمجھتی رہی کہ وہ چکرا کر گر پڑے گی ۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے جسم کو گھسیٹ کر دکان کے اندر پہنچا دیا ۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھیلا بنئے کی طرف بڑھاکر اس نے دام سامنے رکھ دئے جو چار گھنٹے سے وہ اپنی مٹھی میں لئے ہوئے تھی اور جو پسینے سے گیلے ہورہے تھے ۔ دکان‌دار نے پائلی کا پیمانا اُٹھایا اور اس کو چاول سے بھر کر

درگا کے تھیلے میں ڈال دیا ۔ پھر درگا نے دیکھا کہ وہ موٹا بنیا آپ سے آپ گھوم رہا ہے ۔ پائلی کا برتن بھی، یہ چاول کا تھیلا۔ بھی پوری دکان گھوم رہی ہے اور گھومتے گھومتے پوری دکان، اناج کی بوریاں، گھی کے پیپے، دیوار پر لٹکی ہوئی ہنومان کی تصویر درگا سے ٹکرائی اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی ۔

اس نے دیکھا کہ وہ چاولوں کے ایک ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی پڑی ہے ۔ اس کا سانس گھٹا جارہا ہے مگر اس کے اوپر سے چاول آپ ہی آپ ہٹتے گئے ۔ ہنومان جی ان چاولوں کو پائلی کے برتن میں بھر بھر کر سب عورتوں کو بانٹ رہے ہیں۔ ” یہ لو ایک پائلی چاول، یہ لو ایک پائلی چاول “ اور ہنومان جی کی دُم خوشی سے ناچ رہی ہے ۔ مگر دُم نہیں یہ تو ایک ناگن ہے اور اس کا منہ اس عورت کی طرح ہے جس نے درگا کو گالی دی تھی۔ اور دم بھر میں ناگن پھولتی گئی اور بڑھتی گئی اور دکان سے لے کر بل کھاتی ہوئی نکڑوالی گلی تک جا پہنچی ۔ پھنکاریں مارتی ہوئی اب وہ درگا کی طرف بڑھتی ہوئی آرہی تھی ۔ کوئی دم بھر میں اس کو ہڑپ کرجائے گی ۔ ناگن نے اوپر کا سانس لیا اور درگا کھنچتی ہوئی اس کے پیٹ میں چلی گئی ۔

مگر یہ ناگن کا پیٹ نہیں تھا بلکہ ایک اندھیرا کمرا تھا ۔ اندھیرا اور گرمی، ہوا بند۔ درگا کا دم گھٹنے لگا ۔ اندھیرے کی تہ میں سے کسی کی آواز آئی ” یہ ہندوستان ہے ہندوستان “

. . . .

اور اب اس کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ننگی پڑی ہے ۔ ننگی، مادر زاد ننگی۔ درگا شرم کے مارے گڑ گئی۔ مگر وہ اُٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک ہیبت ناک دیو آیا اور ایک بہت بڑے آرے سے اس کا پیٹ کاٹنے لگا ۔ مگر جب اس کو

قریب سے دیکھا تو درگا کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ یہ خود اس کا شوہر نندو تھا۔ خوشی خوشی وہ اس کا پیٹ کاٹ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا "لونڈا لوں گا لونڈا۔ مجھے لونڈیا نہیں چاہئے۔" اور چاروں طرف لوگ جمع ہوگئے اور درگا کو اس حالت میں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا "یہ ہندوستان ہی ہندوستان" تو اس پر وہ موٹی گجراتن بولی "گاندھی جی کو کیوں دوش دیتی ہو۔ ان کو تو خود انگریز بھوکا مار رہے ہیں۔۔۔۔۔۔"

سب لوگ غائب ہوگئے ہیں۔ اب درگا نے دیکھا کہ وہ موٹی ہوگئی ہے۔ اس بنئے سے بھی زیادہ موٹی۔ اور اس کے توند نکل آئی ہے، ایک مٹکے کے برابر۔ اور پھر کسی نے اس کی توند میں ایک سُوا گھسادیا اور اس میں سے خون نکلنے لگا اور اتنا نکلا کہ اس کے تمام کپڑے اور جسم خون میں لت پت ہوگئے اور اس کا پیٹ پچک کر کمر سے لگ گیا۔ کہیں دور کوئی درگا کے دماغ کے دروازے کو کھٹکھٹا رہا تھا۔ کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے اور بے ہوشی کے بادلوں میں سے دکان گھومتی گھومتی نکل رہی تھی۔ گھومتے گھومتے۔۔۔۔۔ آہستا آہستا دکان ٹھہر گئی۔ سامنے ہنومان جی کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔

کمزوری کی وجہ سے درگا گردن بھی نہ موڑ سکتی تھی۔ اور اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے دکان آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ آوازیں بدستور آرہی تھیں مگر کوئی کوئی لفظ سمجھ میں آتا تھا۔

"بے چاری! شاید پہلا ہی ہے"

"کسی مزدور کی۔۔۔۔۔۔ معلوم نہیں کہاں ہوگا۔"

"چلو ہٹو۔۔۔۔۔ نجات۔۔۔۔۔۔ نکلو۔"

درگا نے اپنے پیٹ میں ایک عجیب خلا محسوس کیا۔ ہاتھ ہلانے کی

کوشش کی تو ایسا محسوس ہوا گویا تمام کپڑے پانی...... نہیں ......خون میں لت پت ہیں اور دفعتہً اس کے دماغ میں ایک ہولناک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔

"میں نے یہاں ...... تمام دنیا کے سامنے بچہ جنا ہی۔ ہی بھگوان! کیا یہ بےشرمی میرے ہی بھاگ میں لکھی تھی؟" اس کا بس چلتا تو وہیں زمین میں گڑجاتی۔ ایسی بےعزتی سے تو موت ہی بہتر تھی۔ کمزوری کی ایک لہر آئی۔ اور درگا نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے سوچا "اب میں کس طرح یہاں سے جاؤں گی؟ کیسے کسی کو منہ دکھاؤں گی؟ ساری دنیا میری طرف اشارا کرے گی۔"

کئی منٹ درگا اسی شرمندگی کے سمندر میں غرق رہی۔ کمزوری اور بےہوشی کا غلبا پھر ہونے والا تھا کہ ......

"قیں۔ ایں۔ ایں...... "

ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ایک بچا، درگا کا بچا، نندو کا بچا، اور اس ننھی آواز نے سماج کی بنائی ہوئی شرم پر نفاست کی دیواروں کو لرزادیا۔ درگا کے دماغ سے کمزوری اور بےہوشی کے بادل چھٹ گئے۔ تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے گردن موڑی اور دیکھا کہ چند میلے سے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک لال لوئی سا بچا ننھا سا منہ کھول کر رو رہا ہے...."بھوکا ہوگا" یہ سوچ کر اس نے اپنے بچے کو چھاتی سے چمٹا لیا اور اپنی چولی کے بند کھولنے لگی۔

ماما کی عظمت انسانی تجسس پر غالب آئی اور سب لوگ مسکراتے مکان سے باہر نکل آئے۔

چند منٹ کے بعد درگا دیوار کا سہارا لیتی ہوئی اُٹھی اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں مگر فاتحانہ نظروں کے ساتھ باہر چلی گئی۔ ایک ہاتھ سے وہ گود میں اپنے بچے کو تھامے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس کا تھیلا اور تھیلے میں ایک پائلی چاول۔

احدق پھپھوندوی

فرشتۂ جنگ کا پیغام

(ہندوستان کے نام)

مژدہ ای ہندوستاں کے بےکس و بےپر غلام
آ ادھر، سن جنگ کے خونیں فرشتہ کا پیام

یہ لڑائی پیش خیمہ ہے اِک امنِ عام کا
رخ بدل ڈالے گی یکسر گردش ایام کا

ختم کردے گا زمانا وحشت و درندگی
ڈھل کے نکلے گی نئے سانچے کے اندر زندگی

جبر و استبداد کا بازار ہوجائے گا سرد
کبر و نخوت کے رخِ خونیں پہ چھا جائے گی گرد

کرکے تہ رکھ دے گی دام کید و فطرت پالسی
بھول جائے گی سب اپنے ہتکنڈے ڈپلومسی

توڑ دے گا سسکیاں لے لے کے دم سرمایادار
قبر کی تاریکیوں میں چھپ رہے گا سودخوار

نذر آتش کردیا جائے گا قصرِ حرص و آز
طعمۂ کنجشک ہوں گے استخوانِ شاہباز

قصر و ایواں ہوں گے فاقا کرنے والوں کے لئے
لاج و پیلس وقف سب ہوں گے کدالوں کے لئے

قصہ ہوجائے گا ارباب ریاست کا تمام
قبضۂ دہقاں میں ہوگا ملک کا ضبط و نظام

کردئے جائیں گے ہاتھ ارباب دولت کے قلم
ہاتھ میں مزدور کے ہوگا حکومت کا علم

صبر کر، ہاں ہند میں بھی انقلاب آنے کو ہی
غیب سے تیری دعائے مستجاب آنے کو ہی

سہیل

یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے، اسیرِ غم اب تو چھوٹ جائے
چمن کو لوٹا ہی باغباں نے تو آ کے گلچیں بھی لوٹ جائے

ستم بھی ہوگا تو دیکھ لیں گے کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے، یہ مہربانی کا جھوٹ جائے

بلا سے قزاق آ کے لوٹیں، یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اچک لے شاہیں توغم نہیں ہی، قفس تو کمبخت ٹوٹ جائے

جوش ملیح آبادی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہی بھیڑیا
بھیڑئے کو مار دو گولی پڑے امن و بقا

باغ انسانی میں چلنے ہی پہ ہی بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہی ہچکیوں پر ہچکیاں

ہاتھ ہی ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوع انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟

ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟

اپنے ظلم بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟

لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں

دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی، تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

اللہ اللہ! کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم، کیا دشمنِ حق تھا سراج؟

کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟

تیسرے فاقے میں اِک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کا سر لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے؟

یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں
اب بھی جس کی خاک سے اُٹھتا ہے رہ رہ کے دھواں

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر! کی صدا

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

ذہن میں ہوگا یہ تازا ہندیوں کا داغ بھی
یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی

پوچھ لو ان سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے
ڈائر گرگ دہن آلود اب بھی زندہ ہے

وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے

اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے

اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنا سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس میں کوڑوں کی صدا

آج کشتی امن کی امواج پر کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درس حق دیتے ہو کیوں

اہل قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
"بینکی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم

اہل حق روشن نظر ہیں اہل باطن کور ہیں
یہ تو ہیں الفاظ ان قوموں کے جو کم زور ہیں

آج شاید منزل قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں

کیا کہا؟ انصاف ہے انساں کا فرض اولیں
کیا فساد ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟

دیر سے بیٹھے ہو نخل راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہی پاؤں میں

گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہی
خیر تو ہی اسپ تازی کیا شفاخانے میں ہی؟

آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہی
کچھ طبیعت کیا نصیب دشمناں ناساز ہی؟

سانس کیا اُکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے

ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہی آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شوروشین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین

خیر ای سوداگرو اب ہی تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکادو گردنیں

اِک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہی تمہارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہی اب فرمان ٹل سکتا نہیں

آنند نرائن ملا

آثارِ وقت

ہر اک سمت کالی گھٹا چھارہی ہی
پھر اک عصرِ نو کی بہار آرہی ہی

بدلنے کو ہی پھر نظامِ زمانہ
ہوا ختم وہ دورِ شاہنشہانہ
لب دہر پر ہی نیا اِک فسانہ

ترانے نئے زندگی گا رہی ہی
ہر اک سمت کالی گھٹا چھارہی ہی

حکومت کا لیکن طریقہ نہ بدلا
پڑا ہی ابھی تک نگاہوں پہ پردا
ہی انداز اب بھی وہی گفتگو کا

وہی راگ گائے چلی جارہی ہی
ہر اک سمت کالی گھٹا چھارہی ہی

کبھی ناتوانوں کی نم‌ساز بن کر
کبھی بے زبانوں کی آواز بن کر
کبھی خود مشیت کی ہم‌راز بن کر

ہمیں نیک و بد خوب سمجھا رہی ہے
ہر اک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے

مگر وقت سے کون جیتا ہے بازی
کہیں موج طوفاں بھی روکے ہی رکتی
تزلزل میں ہے قصرِ سرمایا داری

فصیل اِک نہ اک ٹوٹتی جا رہی ہے
ہر اک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے

لئے دل میں اک جذبۂ بے پناہی
نگاہوں میں اک جلوۂ صبح گاہی
ہے پھر کارواں نوع انساں کا راہی

مجھے اس کے قدموں کی چاپ آ رہی ہے
ہر اک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے

فراق گورکھپوری (رگھوپتی سہائے)

آزادی

مری صدا ہی گلِ شمع شامِ آزادی
سنا رہا ہوں دلوں کو پیامِ آزادی

لہو ہی تیرے شہیدوں کا یا بھڑکتے شرار
اچھل رہا ہی زمانے میں نامِ آزادی

مجھے بقا کی ضرورت نہیں کہ فانی ہوں
مری فنا سے ہی پیدا دوامِ آزادی

اب انقلاب کی ٹھانو کہ کوشش و اصلاح
خیالِ خام و غمِ ناتمامِ آزادی

معاہدے، سند اور این و آں تو باتیں ہیں[1]
یہ جنگ کیا ہی؟ غلامی بنامِ آزادی

جو راج کرتے ہیں جمہوریت کے پردے میں
انہیں بھی ہی سر و سودائے خامِ آزادی

تمہیں کروگے منظم جہاں کو مزدورو!
تمہیں سجاؤگے دیوانِ عامِ آزادی

فضا میں جلتے دلوں سے دھواں سا اُٹھتا ہی
ارے یہ صبحِ غلامی! یہ شامِ آزادی!

یہ مہر و ماہ، یہ تارے، یہ بام ہفت افلاک
بہت بلند ہی ان سے مقامِ آزادی

فضائے شام و سحر میں شفق جھلکتی ہی
کہ جام میں ہی مئی لالہ فامِ آزادی

سیاہ خانۂ دنیا کی ظلمتیں ہیں دو رنگ
ہی آج شامِ اسیری کہ شامِ آزادی؟

سکوں کا نام نہ لے، ہی وہ قیدِ بے میعاد
ہی پی بہ پی حرکت میں قیامِ آزادی

قدم یہ اُٹھتے ہیں پس ماندگانِ منزل کے
کہ رہروؤں میں یہی ہیں امامِ آزادی

دلوں میں اہلِ زمیں کے ہی نیو اس کی مگر
قصورِ خلد سے اونچا ہی بامِ آزادی

ترنم سحری دے رہا ہی لو چھپ کر
حریفِ صبحِ وطن ہی یہ شامِ آزادی

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراق
ہمارے سانس سے روشن ہی نامِ آزادی

---

[1] اٹلانٹک چارٹر، انگلستان و امریکا وغیرہ کے نئے نظام کی طرف اِشارا ہی۔

زمانے کا چیلنج

حسن ماضی سے جو لپٹا ہی وہ سودائی ہی
کہ بدل جانے کی دنیا نے قسم کھائی ہی

داستاں اپنی ہی تاریخ نے دہرائی ہی
ہو خبر تجھ کو تو ہوتی بھی یہی آئی ہی

موت سو مرتبہ جس راہ میں تیورائی ہی
وہیں دراتی حیات بشری آئی ہی

راج ہٹ سے جو پرجا ہٹ کبھی ٹکرائی ہی
وقت کے دل کے دھڑکنے کی صدا آئی ہی

اس تمدن نے کھلائے ہیں گلستاں کیا کیا
خون مفلس سے یہ ساری چمن آرائی ہی

دیکھ بپھری ہوئی دنیا کو دبانے کی نہ سوچ
باز آئے گی بغاوت سے نہ باز آئی ہی

انقلاب اور کسے کہتے ہیں یہ رنگ تو دیکھ
زندگی موت کو بھی ساتھ لگا لائی ہی

نہیں خیر اب تری ای نظم کہن، میری بھی
کچھ نہ کچھ رنگ زمانا سے شناسائی ہی

دیکھنا یہ ہی برستی ہی کہ برساتی ہو آج
دامن برق کو لہرا کے گھٹا چھائی ہی

روپیہ راج کرے آدمی بن جائے غلام
ایسی تہذیب تو تہذیب کی رسوائی ہے

چند خاموش شرارے تھے ہوا میں جن کو
خرمن نظم کہن دیکھ کے تھرائی ہے

آج خمیازے سے صدیوں کے فضا ہے لرزاں
نئی دنیا کی یہ آئی ہوئی انگڑائی ہے

کیسی پرچھائیاں دنیا پہ پڑی ہیں جس وقت
موت کی زلفِ سیہ زیست پہ لہرائی ہے

دولت و علم کی سازش ہے جو انساں کے خلاف
وقت کی روح خبر اس کی اُڑا لائی ہے

اشک خونیں سے ہے مزدور کے رنگین فضا
یہ گلابی بھی انہیں آنکھوں نے چھلکائی ہے

کیوں نہ ہو سینۂ مفلس سے چرایا ہے لہو
میٹھی خوش بھی ہیں، رنگت بھی نکھر آئی ہے

ابھی مٹی میں ملا آئے ہیں نازیت کو
سامراجوں کی بھی سنتے ہیں خبر آئی ہے

عالمِ نزع ہے آئینِ شہنشاہی کا
چارہ گر اب تری بےکار مسیحائی ہے

مجھ میں یہ جرات انکار سن ای شیخ زماں
توڑتی تاڑتی بر حد یقیں آئی ہے

شورش کاشمیری

نوجوانوں سے خطاب

ای لشکرِ ملت کے رضاکار جوانو — آزادئ کامل کے طلب گار جوانو
تقدیر کو تدبیر کے بازو پہ جھکادو — ناموسِ وطن کے لئے جانوں کو لڑادو
خورشیدِ شہنشاہی کوڈھلتے ہوئے دیکھوں — سینے میں عزائم کو مچلتے ہوئے دیکھوں
یہ ملک ہوا جس کے تشدد کا نشانا — اب اس کی تباہی کا بھی آیا ہی زمانا
یورپ کی فضاؤں میں قضاجاگ اٹھی ہی — اب جنگ کفن‌چور لٹیروں میں ٹھنی ہی
ہٹلر کے ارادوں کا بدلنا نہیں ممکن — لندن کے خداؤں کا سنبھلنا نہیں ممکن
اب جلیان والا کے شہیدوں کو پکارو — سرحد کے بھی پُرجوش پٹھانوں کو پکارو
اجڑے ہوئے باغوں کی بہاروں کو پکارو — افلاکِ شہادت کے ستاروں کو پکارو
کہتا ہوں سنو، جوش جوانی کو پکارو — چلتی ہوئی تیغوں کی روانی کو پکارو
مقتل سے اٹھالاؤ شہیدوں کے سروں کو — آواز دو آواز تہ حال گھروں کو
لینا ہی مجھے ہند کی تذلیل کا بدلا — ناموس کی بجھتی ہوئی قندیل کا بدلا

مشرق کے جوانوں کو سنبھلتے ہوئے دیکھوں
یہ ہند کی سرکار بدلتے ہوئے دیکھوں

مجاز

بدیسی مہمان سے

مسافر بھاگ وقتِ بے کسی ہی — ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہی
تری جیبوں میں ہیں سونے کے توڑے — یہاں پر جیب خالی ہوچکی ہی

یہ عالم ہوگیا ہی مفلسی کا　که رسم میزبانی اٹھ گئی ہی
نہ دے ظالم فریب چارہ سازی　یہ بستی تجھ سے اب تنگ آچکی ہی
مناسب ہی کہ اپنا راستا لے
وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہی

گھٹا جو اس سمندر سے اٹھی ہی　دُرِ خوش آب بھی برسا چکی ہی
مگر اب اس کا عالم ہی جدا ہی　یہ بدلی آگ برساتی اٹھی ہی
ستارا صبح کا بے نور ہی اب　درو دیوار پر دھوپ آچکی ہی
نسیم نرم‌رو اس گلستاں کی　سموم دشت‌پیما بن چکی ہی
بگولے اٹھ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں　فضاے دہر میں ہل‌چل مچی ہی
یہاں ہر شاخ شمشیر برہنہ　گلوں سے خون کی بو آ رہی ہی
مرتب اک نیا دستور ہوگا　بِنا اک دورِ نو کی پڑ رہی ہی
ہلی جاتی ہی بنیاد قدامت　جوانی ہوش میں آئی ہوئی ہی
یہاں کے آسمانِ آتشیں پر　بغاوت کی گھٹا منڈلا رہی ہی
یہاں سے ایک طوفاں چل رہا ہی
یہاں سے ایک آندھی اٹھ رہی ہی

مخدوم محی الدین

زُلف چلیپا

آفریں ہی تجھ پہ ای سرمایا داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام

آندھیاں شعلہ بداماں خون کی برسات میں
اب تو بوئے آتش و باروت ہی ہر بات میں

کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج
فرقِ گیتی پر نظر آتا ہی پھر کانٹوں کا تاج

موت محوِ شادمانی، غرقِ ماتم ہی حیات
لٹ رہی ہی ساری خلقت، جل رہی ہی کائنات

جس زمیں سے ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے

رام و لچھمن کی زمیں، کرشن کی، گوتم کی زمیں
وہ محمد کی زمیں، وہ ابنِ مریم کی زمیں

اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہی
اس کے دل میں موت ہی، اس کی نظر میں موت ہی

مندروں میں، معبدوں میں اور کلیساؤں میں موت
خلوتوں میں موت ہی، شاہی شبستانوں میں موت

زرگری کا رقص ہی، سود و زیاں کا رقص ہی
ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہی

اب کسی سینے میں روحِ شادماں گاتی نہیں
زندگی کی اب کہیں ہلچل نظر آتی نہیں

برہمی زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی، ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

پی اور اپنے ہاتھ سے پی لے کے سرمائے کا نام
موت کا لبریز ساغر، عصرِ حاضر کے غلام

عزمِ آزادی سلامت، زندگی پاینده باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو، بغاوت زنده باد

سردار جعفری

جنگ اور انقلاب

رقص کر ای روحِ آزادی کہ رقصاں ہی حیات
گھومتی ہی وقت کے محور پہ ساری کائنات

زندگی مینا و ساغر سے ابل جانے کو ہی
کامرانی کے نئے سانچے میں ڈھل جانے کو ہی

اڑرہا ہی ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ
چھٹ رہا ہی وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ

ہی فضاؤں میں نویدِ شادمانی کا سرور
پڑ رہا ہی عشرتِ فردا کی پیشانی پہ نور

موت ہنس کر دیکھتی ہی آئینا تلوار میں
زر پرستی کا سفینا آگیا منجدھار میں

باہمی نفرت کے شعلے جنگ کی پُرہول آگ
پیر زن سرمایا داری کہ ہی بیوا کا سہاگ

خون کی بو سے مشامِ زندگی مخمور ہی
گولیوں کی سنسناہٹ سے فضا معمور ہی

یہ ہی وہ زنجیر خود ہاتھوں سے ڈھالا تھا جسے
یہ ہی وہ بجلی کہ خود خرمن نے پالا تھا جسے

تیر جو چٹکی میں تھا پیوست اب بازو میں ہی
آستیں میں تھا جو خنجر آج وہ پہلو میں ہی

آگیا ہی وقت وہ جو آکے ٹلتا ہی نہیں
اپنا لنگر آج اپنے سے سنبھلتا ہی نہیں

ہل چکا ہی تخت شاہی، گر چکا ہی سر سے تاج
ہر قدم پر ڈگمگایا جارہا ہی سامراج

ڈھل رہی ہی زرگری کی رات کے تاروں کی چھاؤں
مفلسی پھیلا رہی ہی وقت کی چادر میں پاؤں

انقلابِ دہر کا چڑھتا ہوا پارا ہی جنگ
وقت کی رفتار کا مڑھتا ہوا دھارا ہی جنگ

ہم سے آزادوں کا اس دم گیت گانا خوب ہی
سر پھرے باغی جوانوں کا ترانا خوب ہی

غم کے سینے میں خوشی کی آگ بھرنے دو ہمیں
خوں بھرے پرچم کے نیچے رقص کرنے دو ہمیں

ساحر لدھیانوی

لمحۂ غنیمت

مسکرا ای زمینِ تیرہ و تار
سر اُٹھا، ای دبی ہوئی مخلوق
دیکھ، وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے خمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم اُلجھنے لگے
کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں‌بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں آہنی ہی سہی
آج موقع ہی ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اُٹھا، ای دبی ہوئی مخلوق

سرور (آل احمد)

دوسری جنگِ عظیم کا ایک تاثر

ذہنِ انساں پہ جو چھایا ہی اندھیرا یا رب
اس اندھیرے کی کبھی کوئی سحر بھی ہوگی؟

یہ جو شیرازا بکھرتا ہی چلا جاتا ہی
اس کی تنظیم بہ عنوانِ دگر بھی ہوگی؟

آمریت کا یہ طوق اور مری گردن، کیا خوب
میری فطرت، مری عادت پہ نظر بھی ہو گی؟

جس کے اظہار کی ہمت بھی نہیں ہونٹوں پر
وہ دعا کیا کبھی ممنونِ اثر بھی ہو گی؟

اُن کے دامن میں بہت لعل و گہر ہیں، پھر کیا
روس کی لالہ فشانی پہ نظر بھی ہو گی؟

پاس بانی جنھیں سونپی گئی بحر و بر کی
چین کے حال کی کچھ ان کو خبر بھی ہو گی؟

کہہ دو اربابِ چمن سے کہ نہ غیروں پہ ہنسیں
چشمک برق جو ہو گی تو ادھر بھی ہو گی

اسی اُمید پہ بیٹھا ہوں سرِ راہ گزر
ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہو گی

زاد (جگن ناتھ)

سبھاش چندر بوس

(بہادر شاہ ظفر کے مزار پر)

ای شہِ ہندوستاں، ای لال قلعہ کے مکیں
آسماں ہونے کو ہے پھر اس وطن کی سرزمیں

یہ وطن روندا ہے جس کو مدتوں اغیار نے
جس پہ ڈھائے ظلم لاکھوں چرخ ناہنجار نے

مدتوں جس کو رکھا قسمت نے ذلت آشنا
جس نے ہر پہلو میں دیکھی پستیوں کی انتہا

آج پھر اس ملک میں اک زندگی کی لہر ہی
خاک سے افلاک تک تابندگی کی لہر ہی

آج پھر اس ملک کے لاکھوں جواں بیدار ہیں
حریت کی راہ میں مٹنے کو جو تیار ہیں

آج پھر ہی بے نیام اس ملک کی شمشیر دیکھ
سونے والے جاگ، اپنے خواب کی تعبیر دیکھ

اس طرح لرزے میں ہی بنیاد ایوانِ فرنگ
کھاچکے ہیں مات گویا شیشہ بازانِ فرنگ

حب قومی کے ترانوں سے ہوا لبریز ہی
اور توپوں کی دنادن سے فضا لبریز ہی

شور گیر و دار کا ہی پھر فضاؤں میں بلند
آج پھر ہمت نے پھینکی ہی ستاروں پر کمند

پھر اُمنگیں، آرزوئیں ہیں دلوں میں بےقرار
قوم کو یاد آگیا ہی اپنا گم گشتہ وقار

نوجوانوں کے دلوں میں سرفروشی کی اُمنگ
عشق بازی لے گیا ہی، عقل بےچاری ہی دنگ

آج پھر اس دیس میں جھنکار تلواروں کی ہی
ذرے ذرے میں نہاں تابندگی تاروں کی ہی

یہ نظارا آہ ! لفظوں میں سما سکتا نہیں
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہی لب پہ آسکتا نہیں

فتح و نصرت کی دعاؤں سے ہوا معمور ہی
نعرۂ ''جی ہند،، سے ساری فضا معمور ہی

مجھ کو ای شاہِ وطن، اپنے ارادوں کی قسم
اور ہم آغوشِ اجل سرہنگ زادوں کی قسم

تیرے مرقد کی مقدس خاک کی مجھ کو قسم
میں جہاں ہوں اُس فضاے پاک کی مجھ کو قسم

اپنے بھوکے، جاں بہ لب بنگال کی مجھ کو قسم
اور اس صوبے کے ظالم کال کی مجھ کو قسم

لال قلعہ کی، زوالِ شہرِ دہلی کی قسم
حاکمِ دہلی، مآلِ شہرِ دہلی کی قسم

میں تری کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لاؤں گا
اور ترے مرقد پہ نصرت یاب ہوکر آؤں گا

وامق جون پوری

عزمِ بلند

دریا میں تلاطم برپا ہی ، کشتی کا فسانا کیا معنی
گرداب سے جب لڑنا ہی تمہیں ، تنکے کا سہارا کیا معنی
یہ نوحۂ کشتی بند کرو ، خود موجِ طوفاں بن جاؤ
پیروں کے تلے ساحل ہوگا. ساحل کی تمنا کیا معنی

عرش ملسیانی

بڑھے چلو

وطن کی آبرو ہو تم ، بڑھے چلو بڑھے چلو
وطن کے چارہ جو ہو تم ، بڑھے چلو بڑھے چلو
جواں ہو ، نیک خو ہو تم ، بڑھے چلو بڑھے چلو
بڑھو تو سرخ رو ہو تم ، بڑھے چلو بڑھے چلو
بڑھے چلو دلاورو ، دلاورو بڑھے چلو

جہاں ستیزہ کار ہی دلاوری کا وقت ہی
خضر نہیں تو ہو نہ ہو سکندری کا وقت ہی

خدا گری کو چھوڑ دو کہ خودگری کا وقت ہے
اُٹھو، پیام شوق دو، پیمبری کا وقت ہے

بڑھے چلو دلاورو، دلاورو بڑھے چلو

نشاط و عیش چھوڑ کر، رباب و چنگ چھوڑ کر
شباب اور شباب کی ہر اِک امنگ چھوڑ کر
عدوے آبرو ہو جو وہ عذرِ لنگ چھوڑ کر
عمل فریب بُزدلی کو بے درنگ چھوڑ کر

بڑھے چلو دلاورو، دلاورو بڑھے چلو

۳۔ اگست ۱۹۴۲ء کی بغاوت اور اس کے بعد

[۱۹٤۱ء میں وائسرائے نے اعلان کیا کہ جنگ کے خاتمہ پر ہندوستان کو آزادی دی جائے گی اور گرفتار شدہ سیاسی لیڈروں کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن اس اعلان میں اس بات کی توضیح نہ تھی کہ یہ آزادی کس قسم کی آزادی ہوگی۔ اس لئے کانگرس نے برطانیا کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کردیا۔ برطانیا نے معاملات کو سلجھانے اور کسی فیصلا پر پہنچنے کے لئے کرپس مشن بھیجا لیکن یہ مشن بھی اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ کانگرس کی مجلس عاملہ نے فیصلا کیا کہ 'ہندوستان چھوڑ دو' (Quit India) کی تحریک شروع کی جائے۔ چنانچہ اگست ۱۹٤۲ء میں کانگرس کے عام اجلاس میں یہ تجویز پاس ہوگئی۔ لیکن دوسرے ہی روز تمام کانگریسی لیڈر قیدخانوں میں بند تھے اس لئے تحریک دب کر رہ گئی۔ سبھاش چندر بوس کسی طرح روپوش ہوکر ہندوستان سے فرار ہو چکے تھے۔ انھوں نے آزاد ہند فوج بنائی جو انگریزوں کو اکثر پریشان کیا کرتی تھی۔ ۱۹٤۵ء میں جب جنگ ختم ہوگئی تو ملک کی سیاسی گتھی کو سلجھانے کے لئے وزارتی مشن آیا لیکن اس موقع پر بھی معاملات پورے طور پر طی نہ پاسکے۔]

داستانِ بے ستون و کوہ کن

نو مہینے ہوئے، ٤ دسمبر ۱۹٤۱ ع کو نینی کے مرکزی قید خانہ کا دروازا میرے لئے کھولا گیا تھا۔ کل ۹ اگست ۱۹٤۲ع کو سوا دو بجے احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس کارخانۂ ہزار شیوۂ رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کئے جاتے ہیں تاکہ کھلیں۔ نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی۔

دو کروٹیں ہیں عالم غفلت میں خواب کی

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہی جیسے تاریخ کی ایک پوری داستان گذر چکی۔

....

. . . . . کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں، دھیرو[1] ایک کاغذ ہاتھ میں لئے کھڑا ہی اور کہہ رہا ہی دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر پلیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گو اتنی ہی خبر میرے لئے کافی تھی مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں:

کس کس کی مہر ہی سر محضر لگی ہوئی؟

....

[1] بھولا بھائی دیسائی مشہور لیڈر اور بیرسٹر کا لڑکا۔

کار ۱؎ وکٹوریا ٹرمنس اسٹیشن پر پہنچی تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرے کے حصار میں تھا اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گذر رہا تھا لیکن مسافروں کا داخلا روک دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہل چل دکھائی دیتی تھی کیونکہ ایک انجن ریسٹورنٹ کار کو ڈھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا یہی کاروان خاص ہے جو ہم زندانیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ گاڑیاں کاری ڈور کیریج (Corridor Carriage) قسم کی لگائی گئی تھیں جو آپس میں جُڑ جاتی ہیں اور آدمی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندر ہی اندر جاسکتا ہے۔ ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا گرفتاریوں کا معاملا پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ بہت سے آچکے ہیں۔ جو نہیں آئے وہ آتے جاتے ہیں۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

....

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سیکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سنا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لطف اسی وقت آیا۔

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
این قدر ہست کہ بانگ جرسی می آید

بمبئی میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں ان میں احمد نگر کے قلعہ اور پونا کے آغا خان پیلس کا نام تعین کے ساتھ لیا جا رہا

۱؎ سنٹرل لائن پر بمبئی کا آخری اور سب سے بڑا اسٹیشن

تھا۔ جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی اور پونا کی راہ اختیار کی تو سب کو خیال ہوا غالباً منزل مقصود پونا ہی ہے۔ لیکن پونا قریب آیا تو ایک غیرآباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقا اتار لئے گئے اور بمبئی کے مقامی قافلے کو بھی اترنے کے لئے کہا گیا اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کردیا۔

اب احمدنگر ہر شخص کی زبان پر تھا کیونکہ اگر پونا میں ہم نہیں اتارے گئے تو پھر اس رخ پر احمدنگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ ایک صاحب نے جو انھی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمدنگر کا باہمی فاصلا ستر اسی میل سے زیادہ نہیں۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہئے۔ مگر میرا خیال دوسری ہی طرف جارہا تھا۔ احمدنگر یقیناً دور نہیں ہے۔ بہت جلد آجائے گا۔ مگر احمدنگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے؟ احمدنگر سے تو شروع ہوگا۔

....

احمدنگر کے نام نے حافظے کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کردئے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جارہی تھی۔ میدان کے بعد میدان گذرتے جارہے تھے۔ ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا؛ اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا۔ احمدنگر اپنی چھ سو برس کی داستان کہن لئے ورق پر ورق اُلٹتا جاتا۔ ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا۔ مجھے خیال ہوا اگر ہمارے قید وبند کے لئے یہی جگہ چنی گئی ہے تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں ہم خراباتیوں کے لئے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا۔

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے۔ انہیں میں مقامی چھاونی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا جس سے ہمیں ملایا گیا۔ ہم اترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہی۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہی۔ جب قدم اٹھا دیا تو کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں، لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہوجاتی ہی۔

. . . .

قلعہ کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی، پھر ٹینکوں کی۔ اس کے بعد ایک احاطے کے سامنے جو قلعہ کی عام سطح سے چودہ پندرہ فٹ بلند ہوگا اوراس لئے چڑھائی پر واقع ہی کاریں رک گئیں اور ہمیں اترنے کے لئے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پلیس بمبئی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ آفیسر کے حوالے کی۔ وہ فہرست لے کر دروازے کے پاس کھڑا ہوگیا۔ یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سرشتہ حکومت بمبئی کے ہاتھ سے نکل کر فوجی انتظام کے ہاتھ آگیا اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہوگئے۔

در جستجوی ما نکشی زحمت سُراغ
جائی رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

سحرِ نو

پیدا اُفقِ ہند سے ہیں صبح کے آثار ہی منزل آخر میں غلامی کی شبِ تار
آمد سحرِ نو کی مبارک ہو وطن کو
پامالِ محن کو

مشرق میں ضیا ریز ہوا صبح کا تارا فرخندہ و تابندہ و جاں‌بخش و دلِ آرا
روشن ہوئے جاتے ہیں در و بام وطن کے
زندان وطن کے

«جی ہند» کے نعروں سے فضا گونج رہی ہی «جی ہند» کی عالم میں صدا گونج رہی ہی
یہ ولولہ، یہ جوش، یہ طوفان مبارک
ہر آن مبارک

اہل وطن، آپس میں الجھنے کا نہیں وقت ایسا نہ ہو غفلت میں گذر جائے کہیں وقت
لازم ہی کہ منزل کے نشاں پر ہوں نگاہیں
پُر پیچ ہیں راہیں

وہ سامنے آزادئ کامل کا نشاں ہی مقصود وہی ہی، وہی منزل کا نشاں ہی
درکار ہی ہمت کا سہارا کوئی دم اور
دو چار قدم اور

جمیل مظہری

موسم کے اشارے

ملاح اگر بنے ہو پیارے سمجھو موسم کے بھی اشارے
پتوار نہ توڑدیں تمہاری حالات کے تند و تیز دھارے

سُن سُن کے اختیار کا راگ ہمت مجبوروں کی بڑھی ہی
گو تم نے بنابنا کے قانون زنجیر نئی نئی گڑھی ہی

میزانِ عمل میں ان کے جذبات ہر چند ابھی تلے نہیں ہیں
طوفان ہمک رہا ہی ان میں پانی کے یہ بلبلے نہیں ہیں

لنگر بھاری سہی تمہارا کشتی لیکن اُچھل رہی ہی
مزجیں نہ ہوں بے قرار کیوں کر ندی کروٹ بدل رہی ہی

بھکی بھکی ہوئی ہوائیں ٹکڑے بادل کے لارہی ہیں
موجوں کے گلے میں باہیں ڈالے طوفان کے گیت گارہی ہیں

موسم آنکھیں دکھارہا ہی منظر تیور بدل رہے ہیں
چھوٹے چھوٹے حباب بھی آج منہ سے طوفاں اُگل رہے ہیں

یہ کس نے بتادیا ہی تم کو؟ بادل ہیں بہار کی نشانی
ان کالی گھٹاوں پر نہ بھولو برسے گا انھی سے لال پانی

موجیں کف در دہاں ہیں تم پر فطرت چیں برجبیں ہی تم سے
کشتی والے مچاتے ہیں غل کشتی چلتی نہیں ہی تم سے

اب خیر اسی میں ہی کہ آؤ
کشتی کو ڈبو کے بھاگ جاؤ

وجد

صبح نو

بزم تاریک وطن کو روشنی درکار ہی
شمع کے مانند جلنے کا زمانا آگیا

موتیوں کی طرح عیش قعر دریا کب تلک؟
مضطرب موجوں میں پلنے کا زمانا آگیا

راہ آزادی میں کیا اندیشۂ سود و زیاں
ٹھوکریں کھالو، سنبھلنے کا زمانا آگیا

کررہا ہی وقت خود تکذیب اوہام کہن
ہر تصور کے بدلنے کا زمانا آگیا

ہوگیا ہی آگ تپ تپ کر غریبوں کا لہو
اب سلاسل کے پگھلنے کا زمانا آگیا

اہل زنداں کو مبارک ہو فروغِ صبحِ نو
قید ذلت سے نکلنے کا زمانا آگیا

وجد

ارادے

دل دریا میں طوفاں اور یہ عیشِ لب ساحل
اسیرانِ بلا کا آج بیڑا پار کرنا ہی

کف دست مجاہد تختۂ مشق حنابندی
اسے تو ظالموں کے خون سے گلنار کرنا ہی

پڑی ہیں مدتوں سے جن میں زنجیریں فلاکت کی
انھی ہاتھوں سے ایوان ستم مسمار کرنا ہی

غلامی کے اندھیرے میں نظر آتی نہیں منزل
چراغِ عزم سے آساں رہِ دشوار کرنا ہی

فضا سے جس کی برق و ماہ و انجم ہو گئے رخصت
اسی تاریک شب کو مطلعِ انوار کرنا ہی

بتانِ سیم و زر پر مرنے والے نوجوانوں کو
وطن پر جان دینے کے لئے تیار کرنا ہی

بلند و پست سے ہیں پاؤں چھلنی راہ گیروں کے
مقدس شاہ راہِ زندگی ہموار کرنا ہی۔

یہ مانا چند قطرے ہیں لہو کے قلب میں لیکن
بیاباں کو ابھی سے سینچ کر گلزار کرنا ہی

شعاع آفتاب زندگی، کب تک یہ بے مہری؟
چمن کے آنسوؤں کو گوہر شہوار کرنا ہی

وجد

بشارت

آزادئ افکار کے گل دل میں کھلیں گے
یہ خار غلامی کی چبھن کل نہ رہے گی

یہ دشمن انصاف و کرم ظلم کی دیوی
بےکس کا لہو پی کے مگن کل نہ رہے گی

ارباب ہمم شاد و سرافراز رہیں گے
یہ سرکشئ دار و رسن کل نہ رہے گی

فریاد کناں، سینۂ خاور میں مقید
آزادئ مشرق کی کرن کل نہ رہے گی

پُرہول فضا، حسرت صد شام غریباں
یہ کیفیت صبح وطن کل نہ رہے گی

آزاد (جگن ناتھ)

آزاد ہند فوج

پائندہ باد ہند کی ای فوج خوش نہاد
وہ دن خدا کرے کہ بر آئے تری مراد

مٹ جائے بزم دہر سے یہ جنگ، یہ فساد
زنداں کو توڑ پھوڑ دے ای حریت نژاد
اب وقت آگیا ہی کہ ہو عازمِ جہاد
ہندوستاں کی فوجِ ظفرموج زندہ باد

پرچم ترا ہو چاند ستاروں سے بھی بلند
پہنچا سکے نہ دور زمانا تجھے گزند
اغیار کرسکیں نہ کبھی تجھ پہ راہ بند
پسپائیاں ہوں تیرے جوانوں کو ناپسند
تو کامراں ہو اور عدو تیرے نامراد
ہندوستاں کی فوج ظفر موج زندہ باد

«جی ہند» کی صداؤں میں تیرے جواں بڑھیں
ہاتھوں میں لیے کے امن و اماں کا نشاں بڑھیں
نصرت نصیب ان کے قدم ہوں جہاں بڑھیں
ہر وقار و عظمت ہندوستاں بڑھیں
دنیا کو بھی وہ شاد کریں ہند کو بھی شاد
ہندوستاں کی فوج ظفرموج زندہ باد

آخری مرحلہ

حصار باندھے ہوئے، تیوریاں چڑھائے ہوئے
کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اٹھائے ہوئے

بڑھے ہیں جھیلے ہوئے قید و بند کے آزار
اُٹھے ہیں جنگ خلافت کے آزمائے ہوئے

شجاع حیدر و ٹیپو کی گود کے پالے
دلیر نانک و رنجیت کے سکھائے ہوئے

خمار بادۂ اقبال کا نگاہوں میں
لبوں پہ نغمۂ ٹیگور مسکرائے ہوئے

نفس میں آنچ گرجتی ہوئی مشینوں کی
قدم پہ آتش و آہن کا سر جھکائے ہوئے

جبیں پہ دھان کے کھیتوں کی نرم ہریالی
نظر میں قحط کی پرچھائیاں چھپائے ہوئے

بھڑک کے دوش ہوا پر بچھا رہے ہیں کمند
شرر جو سرد کتابوں میں تھے دبائے ہوئے

فضا میں سرخ پھریرا لٹا رہا ہے حیات
ہوا کی زد پہ چراغ عمل جلائے ہوئے

تڑپ کے گرنے ہی والی ہے برق زنداں پر
کھڑے ہیں در پہ اسیر آسرا لگائے ہوئے

ابھی کھلیں گے نہ پرچم ابھی پڑے گا نہ رن
کہ مشتعل ہی مگر متحد نہیں ہی وطن

پکارتا ہی افق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رسن

یہ انتشار، یہ ہل چل، یہ مورچوں میں شگاف
مذاق اڑاتے ہیں عزم جہاد کا دشمن

نکل کے صف سے کھڑے ہو گیے ہیں کچھ ساونت
بڑھا کے ہاتھ محبت سے تھام او دامن

پھر ایک بار بڑھو لے کے صلح کا پیغام
پھر ایک بار جلادو شکوک کے خرمن

یہ یاس کیوں، یہ تمنائے خودکشی کیسی؟
نوید فتح ہی قلب عوام کی دھڑکن

مٹادو، مل کے مٹادو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

کیفی اعظمی

مژدہ

,, حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک ،،

زوالِ ملتِ اسلامیہ کے نوحہ خواں شبلی
مبارک ہو کہ کروٹ لے رہا ہی آسماں شبلی
مٹائے گا ہمارا کون اب نام و نشاں شبلی
دھواں گرما چکا اُڑنے کو ہیں چنگاریاں شبلی

" پریشاں ہو گئے شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک "
یقیناً موت کا پیغام ہی تنظیم کی خامی
جگا بھی تو دیا کرتا ہی اکثر دردِ ناکامی
اکٹھا ہو رہے ہیں منتشر اوراقِ اسلامی
چھپیں گی قصرِ سلطانی میں اب یہ آندھیاں شبلی

" کوئی پوچھے کہ ای تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ حشر انگیزیاں تاکی، یہ ظلم آرائیاں کب تک "
ہمارے خوں سے دامانِ گلستاں ہو چلا رنگیں
خزاں کے دام میں جکڑے پڑے تھے سنگ دل گلچیں
خوشا، تہذیبِ انسانی کے استادوں کو لے ڈوبیں
وہ حشر انگیزیاں شبلی، وہ ظلم آرائیاں شبلی

" یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہی
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک "
لیا ہی یہ سبق ہم نے خود اپنے خوں شدہ دل سے
ستم کی خو بدل سکتی نہیں فریادِ بسمل سے

تڑپ کر چھین لیں گے تیغ ہم اب دستِ قاتل سے
ہماری گردنوں پر اب نہ ہوگا امتحاں شبلی

" یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم مگر ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک "
اُفق پر کروٹیں لینے لگا جمہور کا پرچم
نئے سانچے میں ڈھلتا جارہا ہے عرصۂ عالم
ہمارے ہمہموں سے جن کی محفل ہوچلی برہم
وہ کیا دیکھیں گے اب ہنگامۂ آہ و فغاں شبلی

" یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک "
وہ گل شعلہ بنے جن پر ستم کروٹ بدلتا تھا
وہ رات آخر ہوئی جس میں چراغ ظلم جلتا تھا
ہمارا قصۂ غم سن کے جن کا جی بہلتا تھا
قریبِ ختم آپہنچی انھیں کی داستاں شبلی

جوش ملیح آبادی

تثلیثی فریب

چھری دبائے ہوئے ہیں بغل میں اہل مشن
شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں

فقیرِ برہنہ سے ہورہا ہی راز و نیاز
جناح اور جواہر منائے جاتے ہیں

وہ «فتنہ ساز» جو کل تک تھے جیل کی خوراک
وہ آج جیل کے درباں بنائے جاتے ہیں

جو سر کبھی نہ جھکے تھے جلال شاہی سے
حضور حضرت ویول جھکائے جاتے ہیں

پڑی ہوئی ہی جہاں خار و خس پہ چادرِ گل
وہ سبز باغ ہمیں پھر دکھائے جاتے ہیں

سر حیات پہ چپکے سے رکھ کے کوہِ گراں
کلہ سے کاہ کے ریشے ہٹائے جاتے ہیں

بجارہے ہیں بلندی پہ ساز آزادی
«وٹو» کی ہانک بھی لیکن لگائے جاتے ہیں

سروں پہ لطف کے برسائے جارہے ہیں پھول
دلوں پہ مہر کے سکے بٹھائے جاتے ہیں

زباں پہ جن کی لگائے گئے تھے قفل
فسانہ کہنے کی خاطر بلائے جاتے ہیں

خدا کی شان جو باغی عدوے سلطاں تھے
وزیرِ نائبِ سلطاں بنائے جاتے ہیں

ندیم قاسمی (احمد)

سمندر پار کے "فرشتہ ہائے رحمت" سے
(وزارتی مشن ۱۹۴۶ء کی واپسی پر)

عذاب جاں تھا اگر مملکت کا استقلال
تو کیا ضرور تھے ہنگامہ ہائے گفت و شنید
معلمین سیاست، تکلفات ہیں یہ
کہ خود شناس ہی انسانیت کا دورِ جدید

نہ جانے کب سے یہ طفلانہ کھیل جاری ہے
تمہاری «عقدہ کشائی» ہماری محرومی
مذاق پر اتر آتی ہے جب شہنشاہی
تو اپنے آپ کو پہچانتی ہے محکومی

تمہارے ذہن کی یہ موشگافیاں ہی تو ہیں
کہ حریت کی خرید و فروخت ہے دشوار
خزاں کے بعد یقیناً بہار آتی ہے
نہیں ہے عادت فطرت کو مصلحت درکار

مورخوں سے کہو، خون میں ڈبوئیں قلم
بدل چکا ہے ارادے میں اضطراب اپنا
خزاں رہے کہ بہار آئے ہرچہ باداباد
اب اک زقند کا ہے منتظر شباب اپنا

منظرِ رخصت

ای اہلِ وفا ماتم نہ کرو، وہ وعدہ شکن گر جاتا ہی
جاتا ہی مسافر غم نہ کرو، مہمان ہی تھا گھر جاتا ہی

وہ دورِ مسرت آنے دو، قومی پرچم لہرانے دو
جاتی ہی غلامی جانے دو، صدیوں کا دلدر جاتا ہی

جس نے یہ چمن برباد کیا، مشرق کو غلام آباد کیا
وہ قہر مجسم جاتا ہی، وہ سحر مصور جاتا ہی

کچھ سرو نہیں شمشاد نہیں، اجنب ہی گلستاں زاد نہیں
کیا اس کے مظالم یاد نہیں؟ جانے دو ستم گر جاتا ہی

دیوانے سمجھتے تھے جو ہمیں، اب وہ بھی سمجھتے جاتے ہیں
ایوانِ حکومت کا رستا زنداں سے بھی ہوکر جاتا ہی

ہر تار بکھرتا جاتا ہی، صیاد کے دامِ رنگیں کا
کچھ دیر نہیں صیاد بھی خود اب باندھ کے بستر جاتا ہی

لالے کو دبایا سنبل سے، قمری کو لڑایا بلبل سے
جاتا تو ہی اب صیاد مگر گلشن کو لٹا کر جاتا ہی

برپا کیا ہر سو رقصِ شرر، خرمن کو بنایا خاکستر
اب برقِ تپاں ہی گرم سفر، اب شعلۂ مضطر جاتا ہی

از ساحلِ جاوا تا بہ حلب، ہر سمت بپا ہی بزمِ طرب
ایران و فلسطین و مصر و عرب خوش ہیں کہ ستم گر جاتا ہی

رگ رگ میں چبھا ہو جو نشتر نکلے گا بآسانی کیوں کر
دیکھو تو ابھی تا وقتِ سفر کیا اور کرم کر جاتا ہی

اب دور مئ گل رنگ چلے یا بادہ کشوں میں جنگ چلے
ساقی تو اس مےخانے سے بے شیشہ و ساغر جاتا ہی

دہراؤ نہ گندرے قصوں کو، بھڑکاؤ نہ بجھتے شعلوں کو
اخلاص وہ مرہم ہی جس سے ہر زخم کہن بھر جاتا ہی

مل جل کے بڑھاؤ شانِ وطن، تعمیر کرو ایوانِ وطن
ماں جائے ہیں فرزندانِ وطن، جو غیر تھا باہر جاتا ہی

ہم تم کو بسر کرنا ہی یہیں، جینا ہی یہیں، مرنا ہی یہیں
اُٹھو یہ چمن شاداب کرو، اب غاصب خود سر جاتا ہی

انجام سے غافل نادانو، مانو کہ نہ مانو تم جانو
اک درس حقیقت دے کے تمہیں اقبال سخن ور جاتا ہی

۴- صبحِ نَو

[انگلستان کے وزیر اعظم ایٹلی نے پارلمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ جون ۱۹٤۷ع کے اندر اندر ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کردی جائے گی ۔ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھے ۔ انہوں نے کوشش کی کانگرس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتا ہوجائے۔ آخر یہ قرار پایا کہ ملک کو ہندوستان اور پاکستان، دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے ۔ وائسرائے نے کانگرس اور مسلم لیگ کے اس فیصلے کی پارلمنٹ کو اطلاع دی اور پارلمنٹ نے اسے مان لیا۔ ہندوستان کی آزادی کی تجویز پاس ہوگئی ۔

۱٤ اگست ۱۹٤۷ع کو آدھی رات کے
بعد آزادئ ہند کا نقارا بجا اور ملک
کے ہر فرد نے خوشی منائی ۔]

پھول برساؤ

جن سرافرازوں کی روحیں آج ہیں افلاک پر موت خود حیراں تھی جن کی جرات بے باک پر
نقش جن کے نام ہیں اب تک دل غمناک پر رحمت ایزد ہو دائم ان کی جان پاک پر
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

پھول برساؤ کہ پھولوں میں ہی خوش بوئے وفا تھی سرشت پاک ان کی عاشق خوئے وفا
موت پر ان کی، گئے جو روئے در روئے وفا کیوں نہ ہوں اہلِ وطن کے ایک خوں جوئے وفا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

تھے وہ فخر آدمیت، افتخارِ زندگی تھے وہ انساں طرۂ تاجِ وقارِ زندگی
اُن کے دم سے تھا چمن یہ خارزارِ زندگی تھا نفس ان کا نسیمِ نو بہارِ زندگی
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

چشم ظاہر بیں سمجھتی ہے کہ بس وہ مر گئے درحقیقت موت کو فانی وہ ثابت کر گئے
جو وطن کے واسطے کٹوا کے اپنا سر گئے خوں سے اپنے رنگ تصویرِ وفا میں بھر گئے
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

جن کی قید و بند نے دلوائی آزادی ہمیں جن کی بربادی سے ہاتھ آئی ہی آزادی ہمیں
جن کے ماتم نے دیا ہی نغمۂ شادی ہمیں دے کے اپنی جان، جینے کی تمنا دی ہمیں
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

نغمۂ بےتاب

تیور جو اسیروں کے بگڑے صیاد کی ہمت چھوٹ گئی
ای ذوق جنوں تیرے صدقے، زنجیر غلامی ٹوٹ گئی

باندھے ہوئے اپنے سر سے کفن نکلے جو فدا کارانِ وطن
صیاد کا زہرا آب ہوا، نبض اہلِ وفا کی چھوٹ گئی

جمہور کے آگے چل نہ سکی راجاؤں کی نوابوں کی
تھی جس پہ بدیسی بیل چڑھی وہ شاخِ وفا بھی ٹوٹ گئی

جس ننگ سے سر جھک جاتا تھا، جرات کا قدم رک جاتا تھا
دامن سے وہ دھبا دور ہوا، چہرے سے وہ کالک چھوٹ گئی

وہ آنکھ غضب کی تھی رہزن، تاراج کیا سارا گلشن
تھی جتنی متاع صنعت و فن، آئی وہ نظر اور لوٹ گئی

اب برق و تگرگ سے ڈرنا کیا، سہہ لیں گے آئے جو بھی بلا
پرواز کا کچھ موقع تو ملا، تیلی تو قفس کی ٹوٹ گئی

اب پرچم حق منصور ہوا، نیچا وہ سر مغرور ہوا
کشکول گدائی چور ہوا، تقدیر خوشامد پھوٹ گئی

گلزار وطن آباد ہوا، ہر سرو چمن آزاد ہوا
رخصت وہ ستم ایجاد ہوا، وہ قہر گیا وہ لوٹ گئی

قفقاز سے لے تا ساحل چین خوابیدہ فضائیں جاگ اُٹھیں
نکلا جو گہن سے مہر مبیں ہر گوشے میں اس کی چھوٹ گئی

تھا سحر نگاہ عربدہ گر، الجھے تھے بہم جو قلب و جگر
اب ہو کے رہیں گے شیر و شکر آپس میں وہ پہلی پھوٹ گئی

زندانئ غم آزاد ہوئے، مجبور ستم دل شاد ہوئے
وہ قہر کا پھندا کھل نکلا، پھانسی کی وہ رسی ٹوٹ گئی

طوفان مسرت اٹھا ہی، نغموں کا تلاطم برپا ہی
رندان بلاکش کے لب سے اب مہر خموشی ٹوٹ گئی

مل جُل کے کرؤ تعمیر وطن ایسا نہ ہو طعنے دیں دشمن
ساجھے کی پکائی تھی ہنڈیا، چوراہے پر آخر پھوٹ گئی

پھر جوش پہ ہی دریاے سخن، پھر دور میں ہی صہباے سخن
قفلِ درِ زنداں کیا ٹوٹا اقبال کی توبہ ٹوٹ گئی

سہیل

مبارک باد آزادی

گلزار وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج سرشار ہی خوشبو سے ہر اک دشت و چمن آج
غنچوں کا صبا توڑ گئی قفل دہن آج ہی ہر گل خنداں کی زباں پر یہ سخن آج
صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندان محن آج

پھر موج نے ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا بگڑی ہوئی تقدیر کو ہمت نے سنوارا
کھوئی ہوئی عظمت وہ ملی ہم کو دوبارا روشن ہی پھر آزادئ مشرق کا ستارا
یہ خوش خبری لائی ہی سورج کی کرن آج

رخصت ہی شب تار غلامی کا اندھیرا وہ سامنے ہی صبح سعادت کا سویرا
بھارت سے بدیسی کا اکھڑنے لگا ڈیرا لہرائے نہ کیوں عظمت قومی کا پھریرا
آزاد ہوا قید غلامی سے وطن آج

ہرچند کتر بیونت سے چوکا نہیں صیاد پھر بھی یہ بہر حال وطن ہوگیا آزاد
قائم ہوئی جمہوریت ہند کی بنیاد اب شوق سے پھولے پھلے ہر نخل چمن زاد
پھر سبزۂ بیگانہ سے خالی ہی چمن آج

ارباب وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل ہاں جشن منالو کہ ہی موقع اسی قابل
ہونا نہ کہیں جوش طرب میں کبھی غافل تخریب تو آسان تھی، تعمیر ہی مشکل
ہی سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

گو تم نے چراغاں کیا کل ملک میں یکسر روشن کرو الفت کا دیا دل کے بھی اندر
کیوں حرف سہیل آج نہ ہو پھیل کے دفتر اک [1] شاعرۂ ہند ہی صوبے کی گورنر
اٹھے دل شاعر سے نہ کیوں موج سخن آج

---

[1] مسز سروجنی نائڈو

جشنِ آزادی

بصد غرور، بصد فخر و ناز آزادی
مچل کے کھل گئی زلفِ دراز آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طراز آزادی
وطن نے چھیڑا ہی اس طرح ساز آزادی
زمانا رقص میں ہی، زندگی غزل‌خواں ہی

ہر اک جبیں پہ ہی اک موج نور آزادی
ہر ایک آنکھ میں کیف و سرورِ آزادی
غلامی خاک بسر ہی حضورِ آزادی
ہرایک قصر میں ہی ایک بامِ طور آزادی
ہر ایک بام پہ اک پرچمِ زر افشاں ہی

ہر ایک سمت نگارانِ یاسمیں پیکر
نکل پڑے ہیں در و بام سے مہ و اختر
وہ سیلِ نور ہی خیرہ ہی آدمی کی نظر
بصد غرور و ادا خندہ‌زن ہی گردوں پر
زمینِ ہند کہ جولاں گہہ غزالاں ہی

صدا دو انجمِ افلاک رقص فرمائیں
بتانِ کافر و سفاک رقص فرمائیں
شریکِ حلقۂ ادراک رقص فرمائیں
طرب کا وقت ہی بےباک رقص فرمائیں
اب ایسے میں کہ تقاضائے بزمِ رنداں ہی

ہی پاک ابرِ غلامی سے آسمانِ وطن
یہ کام کرگئے آخر بلاکشانِ وطن
ابھی تو خیر سے دہ چند ہوگی شانِ وطن
ابھی تو اور بھی مہکےگا بوستانِ چمن
کہ یہ بہار پیامئ صد بہاراں ہی

وجد

آفتابِ تازہ

دامانِ چاک اشکِ مسرت سے تر ہی آج
دو سو برس کے بعد طلوعِ سحر ہی آج
شمعِ یقیں کے دم سے شکستوں کی شب کٹی
مہرِ مُبیں پیمبرِ فتح و ظفر ہی آج

سامانِ صد ہزار بہاراں لئے ہوئے
اپنی جلو میں گردش شمس و قمر ہی آج

مردہ دلوں میں دوڑ گیا خونِ زندگی
چہروں پہ حرّیت کی شفق جلوہ گر ہی آج

پانی کی بوند قطرۂ آبِ حیات ہی
موجِ ہوا میں مرہمِ زخمِ جگر ہی آج

گل چیں کے ساتھ دورِ تہی دامنی گیا
ہر شاخ گل سے بارش لعل و گہر ہی آج

گلشن کا انقلاب نے نقشا بدل دیا
شاہیں شکار بلبل بے بال و پر ہی آج

اُڑتی ہیں گردِ راہ کے مانند منزلیں
بے باک رخشِ عمر جو گرمِ سفر ہی آج

اِک دل‌نواز خواب حقیقت میں ڈھل گیا
نخل امیدِ اہل نظر بارور ہی آج

محسوس ہورہا ہی انوکھا سہانا پن
اک سادا جھونپڑا ہی سہی اپنا گھر ہی آج

سب تاجران طوق و سلاسل چلے گئے
ای وجد لطف عرض متاعِ ہنر ہی آج